پنجاب کی انقلابی تحریکیں

پروفیسر ستیہ ایم رائے

پنجاب کی انقلابی تحریکیں

1906-1946ء

مصنف: پروفیسر ستیہ ایم رائے

مترجم: محمود زمان

جمہوری پبلیکیشنز

Independent & Progressive Books

نام کتاب۔ پنجاب کی انقلابی تحریکیں۔ مصنف۔ پروفیسر ستیہ ایم رائے
مترجم۔ محمود زمان۔ اشاعت دوئم۔ مئی 2009ء
ناشر۔ جمہوری پبلیکیشنز لاہور

ISBN:978-969-8455-16-7

قیمت-/250 روپے

اہتمام:
فرخ سہیل گوئندی

JUMHOORI PUBLICATIONS
2 Aiwan-e-Tijarat Road Lahore, Pakistan 54000
Tel # 042-6314140 Fax # 042-6670001
E-mail:Jumhoori@yahoo.com

پنجاب کے عظیم انقلابی کارکن

اسلم راحیل میرزا

کے نام

فہرست

پہلا حصہ

پنجاب کی انتہا پسند انقلابی تحریکیں

دوسرا حصہ

تاریخ کی تلاش

پنجاب کی تاریخ اس تسلسل اور غیر جانبداری کے ساتھ نہیں لکھی جارہی، جس کا یہ تقاضا کرتی ہے۔ اسی لیے پنجاب کی حقیقی تاریخ کے ابواب ہمارے مطالعے و علم سے اوجھل ہیں۔ پنجاب، پاکستان اور ہندوستان میں ایک بھرپور اور جاندار ثقافت کا خطہ ہے اور اس وجہ سے بھی پنجاب کو ایک بالادست صوبہ قرار دیا جاتا ہے جو درست نہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ پنجاب ہی شاید ایسا صوبہ ہے جس کی شاندار تاریخ کو شعوری طور پر اوجھل رکھنے کی مسلسل کوششیں کی جارہی ہیں، تاکہ عوامی تاریخ کے حقائق سے آگاہی نہ ہو سکے۔ یہ خطہ، تہذیب و ثقافت میں برصغیر میں اپنی منفرد روایات کا مالک ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس کی ہزاروں سال پرانی زبان بھی چھیننے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔ Cultural Genocide کا یہ عمل 1947ء کی پاک بھارت آزادی کے بعد شدت اختیار کر گیا ہے۔ ہماری تاریخ، ہمارے ہیروز، ہماری مطبوعہ تاریخ سے مٹا دیئے گئے ہیں۔ اور زبانِ عام میں یہ جملہ شعوری طور پر (کہ پنجاب نے تمام حملہ آوروں کو خوش آمدید کہا) مسلط کر دیا گیا ہے، جو کہ سراسر غلط ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ پنجاب ہی کی سرزمین تھی جہاں پر سکندرِ اعظم جیسے فاتحِ عالم کو پسپائی کی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر ہم تاریخ کو غیر جانبداری کے ساتھ تلاش (Discover) کرنا شروع کر دیں تو برصغیر کے اس خطے کی شاندار تاریخ از خود کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اور اس کے لیے پنجاب کی زبان کو بحال کرنا ہوگا جس کے بعد علم کے پوشیدہ راز سراسر بے نقاب ہوں گے۔ جس اشوکِ اعظم پر جنوبی ایشیا فخر کرتا ہے وہ بھی پنجابی ہی تھا۔ پنجاب کی سرزمین پر مختلف ادوار میں مختلف تہذیبوں نے جنم لیا۔ پنجاب کی ثقافت درحقیقت ایک متحرک ثقافت ہے۔ پنجاب کی تاریخ کو تلاش کرنے کی کوششیں پاکستان میں تو نہ ہونے کے برابر ہیں، جو بھی کوششیں کی جاتی ہیں وہ بڑی محدود اور غیر سرکاری سطح پر ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک اقلیت نے

پنجاب کا تشخص ایک جاہل کے طور پر قائم کرنے میں مصروف ہے اور اس کی ذمہ داری ان گروہوں پر ہے جو 1947ء کے بعد پاکستان پر نام نہاد تعلیمی اسناد کی بنیاد پر قابض ہو گئے۔ مگر مشرقی پنجاب میں تاریخ کی تلاش کی کوششیں قابل تحسین ہیں۔ اور زیر نظر کتاب "پنجاب کی انقلابی تحریکیں" اس کی ایک مثال ہے۔

پنجاب اور بنگال ہی برصغیر پاک و ہند کے دو ایسے خطے ہیں جہاں پر ہمیشہ انقلابی تحریکوں نے سب سے پہلے جنم لیا۔ برطانوی سامراج نے اس صوبے کو آخری مراحل میں Colonize کیا۔ اور اس کو Colonize کرنے کے بعد اس گھبرو قوم پر حکمرانی کرنے کے لیے مختلف حکمت عملیاں بھی تیار کیں۔ وسطی ہند کے لوگوں نے پنجاب پر ہمیشہ یہ الزام لگایا کہ انگریز بہادر نے پنجابیوں کو فوج میں بھرتی کر کے اپنا اتحادی بنایا، جبکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ برطانوی سامراج نے پنجابیوں کو دنیا بھر میں جنگوں میں ایندھن کے طور پر استعمال کیا، جیسے امریکہ نے ویتنام کی جنگ میں سیاہ فاموں اور پورٹو ریکو کے شہریوں کو استعمال کیا اور اب عراق میں جو فوجی جنگ میں مصروف ہیں ان میں سیاہ فام اور ہسپانوی نسل کے امریکی زیادہ تعداد میں ہیں تاکہ وہ جنگ کی ہلاکت انگیزی کا نشانہ بنیں۔

پنجاب میں برطانوی سامراج کے خلاف شروع دن سے ہی سیاسی اور انقلابی مزاحمت کا آغاز ہوا جس کا اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ تحقیقی انداز میں ذکر ہے۔ پنجاب نے انگریز سامراج کے خلاف تاریخی انقلابی مزاحمت کی جس کی مثال برصغیر میں صرف بنگال کے خطے میں ہی ملتی ہے۔ پنجاب کا مزاج مزاحمت اور فراخدلی ہے۔ یہاں کے لوگ چونکہ Chauvinist Nationalist نہیں ہیں اس لیے پاکستان کے اوپری طبقے کے لوگ (ادبی حوالے سے) جو کہ وسطی ہند سے ہجرت کر کے آئے ہیں پنجاب کی شناخت کو مسخ کرنے کے درپے ہیں۔

پنجاب، غدر پارٹی کی انقلابی تحریک، جلیانوالہ باغ کی عوامی مزاحمت اور دوسری شاندار مزاحمتی تحریکوں کی شناخت کا حامل خطہ ہے۔ بلکہ پاکستان کی تشکیل کے بعد پنجاب ہی وہ صوبہ ہے جہاں پر پاکستان کی پہلی عوامی تحریک Mass Movement نے 1966-67ء میں جنم لیا۔ جس کو سندھ کے فرزند جناب ذوالفقار علی بھٹو نے Lead کیا۔ یہ تحریک پاکستان میں انقلابی تحریک کے طور پر جانی جاتی ہے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ پنجاب نے اس انقلابی تحریک میں تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کیا، اسی لیے ایک غیر پنجابی کو اپنا قائد قرار دیا، یہ ایک حقیقت ہے کہ پنجاب کے عوام نے جب کبھی بھی سیاسی یا انقلابی تحریک کو جنم دیا اس کا رجحان زیادہ تر طبقاتی بنیادوں پر قائم ہوا۔ 1966-67ء کی تحریک بھی ایک ایسی ہی مثال ہے۔ جدید سیاسی تاریخ ہی پچھلی صدی کے آغاز میں ہی پنجاب میں مزاحمت اور انقلابی تحریکوں کی بنیاد

ڈل گئی جو عالمی فکر کے نظریاتی نعروں سے عبارت تھیں۔ یہ تحریکیں دنیا بھر میں ابھرنے اور جنم لینے والی تحریکوں سے متاثر تھیں۔ اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہم ان سے بخوبی آگاہی حاصل کرلیں گے۔ زیر نظر کتاب جہاں پاکستان میں شائع ہونے والی کتب میں واقعی ایک اہم اضافہ ہے وہاں تاریخ کو Discover کرنے کی شاندار کوشش بھی ہے۔

فرخ سہیل گوئندی

20 جولائی 2004ء

عرضِ مترجم

پنجاب میں مزاحمت کی تحریک اتنی ہی پرانی ہے جتنی غیر ملکی تسلط کی۔ 1849ء میں پنجاب پر انگریزوں نے قبضہ کیا تو آٹھ برس بعد ہی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد شروع ہوگئی۔ 1857ء کی اس جنگِ آزادی میں جو عسکری نظم وضبط کے فقدان کی ایک زندہ مثال تصور کی جاتی ہے سکھوں نے بحیثیت مجموعی غیر ملکی حکمرانوں کا ساتھ دیا۔ لیکن چند ہی عشروں میں معاشی بدحالی اور نسلی امتیاز کے باعث اس قوم میں ایسی قلبی تبدیلی رونما ہوئی کہ آئندہ آنے والے سالوں میں سکھوں کا نام جدوجہد اور قربانی کے نام کے ساتھ جڑ گیا۔ سکھ قوم کی تاریخ جہاں مسلح جدوجہد سے عبارت ہے، وہاں عسکریت پسندی ان کی روایت رہی ہے۔ انہوں نے لڑائی بھڑائی کے بعد تخت لاہور حاصل کیا اور جب ان سے بہتر عسکری اہلیت کے حامل لوگ ان کے مدِمقابل ہوئے تو بھی اس تخت کا قبضہ مسلح مزاحمت کے بعد ہی ان کے ہاتھ سے چھوٹا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں جب کینیڈا اور امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں نے غدر پارٹی قائم کی اور مادرِ وطن کی آزادی کا بیڑا اٹھایا تو اندرونِ ملک جس طبقہ نے روحانی طور پر اس تحریک کا ساتھ دیا وہ سکھ کسان تھے جو پنجاب کے جنوبی اضلاع میں تازہ تازہ آباد ہوئے تھے۔ چونکہ اس دور میں عالمی اور مقامی سطح پر کوئی اور تحریک نظیر کے طور پر موجود نہیں تھی اس لیے روس کے بالشویک انقلاب نے معنوی طور پر غدر پارٹی اور اس کی تحریکِ آزادی کو روحانی قیادت فراہم کی۔ غدر پارٹی اور اس کے سپاہیوں نے بندوق کے ذریعے وطن کو آزاد کرانے کی مہم شروع کی تو پارٹی کے اکثر رہنما بالشویک انقلاب اور فلسفہ سے متاثر تھے اور انتہا پسندی ان کی سیاسی حکمتِ عملی کا قدرتی جزو تھی۔ پنجاب کے جنوبی اضلاع کے ساتھ ساتھ مرکزی علاقوں امرتسر، لاہور اور گوجرانوالہ میں بھی غدر پارٹی کی تحریک کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ اس مسلح تحریک نے ان علاقوں میں جو اثرات چھوڑے وہ آئندہ برپا ہونے والی تحریکوں میں بھی نمایاں رہے۔

اگرچہ پنجاب میں آزادی کی اکثر تحریکوں میں تشدد کا عنصر تقسیمِ ہند تک غالب رہا لیکن اس

دوران ہندوستان میں سیاسی نظم وضبط بھی وجود میں آیا۔ منٹو مارلے کی آئینی اصلاحات کے نتیجے میں انڈین نیشنل کانگریس کے سیاسی نکتۂ نظر اور مقاصد میں واضح تبدیلی وقوع پذیر ہوئی۔ اس دور کی کانگریس سیاسی طور پر انگریز حکمرانوں کے مقاصد کی ہم آہنگ نظر آتی ہے اور جوں جوں اس جماعت کا اثر ونفوذ بڑھا پنجاب میں واضح طور پر ایک متوازی تحریک بھی شروع ہوئی جو مہاتما گاندھی کے زیر اثر اس تنظیم کی سیاسی اعتدال پسندی کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔ یہ وہ دن تھے جب بھگت سنگھ اپنے ساتھیوں راج گرو اور سکھ دیو کے ساتھ "لاہور سازش کیس" میں عدالتی جنگ لڑ رہا تھا۔ مقدمہ کے دوران اس نے عدم تشدد کے فلسفہ کی دھجیاں اڑا دیں۔ وہ گاندھی جی کے ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دینے کے مطالبے کے مقابلے میں مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہا تھا اور یہ مطالبہ کانگریس کے موقف کے مقابلے میں ہندوستان بھر اور خصوصاً پنجاب میں زیادہ مقبولیت حاصل کر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ گاندھی جی کو اس مسئلہ پر تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بھگت سنگھ کا ہندوستان کو ایک سوشلسٹ ری پبلک بنانے کا منصوبہ بھی بہت پہلے سامنے آ چکا تھا اور اس کے مقابلے میں کانگریس کا سیاسی پروگرام مبہم محسوس کیا جا رہا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب آل انڈیا مسلم لیگ ابھی پنجاب میں اپنے سیاسی پاؤں جما رہی تھی۔ اگرچہ مسلم لیگ کو اپنے سیاسی مقاصد میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی لیکن بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں صوبے میں آزادی کے حوالے سے ایک سے زیادہ سیاسی حکمت عملی کارفرما نظر آتی ہے۔ ایک طرح سے یہ ایسی سیاسی رسہ کشی تھی جو آنے والے برسوں میں تصادم میں تبدیل ہوئی اور جس نے پنجاب کا جغرافیہ تبدیل کر دیا۔

انہیں دنوں پنجاب میں ایک اور سیاسی تحریک نے جنم لیا جس کے سرخیل وہ خاندان تھے جنہیں 1857ء کی جنگِ آزادی اور پھر پہلی جنگِ عظیم کے بعد انگریز حکمرانوں نے جنگی خدمات کے صلے میں خصوصاً جنوب مغربی پنجاب میں جاگیریں عطا کیں اور ان علاقوں میں جاگیرداروں کا ایک طبقہ پیدا کر دیا۔ ان جاگیرداروں نے قومی مسئلہ کے جواب میں سیکولر سیاست کے نام پر سامراج نواز یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی، جس کا نشانہ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتیں تھیں۔ انگریز کی اس ٹوڈی جماعت نے سیاسی مفاہمت کی ایک نئی راہ دکھائی اور دو ہی دہائیوں میں انتہا پسندی اور مکمل وفاداری کے سیاسی دھارے قومی افق پر نمودار ہوئے اور پنجاب کی سیاست بتدریج انہیں خانوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔ تاہم تمام تر سیاسی ہتھکنڈوں اور سازشوں کے باوجود پنجاب غیر ملکی حکمرانوں کے لیے کبھی خطۂ امن نہیں بن سکا اور آزادی کی تحریکوں نے کبھی مکمل دم نہیں توڑا۔ چنانچہ پرتشدد واقعات اور دہشت گردی نے حکمرانوں کی نیندیں حرام کیے رکھیں۔ انگریز گورنروں کی رپورٹوں اور وائسرائے اور لندن میں وزیر حکومتِ ہند کے ساتھ مراسلوں میں یہ کیفیت پوری طرح واضح ہوتی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ گواہ ہے کہ جب جب غیر ملکی حکمرانوں کے تسلط سے نجات کے لیے جدوجہد شروع ہوئی سازش اور غداری کا عنصر بھی ساتھ ہی پروان چڑھا۔ پلاسی سے یونینسٹ پارٹی تک کا راستہ انہیں سازشوں سے اٹا پڑا ہے اور چونکہ ہندوستان میں سیاسی عمل اور تنظیموں کو کبھی آزادانہ فضا میں کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا اس لیے بہتر جنگی صلاحیتوں کی حامل سامراجی طاقت ہر مرتبہ ہر تحریک کو دبانے میں کامیاب رہی۔ اس کی ان کامیابیوں کا اصل سہرا ان گماشتہ جاگیرداروں کے سر ہے جنہیں آئندہ چل کر فوجی مزاج کے برطانوی حکمرانوں کا سیاسی وارث بننا تھا۔ انگریز حکمرانوں نے نہ صرف ایسے عناصر کی سرپرستی کی بلکہ انہیں اپنے ایجنٹوں کے طور پر سیاسی جماعتوں میں شامل ہونے کی ہدایت کی۔ چنانچہ اس وقت اعتدال پسندی کی ہر تحریک کو اس تناظر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ تو کبھی ایک سیاسی تنظیم نہ بن سکی۔ کانگریس میں بھی ایسے عناصر کی بھرمار رہی ہے۔ کانگریس کی قیادت نے سبھاش چندر بوس اور ان کے ساتھیوں کو جس ذلت سے دوچار کیا اس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ کانگریس کی اعلیٰ قیادت اور پالیسی انہیں عناصر کے زیر اثر رہی تھی۔

مونٹیگو چیمسفورڈ آئینی اصلاحات کے بعد جب محدود عوامی نمائندگی کی حامل لیجسلیٹو کونسلوں کو تقویت ملی تو پنجاب میں انہیں جاگیرداروں کو صوبائی کونسل میں نامزد کیا گیا۔ ان دنوں پنجاب میں مسلم لیگ نہ ہونے کے برابر تھی اور کانگریس کا سیاسی اثر و نفوذ بیحد محدود تھا۔ چنانچہ قدرتی طور پر طاقت یونینسٹ پارٹی کے ہاتھ میں آ گئی۔ 1935ء کے انڈیا ایکٹ کے نتیجے میں جب 1937ء میں پہلی مرتبہ صوبوں میں انتخابات ہوئے تو پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کو ہی فتح حاصل ہوئی۔ اس پارٹی نے دو کے سوا مسلمانوں کی تمام نشستیں جیت لیں، جو دونوں مسلم لیگ کی ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔ ان میں سے بھی جہلم کے راجہ غضنفر علی خان بعد میں حکمران جماعت کے ساتھ مل گئے اور صرف برکت علی لاہور میں مسلم لیگ کی ڈفلی بجانے کے لیے باقی رہ گئے۔ اگر مسلم لیگ کو پنجاب میں سیاسی پذیرائی ملی تو وہ 1940ء میں منٹو پارک کی قرارداد لاہور کا نتیجہ تھی، جس میں مسلم لیگ نے پہلی مرتبہ باضابطہ طور پر مسلمان اکثریتی صوبوں کی علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا۔ اگرچہ بعد میں مسلم لیگ ہی نے زونل تجویز قبول کر کے ہندوستان کی تقسیم کے خلاف رائے دی تھی تاہم الگ مسلم ریاست کے قیام کی تجویز مقبول عام ہوئی اور اس تجویز کے حق میں عوامی رائے شدت کے ساتھ ابھری۔ یہ تحریک بھی سیاسی نظم و ضبط سے عاری تھی اور مسلم لیگ نے عوامی جذبات کے اس اظہار کو کبھی سیاسی جہت نہیں دی۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس تحریک کو بعض ایسے عناصر نے، جو نام تو محمد علی جناح کا لیتے تھے لیکن جو ان کی سیاسی سوچ سے ہم آہنگی نہیں رکھتے تھے، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا تو بے جا نہ ہوگا۔ بہر طور الگ مسلم ریاست کی یہ تحریک جذباتی شدت کی حامل ہونے

کے باعث کسی سیاسی نظم وضبط کے تابع ہونے سے زیادہ ایک ایسے گروہ کی تحریک بنی، جو قائداعظم سے قلبی اور روحانی لگاؤ رکھتے تھے، سیاسی ہونے سے زیادہ یہ تحریک جذباتی کہی جا سکتی ہے۔

1937ء کے انتخابات سے قبل کانگریس اور مسلم لیگ کا ایک معاہدہ ہوا جس میں طے پایا تھا کہ یو پی اور دوسرے ایسے صوبوں میں جہاں مسلمان آبادی ایک بڑی اقلیت ہے مسلمانوں کو ان کی عددی اکثریت سے زیادہ صوبائی اسمبلیوں میں نمائندگی دی جائے۔ اس کو Weightage کا اصول قرار دیا گیا۔ جب اس معاہدے کے نتیجے میں ہندو اکثریت والے صوبوں میں کانگری وزارتیں بنیں تو انہوں نے اس معاہدے پر عملدرآمد سے انکار کر دیا اور مسلم لیگ اس نتیجے پر پہنچی کہ اب کانگریس کے ساتھ کسی سطح پر اور کسی بھی نوعیت کا تعاون بیکار ہوگا۔ کیونکہ کانگریس اپنے پرانے موقف پر قائم تھی کہ وہ ہندوستان بھر کے عوام کی نمائندہ تنظیم ہے اور ملک میں قومی مسئلہ کا کوئی وجود نہیں۔

ہندوستان کی سیاسی تحریک جب 1946ء میں فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہوئی تو انگریز سرکار نے قومی مسئلہ کے حل کے لیے زونل تجویز پیش کی۔ اس سکیم میں کہا گیا تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبے دس برس تک ہندوستان کے اندر رہتے ہوئے مکمل خودمختاری کے ساتھ کاروبار حکومت چلائیں اور اگر اس عرصہ کے بعد وہ محسوس کریں کہ آزادی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تو وہ ہندوستان سے الگ ہو جائیں۔ آل انڈیا کانگریس نے یہ تجویز قبول کر لی اور آل انڈیا مسلم لیگ نے بھی ایسا ہی کیا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد کانگریس نے اس سکیم کو مسترد کر دیا تو محمد علی جناح نے بھی جواباً زونل سکیم کو مسترد کر دیا۔ یہ تاریخی حقیقت اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ بابائے قوم 1946ء کے آخر تک ذہنی طور پر خود کو ملک کے بٹوارے سے ہم آہنگ نہ کر سکے تھے۔ محمد علی جناح نے آخر وقت تک اپنا ممبئی کے مالا بار ہلز والا بنگلہ فروخت نہیں کیا اور کشمیر میں کلو کے مقام پر 1947ء کے اوائل میں جائیداد خریدی تا کہ موسم گرما میں وہاں چھٹیاں گزار سکیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ آخر دم تک ہندوستان کی تقسیم کے حق میں نہیں تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر ثابت ہو جاتا ہے کہ صرف اور صرف کانگریس کے منفی رویہ نے ہندو مسلم اتحاد کے اس سفیر کو مجبور کر دیا کہ وہ علیحدہ وطن کا مطالبہ کریں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کانگریس کی منفی سیاست کا نتیجہ تھا تو بے جا نہ ہوگا۔

پنجاب میں 1946ء کے انتخابات کے بعد اکثریتی پارٹی مسلم لیگ کو حکومت سازی کی دعوت نہ دے کر حکمرانوں نے علیحدگی کے مطالبہ کو ہوا دی اور یوں جلتی پر تیل ڈالنے کا کام کیا۔ انگریز نوازوں نے کانگریس اور اکالی دل کے اشتراک سے یونینسٹوں کی مخلوط حکومت قائم کر دی تو پنجاب سراپا احتجاج بن گیا۔ اس مرتبہ بھی کانگریس نے مخلوط حکومت میں شامل ہو کر ایک ایسی سیاسی غلطی کہ ہندوستان کے تاریخ

دان آج تک اس پر کڑی نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ خصوصاً پنجاب میں اس غلطی کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ یہی صوبہ علیحدگی کی تحریک میں پیش پیش تھا۔ یہ تحریک خالصتاً عوامی تھی۔ اگرچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مسلم لیگ نے اسے سیاسی نظم وضبط میں لانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کی حالانکہ مسلم لیگ کے راہنماؤں کی عوامی اپیل اس قدر موثر تھی کہ وہ اس تحریک کو ایک واضح سیاسی جہت دے سکتے تھے۔ جوں جوں یہ تحریک آگے بڑھی پاکستان کا مطالبہ شدت اختیار کرتا گیا۔ یہ وہ دن تھے جب یونینسٹوں نے محسوس کرلیا کہ اب پاکستان ناگزیر ہے۔ چنانچہ سامراج کے یہ ایجنٹ جاگیردار جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہونے لگے اور جوں جوں وقت گزر رہا تھا، ان کی ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کی یہ سازشیں مسلم لیگ پر قبضہ کے لیے تھیں جس کے لیے مختلف گروپ اور خاندان پوری طرح روبہ عمل تھے اور جب قیام پاکستان میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی تو مسلم لیگ مکمل طور پر ان سازشی اور نااہل عناصر کے ہاتھوں میں جا چکی تھی۔

پاکستان ان حالات میں معرض وجود میں آیا کہ مسلم لیگ ذاتی جھگڑوں، گروہ بندی، مفاد پرستی اور محلاتی سازشوں کے جال میں بری طرح جکڑی جا چکی تھی اور اس کے قائد اور پاکستان کے بانی سیاسی بے بسی کا شکار تھا۔ انہیں جماعت کے امور سے تقریباً الگ کر دیا گیا تھا۔ محمد علی جناح کسی بھی طور پر اب مسلم لیگ کے معاملات کو اپنے مجبوری مزاج کے مطابق نہیں چلا پا رہے تھے۔ ان کے قریبی ساتھی بھی اب ان سے فاصلہ قائم کر رہے تھے کیونکہ ان کے اور بانی پاکستان کے سیاسی تصورات میں اب نہ ختم ہونے والا بُعد قائم ہوگیا تھا۔ انہیں حالات میں بعض خبارات میں ایسی خبریں شائع ہوئیں کہ بابائے قوم مسلم لیگ کو تحلیل کرنے اور ایک نئی سیاسی جماعت قائم کرنے کے بارے غور کر رہے ہیں۔ ایسی خبروں کی اشاعت نے جاگیرداروں اور ان کے ایجنٹوں کی صفوں میں کھلبلی مچا دی چنانچہ چودھری خلیق الزمان کو بابائے قوم کے پاس بھیجا گیا تاکہ وہ انہیں مسلم لیگ کے خاتمے سے باز رکھ سکیں۔ ان واقعات کے ایک برس کے اندر محمد علی جناح انتقال کر گئے اور دنیا نے دیکھا کہ مسلمانوں کے سیاسی اور اقتصادی حقوق کی خاطر تن تنہا لڑنے والا یہ قائد کس کسمپرسی میں اس جہان سے رخصت ہوا۔ بابائے قوم کی آخری ایام کی لاچارگی شائد اس وجہ سے بھی تھی کہ انہوں نے ایک خالصتاً سیاسی مسئلہ کو محض قانون کی نظر سے دیکھا۔ سیاسی رہنمائی سے زیادہ انہوں نے مسلمانوں کی وکالت پر زیادہ زور دیا۔ ان کی قانون کی عینک وہ سیاسی سازشیں نہ دیکھ پائی جو ان کی اپنی ہی جماعت میں زور شور سے جاری تھیں۔ ان جاگیرداروں کے لیے قائداعظم صرف ایک وکیل تھے جنھوں نے کامیابی سے پاکستان کا مقدمہ لڑا اور پھر جس طرح تمام موکل مقدمہ جیتنے کے بعد اپنے وکیل کو بھول جایا کرتے ہیں محمد علی جناح کے ساتھ بھی انہوں نے وہی سلوک کیا۔ ان کے سیاسی نظریات ان عناصر کے مفاد کی راہ میں حائل تھے۔ 11 اگست 1947ء کو محمد علی جناح

نے پاکستان کی آئین ساز اسمبلی سے جو خطاب کیا اور جس میں انہوں نے مملکت اور مذہب کو الگ الگ قرار دے کر معاشرے کے تمام طبقات کے حقوق کی بات کی وہ ان سازشی گروہوں کے لیے زہر قاتل تھا۔ اگرچہ قائد اعظم نے محض ایک ایسی تقریر کے علاوہ نئی مملکت کے مستقبل کی کوئی خاص راہ نہیں دکھائی۔ پھر بھی اس تقریر کو مستقبل کے پاکستان کے لیے بنیادی نظریہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ بابائے قوم نے اپنی زندگی کے آخری برس ہی میں دیکھ لیا کہ انہوں نے پاکستان کے لیے جو منزل مقرر کی تھی وہ انہیں نہیں مل سکے گی۔ اس دوران ان کے بقول کھوٹے سکے دھڑا دھڑ چلے اور پاکستان کے مستقبل کا سودا کرتے رہے۔

چنانچہ جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو دوسرے صوبوں کے مقابلے میں پنجاب زیادہ سیاسی معاشی اور جغرافیائی ابتری کا شکار تھا۔ اس صورتحال کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اب جن لوگوں کے ہاتھ سیاسی باگ ڈور آئی تھی وہ شروع ہی سے عسکری قوتوں کے بل پر زندہ رہے۔ وہ خود سیاسی طور پر نااہل تھے اور محض عسکری قوتوں کے سیاسی عزائم کو آگے بڑھانے کے لیے ایجنٹوں کے طور پر کام کرتے رہے تھے۔ چنانچہ جب ایک آزاد مملکت میں سیاسی باگ ڈور ان کے ہاتھ آئی تو بہت جلد ان کی نااہلی اظہر من الشمس ہو گئی۔ پنجاب میں یکے بعد دیگرے حکومتوں کی تبدیلی سے ظاہر ہوتا ہے کہ نئے حکمران صرف سازش ہی کر سکتے تھے۔ صرف چھ برس کے بعد جب احمدیوں کے خلاف تحریک چلی اور لاہور میں مارشل لا کا نفاذ ہوا تو جاگیردار حکمرانوں کو نہ صرف عسکری قوتوں کی سرپرستی حاصل ہو چکی تھی بلکہ سیاست میں مذہب کا عنصر بھی داخل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد بتدریج اس ناپاک تثلیث نے قومی سیاسی امور پر غلبہ حاصل کرنا شروع کیا اور 1958ء کے پہلے فوجی قبضے کے بعد ملک تقریباً مکمل طور پر ان عناصر کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قیام پاکستان کے پہلے ہی عشرے میں جن قوتوں نے سیاسی غلبہ حاصل کر لیا تھا انہوں نے کسی سیاسی جماعت کو پنپنے نہیں دیا۔ کیونکہ انہیں ہر دور میں مفاد پرست طبقہ کا تعاون حاصل کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ اس طرح ملک ہمیشہ سیاسی طور پر عدم استحکام کا شکار رہا۔ لہٰذا پالیسی سے آج تک کوئی تبدیلی نہیں آئی کیونکہ سیاسی قبضہ ان قوتوں کے ہاتھ میں ہے جو تبدیلی کے مخالف تھے اور ہیں۔

پنجاب کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہندوستانی پنجاب سیاسی طور پر اس لیے مضبوط رہا کہ وہاں کسان تحریک مضبوط رہی ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے وہاں جاگیرداریاں نہیں تھیں اور کسان بغیر کسی دباؤ کے پیداواری عمل میں مصروف رہا۔ پاکستان کے حصے میں جو پنجاب آیا وہاں کسان تحریک پہلے ہی کمزور تھی اور جنوب میں تو پیداواری عمل جاگیرداروں کے تابع رہا۔ پنجاب کے دونوں حصوں کی فی ایکڑ پیداوار میں جو واضح تفاوت موجود ہے وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ جاگیرداری نے پیداواری عمل کے

راستے میں کتنی بڑی رکاوٹ پیدا کی۔ یہ رکاوٹ اس کے باوصف ہوئی کہ پاکستانی پنجاب میں دنیا کا بہترین نظام کھیتوں کی آب رسانی کے لیے موجود ہے۔

پروفیسر ستیہ ایم رائے کی اس کتاب کا ترجمہ کرتے ہوئے مجھے بیحد خوشی ہوئی ہے۔ پروفیسر صاحبہ نے پٹیالہ یونیورسٹی کے تحقیقی مرکز کے لیے اس کتاب Heroic Traditions of Punjab کی تیاری میں بہت محنت سے کام کیا ہے۔ سرکاری رپورٹوں کے ساتھ ساتھ انہوں نے پنجاب کی تحریکوں سے متعلق کتابوں اور مقالوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ یقیناً ان کی یہ کتاب تحقیق کے اعلیٰ معیار کی حامل ہے اور پنجاب کی سیاسی تحریکوں کا مطالعہ کرنے والے طلبا اور محققین کے لیے ایک قیمتی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

میں محترم فرخ سہیل گوئندی کا شکرگزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنے جمہوری پبلیکیشنز کے لیے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کا موقع دیا۔ فرخ میرے وہ دوست ہیں جو میری سیاحت کے ساتھی رہے ہیں۔ انہیں کے ساتھ مجھے 1992ء میں ایران، ترکی، قبرص اور مصر کی سیر کا وہ موقع ملا جواب تک میرے ذہن میں نقش ہے۔ فرخ نے ترکی اور مصر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر خربوزے اور تربوز کھائے۔ انقرہ میں جب ہم اپنے دوست فرقان حمید کے گھر مقیم تھے تو انہوں نے کسی بھی سہ پہر کچا دودھ پینے میں چوک نہیں کی جو وہ قریبی سٹور سے اس لیے خریدتے تھے کہ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون بالکل پنجاب کی گجری لگتی تھی۔ مجھے وہ شام کبھی نہیں بھولے گی جب ہم دونوں مغربی ترکی میں ترووا (Troy) دیکھنے گئے جہاں یونانی فوجوں کے گھوڑے کا ایک بڑا سا Replica رکھا ہوا تھا۔ اس کھنڈر نما سیرگاہ میں فرخ نے میری میزبانی کا حق ادا کر دیا۔

مجھے اپنی بیٹیوں تہمینہ اور فاطمہ کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے کہ ان دونوں نے نہ صرف کتاب کا ترجمہ کرنے میں ہر طرح کی معاونت کی بلکہ پروف پڑھنے میں بھی مدد دی۔

محمود زمان

19 جون 2004ء

پہلا حصہ

پنجاب کی انتہا پسند انقلابی تحریکیں

باب:1

زمین اور زراعت (1906 تا 1909ء)

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں ایسی انقلابی تحریکوں نے جنم لیا جن کے اثرات آنے والی دہائیوں پر محیط رہے اور جنھوں نے ملک کے سیاسی اور سماجی مستقبل پر انمٹ نقوش چھوڑے۔ ان سالوں میں ملک شدید بحرانی صورتحال سے دوچار تھا اور اس کا اقتصادی پہلو نمایاں تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں طاعون کی جو وباء چار سو پھیلی اس سے لاکھوں افراد موت کے منہ میں چلے گئے اخباری رپورٹوں کے مطابق صرف پنجاب میں لگ بھگ 50 ہزار افراد اس وبا سے ہلاک ہوئے۔ سیاسی محاذ پر برطانوی نوکر شاہی اور مغرب کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے مابین مفاہمت تصادم میں بدل چکی تھی خصوصاً 1884ء میں جب حکومت نے البرٹ بل واپس لیا تو کشیدگی مزید بڑھی اور پھر بلقان کی ریاستوں کی سلطنت عثمانیہ سے آزادی 1894ء میں ابی سینیا کے ہاتھوں اطالوی افواج اور 1905ء میں جاپان کے ہاتھوں روس کی ہزیمت نے اہل ہندوستان کے ذہنوں سے مغربی تہذیب کے اعلیٰ تر ہونے کا تاثر بھی زائل کر دیا اور انہوں نے ایک نئے سیاسی سفر کا آغاز کیا ایسا سفر جس میں اب سمندر پار آنے والی اقوام کے دبدبہ کا عنصر شامل نہ رہا تھا۔

ایسے سفر کی رہنمائی انڈین نیشنل کانگریس نے فراہم کی جو اب تک ایک مضبوط سیاسی تنظیم بن چکی تھی اگرچہ اب بھی اس پر اعتدال پسند رہنماؤں کا غلبہ تھا جن کی کارکردگی محض برطانوی حکومت کو یادداشتیں اور درخواستیں بھیجنے تک محدود تھی بال گنگا دھر تلک (لوک مانیہ) نے پہلی مرتبہ اس پالیسی کو چیلنج کیا۔ انہوں نے کہا اس حکمت عملی سے کانگریس حقیقی اور معنوی مقصد حاصل نہیں کر سکتی۔ انہوں نے سوراج (آزادی) کا نعرہ بلند کرتے ہوئے ہندوستانیوں میں قومی جارحیت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش

کی۔اس مقصد کے حصول کے لیے لوک ماپیے نے سودیشی اور بائیکاٹ دوراہیں تجویز کیں۔دراصل بنگال کی تقسیم (16 اکتوبر 1905ء) کے بعد یہ ایک نئی سیاسی جیت تھی جس کا بنیادی فلسفہ یہ تھا کہ سیاسی حقوق کے حصول کے لیے مزاحمت کا راستہ اپنایا جاسکتا ہے۔سودیشی تحریک درحقیقت، سیاسی جدوجہد کا بنیادی نکتہ تھی جس کی منزل ہندوستان میں حکومت کی تبدیلی تھی۔اس کی وضاحت کرتے ہوئے لوک ماپیے تلک نے کلکتہ میں شیواجی کی تقریب کے موقع پر 8 جون 1906ء کو ایک تقریر میں کہا۔''جس شے کی ہمیں اس وقت سب سے پہلے ضرورت ہے وہ ہے سودیشی (ملکی) ہمیں ہر بات میں، عمل میں سوچ میں سودیشی فکر کی ضرورت ہے۔

سودیشی سوچ ماں کے دودھ میں شامل ہے۔نوجوان نسل کے ذہنوں میں بدیشی (غیر ملکی) اشیاء کے خلاف ایک ایسے جذبہ کا اجاگر ہونا ضروری ہے جس کے تحت وہ ان سے نفرت کرنے لگیں ان کو جلا ڈالیں۔اگر ہمیں کسی فکر کو پختہ کرنا ہے تو وہ سودیشی ہے۔وہ ہندوستانیت ہے۔

ساتھ ہی تلک نے نئی نسل میں جسمانی اور ذہنی پختگی کی فکر پیدا کی انہوں نے طلبا اور دوسرے نوجوانوں کو کلبوں اور اکھاڑوں میں جانے اور وہاں جمناسٹک اور کشتی جیسے فن سیکھنے کی تلقین کی۔بنگال میں خاص طور پر یہ سکیم بہت ہر دلعزیز ہوئی اور دوسرے صوبوں میں بھی اس کو فروغ ملا۔برطانوی مورخین نے بعد میں اس کو ایسا منصوبہ قرار دیا جس کا مقصد نوجوانوں میں انقلابی خیالات اور جذبات پیدا کرنا تھا۔ برطانوی حکومت کی نسلی امتیاز کی پالیسی اور مقامی لوگوں کے خلاف نفرت کے جذبے اور پڑھے لکھے نوجوانوں کی بیروزگاری نے خصوصاً بنگال اور مہاراشٹر میں حکومت کے خلاف معاندانہ سوچ کو مزید ہوا دی انہیں وجوہات کی بنا پر بعدازاں نوجوان نسل پر تشدد تحریکوں کی طرف مائل ہوئی اور ایسی دھماکہ خیز صورت حال پیدا ہوئی جس نے حکام میں تشویش کی لہر دوڑ دی تھی وائسرائے لارڈ کرزن کی کوتاہ نظری نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔اس نے 3 دسمبر 1903ء کو تقسیم بنگال کا فیصلہ کیا اور 16 اکتوبر 1905ء کو بنگال کو دو حصوں میں بانٹ دیا نتیجتاً قومی سوچ مزید گہری ہوئی اور سیاسی رہنماؤں نے برملا کہنا شروع کر دیا کہ تقسیم بنگال قومی قوتوں کو دولخت کرنے کی ایک سوچی سمجھی سازش ہے۔اس کے ردعمل میں برطانوی حکمرانوں نے اپنے وفادار مسلمانوں کو استعمال کیا تا کہ قومی جذبے کو دبایا جاسکے۔برطانوی حکومت نے وفادار مسلمانوں کو تقسیم بنگال کے خلاف قومی تحریک میں ہتھیار کے طور پر استعمال کیا یہیں سے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' حکومت برطانیہ کی ایک قومی پالیسی بن کر ابھری جس کا اطلاق پنجاب پر بھی ہوا۔1900ء اور 1905ء کے درمیان زرعی زمین کے تبادلے، تقسیم اور حق شفع کے حوالے سے جو بھی قوانین نافذ کیے گئے ان کا مقصد بھی ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان کسانوں کی ہمدردیاں حاصل کرنا تھا۔ان دنوں پنجاب وہ واحد صوبہ تھا جہاں دوسرے صوبوں کے مقابلے میں قومی سوچ کی کمی تھی اور جہاں ابھی تک سیاسی تحریک نے

جڑ نہیں پکڑی تھی اس بات کا اعتراف لالہ لاجپت رائے نے بھی کیا کہ "پنجاب کے عوام نے ابھی تک سرکار کی ناانصافیوں اور ظلم وستم کے خلاف کوئی مؤثر آواز بلند نہیں کی نہ ہی یہاں کوئی خاص سیاسی کام ہوا ہے۔"

لیکن صرف دو برس کے اندر پنجاب "انقلاب کی دہلیز" پر تھا۔ لاجپت رائے ہی کے بقول "بنگال اور پنجاب ہی وہ صوبے ہیں جہاں انقلابی تحریک قابل ستائش حد تک آگے بڑھ چکی ہے۔" یہ وہ صورتحال تھی جس نے برطانوی حکام کو تشویش میں مبتلا کیا اور بعد میں ہونے والی سختی اور جبر وتشدد اسی کو دبانے کی کوشش تھی۔

ایک ہی برس میں یہ تبدیلی کس طرح واقع ہوئی پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر ڈینزل ابٹسن کا خیال تھا کہ اس "نئی لہر" کی وجہ وہ "باغیانہ لٹریچر" تھا جو بنگال میں لکھا جا رہا تھا اور جو دوسرے صوبوں میں بھی تقسیم کیا جا رہا تھا۔ سر ریگنال کریڈک نے بھی کم وبیش یہی وجہ بتائی ان کا کہنا تھا کہ کینال کالونیز بل (نہری زمین کو بسانے کا قانون) محض ایک بہانہ ہے اصل وجہ یہ ہے کہ بنگال میں تقسیم کے خلاف جو تحریک چل رہی ہے اس کی حمایت میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ حقیقت بھی تھی کہ لارڈ کرزن کی پالیسیوں کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی تھی اور کانگریس کے رہنماؤں لاجپت رائے اور سری دیوی وغیرہ کی تقریروں اور تحریروں نے پنجاب میں بھی نوجوانوں کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ یہی وہ حالات تھے جن کے نتیجے میں خفیہ تنظیمیں وجود میں آئیں ایسی تنظیمیں جو اعتدال پسندوں کی درخواست بازی کی سیاست کے بالکل برعکس طریق کار اپنانے کا مطالبہ کر رہی تھیں ان دنوں برطانیہ مخالف تنظیموں کے قیام کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کیونکہ اخبارات کی آزادی سلب کر لی گئی تھی عام جلسے کرنے پر سخت پابندی تھی حکومت معمولی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی اور معمولی باتوں پر سرکاری مشینری حرکت میں آ جاتی تھی۔ شدید مزاحمتی سوچ رکھنے والے قائدین جن میں تلک اور لاجپت رائے شامل تھے اگرچہ تشدد آمیز کارروائیوں، چوری چکاری اور ڈکیتی کے مخالف تھے لیکن ان حالات میں وہ بھی اعلانیہ طور پر ان کی مذمت کرنے سے کنی کتراتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک ارتقا کے عمل میں ہر شخص کے کام کرنے کا انداز مختلف تھا۔ سرلا دیوی جو تلک کے براہ راست رابطہ میں تھیں اس قسم کی "باغیانہ" تقاریر کیا کرتی تھیں ان کی تقاریر رات کے وقت پنجابی پریس میں شائع ہوتیں اور دن کے وقت سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حتیٰ کہ عورتوں میں پمفلٹ کی صورت میں تقسیم ہوتی تھیں۔

آغاز میں یہ تحریک لاہور' امرتسر' فیروز پور' راولپنڈی' سیالکوٹ اور لائل پور کے شہری علاقوں کے طلبا' دفتروں میں کام کرنے والے کلرکوں اور ماتحت عدالتوں میں پیش ہونے والے وکیلوں تک محدود تھی لیکن جب حکومت نے نہری رقبہ کے انتظامی معاملات میں تبدیلی کی تجاویز پیش کیں اور باری دوآب

میں آبیانہ کی شرح میں اضافہ کر دیا تو نئی سوچ پنجاب کے دیہات میں بھی پہنچ گئی۔ بین الاقوامی سرحد پر واقع برطانوی حکومت کے اس بازوئے شمشیر زن صوبے میں انقلابی سوچ کے دھاروں کا پھوٹ نکلنا سامراجی طاقتوں کے لیے لمحہ فکریہ تھا یہ تشویش اس حد تک گہری تھی کہ سلطنت برطانیہ کے چوٹی کے حکمران بھی آنے والے دنوں کا تصور کرتے کانپ جاتے۔

کالونیز قانون نے زمین کے ساتھ صدیوں پرانا کسان کا رشتہ یکسر تبدیل کر دیا۔ اول تو کسان کو پنجاب کے مرکزی علاقوں سے بے دخل کر کے اسے مغربی اضلاع میں نہریں کھود کر وسیع و عریض بنجر زمین میں آب رسانی کر کے اسے کاشت کرنے کا کہا گیا۔ جب یہ منصوبہ کامیاب ہوا اور پنجاب کے ان اضلاع کی زمین ہندوستان کی زرخیز ترین اراضی بن گئی تو سرکار نے زمین کی کاشت کی مدت میں تبدیلی کا نظام متعارف کرایا جواز یہ پیش کیا گیا کہ ایسا یکسانیت کے لیے کیا جا رہا ہے۔ ان دنوں حکومت پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ زرعی اراضی کی کاشت کی مدت میں تبدیلی اس لیے کر رہی ہے کہ وہ آسام کی طرز پر پنجاب میں شجرکاری کرنا چاہتی ہے۔ بہرحال حقیقی مقصد یہ تھا کہ کسان محض کاشتکار بن کر رہ جائے اور کسی ایک جگہ ٹکنے نہ پائیں اس نئے نظام کے تحت باری دوآب کی طرح راولپنڈی کے بارانی علاقوں میں بھی زمین کے تخمینہ کی شرح میں اضافہ کر دیا گیا یہ اقدام اس علاقے کے کسانوں پر ایک کاری ضرب تھی جس کی بازگشت دوسرے علاقوں میں بھی سنی گئی اور صوبے میں ہر جگہ کسان صورت احتجاج بن کر رہ گئے۔ 1907ء تک صورتِ حال مزید خراب ہوئی تو کسانوں کی حمایت میں ایک تحریک وجود میں آ گئی اس دوران جب سبکدوش ہونے والے لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ریواز ایک الوداعی تقریب میں شرکت کیلئے امرتسر گئے تو خالصہ کالج کے طلبا نے ان کا استقبال احتجاجی مظاہروں کی صورت میں کیا۔ قومی اخبارات نے بھی احتجاجی تحریک کی حمایت میں اس خبر کو خوب اچھالا۔

اسی دوران راولپنڈی میں پر تشدد احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ 21 اپریل 1907ء کو ایک جلسہ عام کا آغاز "پگڑی سنبھال او جٹا" جیسی ولولہ انگیز نظم سے کیا گیا اسی جلسہ میں اجیت سنگھ نے زمین کے تخمینہ میں اضافہ پر حکومت کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا انہوں نے کہا "یہ (کسان) زمین ہی نہیں اس ملک کے بھی حقیقی حکمران ہیں، یہ تمام راجے مہاراجے ان کے "کمی" ہیں اور ڈپٹی کمشنر، پولیس سپرنٹنڈنٹ، چیف افسر اور حکومت تمام ان کے ملازم ہیں۔ اب جبکہ بنگال کے بعد پنجاب کے عوام خواب غفلت سے بیدار ہو چکے ہیں کسانوں کو چاہیے کہ اس وقت تک ہل نہ جوتیں جب تک سرکار اضافہ واپس نہیں لیتی۔" اجیت سنگھ نے لوگوں سے کہا کہ وہ جرأت سے کام لیں۔ بے خوف آگے بڑھیں اور اعزازی عہدوں کا بائیکاٹ کریں انہوں نے کہا اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی تفریق نہیں دونوں ہاتھوں میں ہاتھ دے کر جدوجہد کو آگے بڑھائیں۔

ڈپٹی کمشنر نے اجیت سنگھ کی تقریر کو باغیانہ قرار دیتے ہوئے انہیں اور ان کے دوسرے ساتھیوں گورداس رام، ہنس راج، املوک رام وغیرہ کو نوٹس ارسال کیے کہ وہ 2 مئی کو صبح 11 بجے عدالتی پوچھ گچھ کے لیے پیش ہوں۔ جس عدالت کے سامنے انہیں پیش کیا جانا تھا اس کے باہر صبح ہی سے لوگ جمع ہونا شروع ہو گئے اور وقتِ مقررہ تک ان کی تعداد اس حد تک بڑھ گئی کہ ڈپٹی کمشنر نے خوف کے مارے انکوائری ملتوی کر دی۔ اس کا شدید ردِ عمل ہوا اور وہاں موجود لوگوں نے نعرہ بازی شروع کر دی جس کے بعد ڈپٹی کمشنر ہاؤس اور آس پاس کی دیگر سرکاری املاک کی توڑ پھوڑ شروع ہو گئی۔ حکومت نے 68 مظاہرین اور ان کے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں اکثریت کا تعلق آریہ سماج تنظیم سے تھا جو عوام میں ہر دلعزیز تھے۔ ان پر بغاوت کا الزام عائد کیا گیا چند روز بعد ان افراد کو ایک اسپیشل مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیا گیا۔ ان میں سے صرف چھ کو سزا ہوئی باقیوں کے خلاف الزام ثابت نہ ہو سکا۔

راولپنڈی میں ہونے والے ان واقعات نے صوبے کے دوسرے حصوں کو بھی متاثر کیا لاہور میں بھارت ماتا سوسائٹی نامی ایک تنظیم نے مظاہرے کا اہتمام کیا۔ مظاہرین مال روڈ تک جانا چاہتے تھے جہاں برطانوی حکام کی رہائش گاہیں تھیں۔ بندوقوں اور لاٹھیوں سے مسلح پولیس کے گھڑ سوار دستوں نے ان کی پیش قدمی روکی۔ مزاحمت پر پولیس نے تشدد کی انتہا کر دی۔ نتیجے مظاہرین کو گھوڑوں کے سموں تلے روندا گیا۔ انہیں بندوقوں کے بٹ مارے گئے اور لاٹھیوں کے وار سے ان کے سر پھوڑ دیئے گئے۔ اس واقعے میں بھاری تعداد میں لوگ زخمی ہوئے کلکتہ کے اخبار امرت بازار پتریکا نے اپنی 8 مئی 1907ء کی اشاعت میں اس واقعے کی مذمت کرتے ہوئے لکھا کہ پولیس پاگلوں کی فوج لگتی تھی جس نے حد درجہ بے رحمی کا مظاہرہ کیا اخبار نے سوال اٹھایا کہ آیا اس قسم کا اقدام حکومت کی بوکھلاہٹ کا مظہر ہیں۔

II

حکومت بوکھلاہٹ کا شکار کیوں تھی اس کی دوسری وجوہ بھی تھیں۔ شائد خفیہ پولیس نے حکومت کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ انتہا پسند ''غدر پارٹی'' کی پچاسویں سالگرہ پر 10 مئی 1907ء کو ایک اور راؤنڈ کھیلنے کی تیاری کر رہے ہیں ساتھ ہی فوج کے ہندوستانی افسروں میں بڑھتی ہوئی بے چینی کی خبریں بھی آ رہی تھیں امرتسر سے حکومت کو یہ خبر بھی ملی کہ 26 ویں پنجاب انفنٹری کے سکھ سپاہی راولپنڈی اور لاہور کے مظاہرین کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں اور وہ فوج کے اندر بغاوت کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ شملہ سے ڈائریکٹر جنرل انٹیلی جنس نے اپنی ہفتہ وار رپورٹ میں لکھا کہ 37 ویں ڈوگرہ رجمنٹ کے ایک کلرک نے ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ ناروا سلوک کی شکایت کی ہے اور ریزرو فوجیوں کی تنخواہ 3 روپے سے کم کر کے 2 روپے ماہوار کرنے پر ناراضگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ اس نے

یہ بھی کہا کہ بلووں کے دوران اس کی رجمنٹ کے ہندوستانی فوجیوں کو اپنے ہی ہم وطنوں پر گولی نہیں چلانا چاہیے تھی اس کا خیال تھا کہ حکومت کے خلاف آئندہ جب مظاہروں میں شدت آئے گی تو ہندوستانی فوجی شائد دوبارہ سیاسی کارکنوں پر فائرنگ نہیں کریں گے۔

سر ڈینزل ابٹسن نے اپنی ڈائری میں لکھا کہ ''سب سے زیادہ خطرے والی بات یہ ہے اور جسے بری طرح محسوس کیا گیا ہے کہ خاص طور پر سکھوں کو ہر جلسہ میں بلایا جاتا ہے لائلپور میں تو سابق سکھ فوجیوں کو بھی ایسے دعوت نامے ملے ہیں ان کو خصوصی توجہ کا مرکز بنایا جارہا ہے تاکہ نہ صرف وہ ہر سیاسی جلسے میں شریک ہوں بلکہ سیاسی مقاصد کے لیے ان کی ہمدردیاں بھی حاصل کی جاسکیں اور ان کے جذبات ابھارے جاسکیں۔ ابھی تک سیاسی مظاہروں کا سلسلہ ضلعوں تک محدود ہے جس میں سکھ عنصر بے حد اہم ہے...... فیروز پور کے جلسہ عام میں تو جہاں حکومت کے خلاف تشویش کا کھلے عام اظہار کیا گیا وہاں کی سکھ رجمنٹ کے فوجی جوانوں کو خاص طور پر شرکت کی دعوت دی گئی اور وہ لوگ (سکھ) سینکڑوں کی تعداد میں جلسہ میں شریک بھی ہوئے۔

گوجرانوالہ کے ایک اخبار ہندوستان کے ایڈیٹر لالہ پنڈی داس نے ''ہندوستان اور افغانستان کے باسیوں کی طرف سے'' برطانوی فوج کے ان جوانوں کے نام جو امریکہ ہجرت کر گئے تھے ایک پمفلٹ پر مبنی ایک مضمون شائع کیا یہ پمفلٹ مردان میں ایک پٹھان فوجی سے برآمد ہوا لیکن اس سے پہلے اس کا ترجمہ انگلستان میں مقیم ایک سیاسی کارکن ساون سنگھ کے پاس پایا گیا اس کا انگریزی ترجمہ حکومت پنجاب کو لندن سے ارسال کیا گیا۔ اس پمفلٹ میں ہندوستانی اور برطانوی فوجی کے درمیان امتیاز کی واضح مثالیں دی گئی تھیں۔ ہندوستانی فوجیوں کے بارے میں پمفلٹ میں لکھا تھا کہ ان کو 9 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے جس میں اس کی یونیفارم کا خرچہ بھی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اس عہدے کے انگریز فوجی کو 45 روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے اس کے ساتھ روزانہ تین وقت کا کھانا اور بہترین یونیفارم اسے مفت مہیا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ تین برس کی ملازمت کے بعد انگریز فوجی کو ریٹائرمنٹ کے وقت 30 پونڈ یا 450 روپے گریجوایٹی کے طور پر دیئے جاتے ہیں۔ پمفلٹ میں ہندوستانی سپاہی سے سوال کیا گیا کہ ''وہ کیوں اپنے ہی لوگوں پر گولی چلا رہا ہے اور کیوں اپنی جان بھی خطرے میں ڈال رہا ہے کیا صرف اس لیے کہ وہ اپنے آقا کے ساتھ وفاداری نبھا رہا ہے اور بدلے میں اسے مل کیا رہا ہے گوری سرکار اسے جو بھی معاوضہ دے رہی ہے وہ ہندوستان میں سے وصول ہونے والے ٹیکسوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔ تم نے انگریز کا ایسا کیا نمک کھالیا اور انگریز یہ نمک کہاں سے لایا یہ نمک بھی ہندوستانی ہے انگریزی سرکار نے جو لوٹ مار مچا رکھی ہے اور ہندوستان کی دولت سے اپنے جو خزانے بھر رہا ہے کیا تم اس پر بھی خاموش رہو گے یوں ہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو گے کیا سفید چمڑی والے کالے

ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک کر رہا ہے وہ کسی بھی طور پر اطمینان کا باعث بن سکتا ہے۔"

اس پمفلٹ نے حکومتی حلقوں میں کھلبلی مچادی ہندوستان کے 22 سالہ ایڈیٹر لالہ پنڈی داس اور صحافی لالہ دینا ناتھ کو گرفتار کر لیا گیا ان پر بغاوت اور انگریزی سرکار کے خلاف عوامی جذبات مشتعل کرنے اور انھیں مسلح بغاوت پر اکسانے کا الزام عائد کیا گیا۔ اخبار شائع کرنے والا ہندوستان سٹیم پریس ضبط کر لیا گیا اور دونوں کو پانچ پانچ برس قید با مشقت کی سزا سنائی گئی ان کی گرفتاری نے گوجرانوالہ میں آگ بھڑکا دی چند نوجوان اس وقت بھی وہاں موجود تھے جب ان کو گرفتار کیا جا رہا تھا ان نوجوانوں نے صحافیوں کو ہار پہنائے اور جب پولیس کی گاڑی ان کو لے کر جانے لگی تو اس پر حملہ کر دیا۔

پنڈی داس اور دینا ناتھ کو گرفتاری سے قبل صوبائی حکومت نے ڈائریکٹر کرمنل انٹیلی جنس ایم اے سٹورٹ سے رائے طلب کی تو اس نے لکھا کہ عوامی حلقوں پر اس اخبار کا کچھ زیادہ اثر نہیں اور پھر دوسرے یہ کہ لوگ نہ تو اخبار پڑھنا جانتے ہیں اور نہ ہی خبریں سننے میں یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اس رائے کے باوجود حکومت نے ان ایڈیٹروں کے خلاف انتہائی کارروائی کی اس اقدام سے ایک مرتبہ پھر ظاہر ہوتا تھا کہ سرکار پوری طرح بوکھلا گئی ہے۔ تاہم ڈائریکٹر کی رپورٹ بھی جزوی طور پر درست تھی کیونکہ ان واقعات میں عوام کا ردِ عمل شدید تھا اور ملک بھر میں بلکہ بعض سرکاری حلقوں میں بھی اس کے خلاف احتجاج ہوا۔ بہر حال ان انقلابی حلقوں نے اس مرحلے پر درست سوچ کا مظاہرہ کیا کہ کوئی بھی تحریک عوام کی سیاسی سوچ ابھارے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی چنانچہ 1907ء اور 1909ء کے درمیان دو برسوں میں خاصا انقلابی لٹریچر لکھا اور تقسیم کیا گیا اس کی اشاعت بھارت ماتا نامی ایک ادارے نے کی۔ اس عرصہ میں جو تحریریں منظر عام پر آئیں ان میں نند لال کی "کامل اصلاح" دو حصوں میں شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ سرون سنگھ کی "غدر" "امانت میں خیانت" اور سردن سنگھ اور کشن سنگھ کی "دیسی فوج ظفر موج" "قومیں کس طرح زندہ رہتی ہیں" اور "سرکاری ملازمت" بھی ایسی تحریروں میں شامل تھیں اس کے علاوہ امبا پرشاد نے "باغی مسیح" لکھی اور اجیت سنگھ نے ہندی میں "ہندوستان میں انگریزی حکومت' انگلی پکڑتے پنچا پکڑا" اور انگریزی میں "تقسیم کرو اور فتح کرو" وغیرہ شامل ہیں ان کے علاوہ ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے جو کتابیں برطانوی حکومت کے خلاف ایک واضح پیغام دیتی تھیں ان میں "تلک مہاراج پر لیکچر" "ٹیپو سلطان" "میر قاسم" "جاپان کی ترقی" "روس کی موجودہ ریاست" "بندر بانٹ" "شریف چور" "زار کی سلطنت کا خاتمہ" وغیرہ شامل تھیں۔

اس عرصے میں صرف انقلابی لٹریچر ہی شائع اور تقسیم نہیں ہوا بلکہ حکومت کے خلاف منظم جدوجہد کی بھی کوشش کی گئی۔ اس کی تفصیلات اس وقت سامنے آئیں جب ہوشیار پور میں تلک پریس پر چھاپہ پڑا اور ایک ایسی سکیم منظر عام پر آئی جس میں آزادی ہند کے حوالے سے ایک حکمت عملی کا خاکہ پیش

کیا گیا تھا اس سکیم میں کہا گیا تھا کہ آزادی کی منزل تین مرحلوں میں حاصل ہو سکتی ہے اول ہندوؤں کو تجارت کی طرف راغب کرنا تا کہ فنڈز کا حصول یقینی بنایا جا سکے۔ دوسرے مرحلے میں مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانا اور تیرے مرحلے میں سکیم کو عملی جامہ پہنانا تھا اس مرحلے میں سرکاری خزانے اور ڈاکخانے لوٹنے کا پروگرام تھا۔ اس سکیم میں لوگوں کو عسکری تربیت دے کر "نوجوان جنگجوؤں" کے گروپ تشکیل دینا بھی شامل تھا ان جنگجوؤں کو منتظمین' سراغ رسانوں اور دہشت گردوں کی حیثیت سے تربیت دینا بھی سکیم کا حصہ تھا۔ دہشت گردوں کی حیثیت سے تربیت دینا بھی سکیم کا حصہ تھا۔ دہشت گردوں کو بم پھینکنے اور نشانہ بازی کی تربیت بھی دی جانا تھی تا کہ وہ کسی بھی وقت کسی بھی شخص کو گولی مار سکیں اس سکیم کا اولین مقصد یہ تھا کہ کسی طرح اعلیٰ حکام' سرکاری خفیہ ایجنسیوں کے لوگوں اور ایسے ہندوستانیوں کو دہشت زدہ کیا جا سکے جو ان اعلیٰ مقاصد کا ساتھ نہیں دیتے۔

اس "سکیم" کی دریافت کا سہرا انگریز حکومت نے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے سر تھا جس نے اس کی ایک مکمل رپورٹ مئی 1920ء میں پیش کی تاہم غیر معمولی پابندیوں اور پولیس کی سخت نگرانی کے باعث اس سکیم پر عملدرآمد نہ ہو سکا حکام پنجاب کے عوام خصوصاً سکھوں کو بری طرح شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس وقت ہر اس شخص کو گرفتار کیا گیا جس پر معمولی سا شک بھی گزرا۔ پوری سرکاری مشینری حرکت میں آ چکی تھی پنجاب کے انقلابیوں کے لیے ان حالات میں کام کرنا آسان نہ تھا لیکن اس کے باوجود ان کا سیاسی عمل جاری تھا اس صورت حال کا ہٹسن نے بھی اعتراف کیا اس نے اپنی ڈائری میں لکھا " پنجابی بے حد سخت کوش ثابت ہوا ہے۔ بعض حالات میں تو بنگالی سے بھی زیادہ۔ انہیں وجوہات کی بنا پر صورت حال سنگین ہوتی جا رہی ہے اور اگر کسی مرحلے پر جاٹ برادری کے سکھوں کی وفاداری بھی متزلزل ہو گئی تو ایسے خطرناک حالات پیدا ہو سکتے ہیں جو بنگال سے کہیں زیادہ سنگین بن سکتے ہیں۔"

کسانوں اور برطانوی فوج کے علاوہ پڑھے لکھے افراد اور بھی اس بے چینی کا شکار ہوئے کیونکہ صوبے میں روزگار اور کاروبار کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ جو بھی سیاسی اور انقلابی کام پنجاب میں ہو رہا تھا اس کیلئے قیادت آریہ سماج نے فراہم کی اس تنظیم نے اس کڑے وقت میں لوگوں کی صحیح سمت میں رہنمائی کی۔ ہوشیار پور کے سی آئی ڈی کے ایک اہلکار کی رپورٹ کے مطابق اس تنظیم کو ہر ہفتہ ہزاروں روپے چندے کی صورت میں موصول ہو رہے تھے اور "جولائی سے اب تک سینکڑوں طالبعلم اور سکولوں اور کالجوں کے اساتذہ ان کے لیے تندہی سے کام کر رہے ہیں۔" ہٹسن نے بھی لکھا کہ "اس کام کی روح رواں آریہ سماج ہے جو بنیادی طور پر مذہبی تنظیم کے طور پر ابھری لیکن کم از کم پنجاب کی حد تک اس کا مقصد سیاسی ہے۔"

حکومت کے لیے ایک اور امر جو پریشانی کا باعث بنا وہ یہ تھا کہ آریہ سماج اس دوران مسلمانوں کے ساتھ فرقہ وارانہ رواداری کی فضا قائم کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ مسلمان بچوں کو اپنے سکولوں میں نہ صرف داخلہ دیتی بلکہ ان سے رعائتی فیس بھی وصول کرتی۔ نئی محمڈن پارٹی کے رہنما محمد علی چشتی جو مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کی تلقین کرتے رہتے تھے آریہ سماج کے ساتھ مکمل رابطہ میں تھے۔

حکومت پنجاب نے 18 جون کو حکومت ہند کو ایک خط لکھا جس میں صوبے کی صورت حال کو دھماکہ خیز قرار دیا گیا تھا ان حالات کی ذمہ داری لاجپت رائے اور ان کے "ایجنٹ" اجیت سنگھ پر عائد کی گئی اجیت سنگھ ایک شعلہ بیان مقرر تھا جس نے لاہور کے بریڈلا ہال میں متعدد تقریریں کیں اس کا ایک دوست صوفی امبا پرشاد تھا جو مراد آباد میں ایک اخبار کا صحافی تھا۔ امبا پرشاد کو 1897ء اور 1901ء میں دو مرتبہ بغاوت کے الزام میں قید کی سزا دی گئی۔ 1907ء میں وہ لاہور منتقل ہو گیا اور اخبار ہندوستان میں سب ایڈیٹر کی ملازمت اختیار کی بعد ازاں وہ اخبار بھارت ماتا کا ایڈیٹر مقرر ہوا حکومت امبا پرشاد کی ذہانت اور قابلیت کی معترف تھی لیکن ساتھ ہی اس کو بدترین دشمن بھی قرار دیتی تھی سرکاری رپورٹوں کے مطابق وہ "خوفناک ترین" تھا جو "باغیانہ" سرگرمیوں میں ملوث پورے گروپ کا روح رواں اور "استاد" تھا۔ تحریک کیسے چلنی چاہیے اس کی حکمت عملی کسی ہو یہ بھی امبا پرشاد کے ذہن کی پیداوار تھی حکومت کا یہ بھی خیال تھا کہ امبا پرشاد کو کسی خوف یا لالچ سے جھکایا نہیں جا سکتا۔ لاجپت رائے کی اجیت سنگھ کے ساتھ سیاسی رفاقت اور جاری ایجی ٹیشن کی سرپرستی کے ثبوت بھی تھے لاجپت رائے نے لائل پور میں 21 اور 22 مارچ کو ایسی تقاریر کیں جنھوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور صورت حال مزید سنگین ہو گئی سرکاری ریکارڈ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لاجپت رائے کے گھر ہونے والے ایک اجلاس میں ان تجاویز پر بھی غور کیا گیا کہ دیہاتیوں کو آبیانہ ادا کرنے سے روک دیا جائے۔ لاجپت رائے پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ اجیت سنگھ کو ہر ماہ ایک سیاسی فنڈ سے 100 روپے دیا کرتے تھے اس کے علاوہ انہوں نے لندن میں بھائی پرمانند کو جو دو خط لکھے تھے وہ بھی ثبوت کے طور پر پیش کیے کہ ان کا پنجاب کی ایجی ٹیشن میں نمایاں ہاتھ تھا۔

ابٹسن نے لاجپت رائے پر یہ الزام بھی لگایا کہ وہ افغانستان کے امیر کے ساتھ خط و کتابت کیا کرتا تھا اس کا مقصد فوج کی وفاداریوں کو متزلزل کرنا تھا اس الزام کی بنا پر ابٹسن نے وائسرائے لارڈ منٹو سے لاجپت رائے اور اجیت سنگھ کو ریگولیشن III مجریہ 1818 کی دفعہ 2 کے تحت گرفتار کرنے کی اجازت بھی طلب کی تھی اس قانون کے تحت برطانوی حکومت کسی بھی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر کسی بھی مدت کے لیے جیل میں ڈال سکتی تھی۔ لاجپت رائے کو 9 مئی کو گرفتار کیا گیا اور اجیت سنگھ کو 3 جون کے روز، ہونوں کو ضلع بدر کیا گیا۔ لاجپت کو مانڈلے جیل میں ڈال دیا گیا۔ ساتھ ہی اخبار پنجابی کے ایڈیٹر کو بھی حراست میں

لے لیا گیا۔ یہ اخبار لاجپت رائے کی ملکیت تھا۔ گرفتاریوں کا ملک کے طول و عرض میں شدید ردعمل ہوا اور حکومت کے خلاف نفرت آمیز جدوجہد مزید زور پکڑ گئی۔ اس صورتحال کا اندازہ اس واقع سے لگایا جاسکتا ہے جس میں ایک دس سالہ بچے کو اس وقت حراست میں لے لیا گیا جب اس نے ایک "فرنگی" کے منہ پر کہہ دیا کہ "فرنگی کے انصاف پر لعنت" پولیس سٹیشن پہنچنے پر بھی بچے نے اس بات کا اعتراف کیا کہ اس نے وہ الفاظ ادا کئے تھے جس کے بعد اسے گرفتار کیا گیا اس بچے کے سیاسی شعور کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنے بیان میں کہا "ہاں میں نے کہا تھا کہ فرنگی کے انصاف پر لعنت ہو۔ کیونکہ تم لوگ ظالم ہو بے انصاف ہو تم نے ہم سے سب کچھ چھین لیا اور 1857ء میں کیا گیا وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔"

ادھر لالہ لاجپت رائے نے مانڈلے سے وزیر حکومت ہند لارڈ مورلے کو ایک خط لکھا کہ انہیں اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ "ابھی تک مجھے اپنے خلاف لگائے گئے الزامات کا ہی علم نہیں۔ بے گناہی کس بات کی پیش کروں...... میں نے راولپنڈی اور لاہور کے ہنگاموں میں حصہ نہیں لیا نہ ہی میں نے کسی فرد یا گروہ کو ہنگامے برپا کرنے کو کہا میں نے کوئی باغیانہ تقریر بھی نہیں کی...... میں نے ہمیشہ قانون اور دستور کے دائرے میں رہتے ہوئے حکومت کے ان اقدامات کے خلاف اظہار ناپسندیدگی کیا ہے جن کے بارے میں لوگوں کی بھی ایسی ہی رائے ہے ایسی ہی فضا میری گرفتاری کے وقت موجود تھی...... میں نے کبھی انتہا پرستی یا غیر قانونی طریق کار کی حمایت نہیں کی نہ ہی میں کسی ایسے گروہ کو جانتا ہوں جو ایسی سرگرمیوں میں ملوث ہے یا جوان سرگرمیوں پر لوگوں کو اکساتے ہیں۔ اگر میرے خلاف ہز میجسٹی کی فوج کے دیسی سپاہیوں میں نفرت پھیلانے کا الزام ہے تو وہ بے بنیاد ہے۔"

گوکھلے نے 10 جون 1907ء کو وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری کو لکھا کہ اجیت سنگھ کو لاجپت رائے کا شریک کار سمجھنا انتہائی درجہ کی بے انصافی اور لاعلمی ہے کیونکہ "جب میں گزشتہ فروری میں لاہور گیا تو اجیت سنگھ نے لاجپت رائے کے خلاف لاوا ابل دیا وہ لاجپت کو بزدل اور سرکار کا آلہ کار سمجھتا ہے۔" گوکھلے نے وائسرائے کو بھی ایک درخواست روانہ کی جس میں وائسرائے سے اس حوالے سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا اس درخواست پر بعض دیگر بااثر لوگوں کے دستخط بھی تھے۔ پنجاب کے اخبارات ہندوستان اور پنجابی نے بھی ان گرفتاریوں پر شدید ردعمل ظاہر کیا خصوصاً انہیں صوبہ بدر کرنے کے بارے میں لکھا گیا کہ لاجپت رائے کو مانڈلے جیل میں قید کرنا انتقامی کارروائی ہے اور یہ کہ "ایک بے گناہ اور قانون کا احترام کرنے والے برطانوی سرکار کی رعایا کے ایک فرد کو بے وجہ اپنے خاندان اور دوستوں سے دور کر دیا گیا ہے۔"

لاجپت رائے کے سیاسی کردار اور جدوجہد کے حوالے سے جو ابہام مندرجہ بالا سطور میں سامنے آیا ہے اور جو بعد ازاں ان کی ذات کے حوالے سے گہرا ہوا اس کا جائزہ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوا۔

شروع میں لاجپت رائے اس تحریک کے حق میں تھے وہ جلسوں سے خطاب کرتے اور ان کے انعقاد کے لیے تنظیمی اور مادی امداد بھی فراہم کرتے صوبے کے لوگ اور سیاسی تنظیمیں ان کی بے حد عزت کرتے تھے اور کسی جلسہ میں بھی ان کا نام استعمال کرنا قابل عزت بات سمجھی جاتی۔

لاجپت رائے‘ اجیت سنگھ‘ حیدر رضا اور صوفی امبا پرشاد کے جوش وجذبہ اور مقصد کے ساتھ خلوص کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ صوبہ بدری سے قبل انہوں نے اخبار پنجابی میں لکھا کہ اجیت سنگھ کی آواز پنجاب کی آواز ہے۔ تاہم دونوں کے درمیان جدوجہد کے طریق کار پر اختلاف بعد میں پیدا ہوا کیونکہ لاجپت رائے اعتدال پسند ذہن رکھتے تھے اور اجیت سنگھ کی انتہا پسندانہ سوچ کے حق میں نہیں تھے یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے مانڈلے سے برطانوی حکومت کے اعلیٰ ترین افسر کو اپنے خط میں اپنے ”بے گناہ“ ہونے اور کسی ایسے گروہ سے جو انتہا پسند سوچ رکھتا ہو لاتعلقی کا اظہار کیا تو سیاسی سطح پر ان کے خلاف ایک فضا بن گئی اور ایجی ٹیشن کرنے والوں نے اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا۔

اخبار ماڈرن ریویو میں 1907ء کے دوران شائع ہونے والے ایک مضمون میں لاجپت رائے نے لکھا دہشت گردی ایک ایسی تلوار ہے جو کھیلنے والے کا ہی گلا کاٹتی ہے..... خون کا بدلہ خون ہی ہے..... سازشی کا خنجر اس وقت تک تیز نہیں ہوتا جب تک اسے شہید کی قبر پر نہیں لگایا جاتا۔“ لاجپت رائے کے ”معذرت نامے“ کو گوکھلے نے جس نظر سے دیکھا اور لارڈ منٹو کے نام اپنے خط میں اس کی جو تعبیر کی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاجپت رائے کو اس وقت کی تحریک کا ایک غدار گردانا گیا اور حکومت کے نام خط کو غیر مشروط معافی نامہ قرار دیا گیا۔

من بہاری موجمدار نے اپنی کتاب ”ہندوستان کی سیاسی تنظیمیں اور قانون ساز اسمبلی کی رپورٹیں“ میں لکھا کہ ”لاجپت رائے کا انقلابی تحریک کے ساتھ کیا تعلق تھا ایک گہرا راز ہے اگرچہ وہ ان لوگوں میں شامل تھے جنہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کی اعتدال پسندانہ پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا۔“ موجمدار نے مزینی اور جیری بالڈی کا اردو میں ترجمہ کیا اور ان کو ہندوستان‘ جاپان‘ یورپ اور امریکہ کے انقلابیوں کے ہم پلہ قرار دیا وہ برطانوی راج سے شدید نفرت رکھتا تھا۔ لارڈ منٹو اور لارڈ مورلے کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اِبٹسن کا لاجپت رائے کو خطرناک قرار دینا حقائق سے لاعلمی تھا۔ اس خط وکتابت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاجپت رائے نہیں بلکہ اجیت سنگھ راج کے لیے حقیقی خطرہ تھا۔ لیکن جب لاجپت رائے کو رہا کیا گیا تو مجبوراً حکومت کو اجیت سنگھ کو بھی چھوڑنا پڑا۔ دونوں کو 18 نومبر 1907ء کو رہا کیا گیا اور اس کے لیے وزیر حکومت ہند نے وائسرائے کے ساتھ مشورہ اور گوکھلے کے خط کے مندرجات پر انحصار کرتے ہوئے پنجاب کی حکومت کو ہدایت جاری کی۔ اس کے باوجود پنجاب حکومت ان کو رہا کرنے میں تامل سے کام لے رہی تھی کیونکہ اس کا اپنا نظریہ یہ تھا کہ اس کے

نتیجے میں سیاسی فضا ایک مرتبہ پھر مکدر ہو جائے گی اور حکومت نے حالات سدھارنے میں جس قدر محنت کی ہے اس پر پانی پھر جائے گا۔

لارڈ منٹو اور لارڈ مورلے کے درمیان خط و کتابت سے جو امور سامنے آئے وہ یہ تھے کہ حکومتِ پنجاب نے ان کی گرفتاری کے بعد ان پر جو الزامات عائد کیئے گئے اس کا کوئی ٹھوس ثبوت اس کے پاس نہ تھا۔ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ابٹسن نے بدامنی کو بغاوت سمجھ لیا لارڈ منٹو تو اس صورتحال کا ایک فکری جائزہ بھی لیتا ہے اس کے ذہن میں کوئی ابہام نہ تھا کہ معاشرے میں نئی سوچ اور امنگوں کے جنم لینے کے باعث ایک اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کا کوئی سدِ باب نہیں۔ پنجاب کی صورتحال پر اس کی لارڈ مورلے کے ساتھ جو مراسلہ نگاری ہوئی اس میں دونوں نے لاجپت رائے کو کم از کم اس الزام سے بری کر دیا کہ انہوں نے فوج کے اندر بغاوت کے بیج بونے کی کوشش کی تھی۔ ایک اور اہم پہلو جو سامنے آیا وہ یہ تھا کہ دونوں نے کالونی قانون (Colonisation Bill) پر تنقید کی اور اسے ایک غلط قانون قرار دیا لیکن دونوں اس بات پر متفق تھے کہ پنجاب میں بدامنی برطانوی مفادات کیلئے بے حد خطرناک ہے کیونکہ چناب کالونی ہندوستانی فوج کے پنشن یافتہ افراد نے آباد کی تھی جو تاج برطانیہ کے وفادار تھے اور یہ کہ پنجاب ہی وہ صوبہ ہے جس میں فوج میں بھرتی کے اہل لوگ کثرت سے رہتے ہیں۔ یہی وہ حوالہ تھا جس کی بنا پر برطانوی حکمران پنجاب کو اپنا بازوئے شمشیران کہتے تھے۔

جب ان امور پر اتفاق رائے ہوا تو لارڈ منٹو نے کالونی قانون واپس لے لیا مالیہ اور آبیانہ کی شرح میں کمی کر دی اس کے بعد حالات نے یوں پلٹا کھایا کہ بظاہر افراتفری کی فضا بہتر ہو گئی لیکن تحریک ختم نہ ہوئی اور زیر زمین چلی گئی ایسے گروپوں کے اجلاس تقریباً روزانہ ہونے لگے اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے گئے جن کا تعلق فنون لطیفہ سے تھا بنگال میں سیاسی تھیٹر نے جو مقبولیت حاصل کی اس کے اثرات پنجاب میں بھی ظاہر ہونے لگے اور یہاں ایسے تھیٹر کو فروغ ہوا جس میں اعلانیہ، دبے الفاظ اور ذو معنی گفتگو میں باغیانہ سوچ عوام کے ذہنوں میں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

رہائی کے بعد اجیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے انقلابی سرگرمیوں میں کوئی کمی نہ آنے دی اگرچہ اس کا عملی اظہار نہیں ہو رہا تھا لیکن اس قسم کی تحریروں کی اشاعت اور تقسیم کا کام پہلے کی طرح جاری و ساری ہو گیا لیکن اس سلسلے میں جدت یہ پیدا کی گئی کہ تاریخی کرداروں کا حوالہ بہت زیادہ استعمال ہونے لگا۔ مثلاً اس دور میں جو پمفلٹ تقسیم ہوئے ان میں "کمار سنگھ" اور "......کی یاد میں" نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور ان کا مواد کسی بھی طرح ماضی میں تقسیم کیے گئے پمفلٹوں سے کم دھماکہ خیز نہ تھا۔ ان کے علاوہ تانتیا توپی، لکشمی بائی اور 1857ء کی عظیم جدوجہد کے بعض کرداروں کو تحریروں کے ہیرو کے طور پر پیش کیا گیا اول الذکر دو کتابچوں کے متعدد شمارے ڈپٹی کمشنر لاہور کو بھی ارسال کیئے گئے۔

ان دنوں برلن سے شائع ہونے والے ایک ہفتہ وار رسالے "تلوار" میں باغیانہ تحریروں پر مشتمل مضامین کثرت سے شائع ہوئے اوران کی نقول کسی نہ کسی طرح ہندوستان پہنچتی رہیں ان مضامین میں ہندو اور مسلمان آبادی میں اکثر یہ اپیل کی جاتی کہ وہ اس جذبہ اور اتحاد کا مظاہرہ کریں جس طرح انہوں نے 1857ء کی جنگ میں شانہ بشانہ لڑتے ہوئے کیا تھا۔ 1909ء میں اس جریدے میں شائع ہونے والے مضمون کا یہ اقتباس ظاہر کرتا ہے کہ اس کی تحریریں زہر میں بجھی ہوئی تھیں۔ "اگر گوری چمڑی والے مٹھی بھر لٹیروں کی حکمرانی پر اہل ہندوستان کی شرمندگی کو بغاوت کا نام دیا جاتا ہے' اگر ایسے بدمعاشوں کو ختم کرکے قوم کو آزاد کرانے' ایک ہر دلعزیز خود مختار حکومت قائم کرنے اور ملک میں انصاف' نیک دلی اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار پر معاشرہ کی بنا رکھنے کا اعلیٰ اور ارفع مقصد بغاوت ہے اور اگر اپنے گھروں کے تقدس کا احترام' اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق جینے اور اللہ اور وطن کا نام لینا بغاوت ہے تو ہر اس شخص پر لعنت ہے جو باغی نہیں جو مجاہد نہیں اور جوان حالات میں اپنے بستر پر چین کی نیند سوتا ہے جب اجنبی ان پر حکومت کر رہے ہیں اور ہمارے خون پسینہ کی کمائی کھا کھا کر موٹے ہو رہے ہیں۔"

یورپ سے ان دنوں ایک اور جریدے کا اجراء ہوا جس کا نام "مارو فرنگی کو" تھا۔ ایسے رسالے اور ان میں شائع ہونے والے مضامین خفیہ طور پر تقسیم ہوتے تھے۔ انہی دنوں ضیاء الحق نامی ایک سرکاری اہلکار کا ایک مضمون پشاور کے ایک اخبار میں 30 اگست 1909ء کو شائع ہوا جس کا عنوان تھا "آخری آواز سنو" مصنف کو گرفتار کیا گیا اور پانچ برس کیلئے قید کی سزا سنائی گئی دلچسپ بات یہ ہے کہ ضیاء الحق یو پی پولیس کا ایک مخبر تھا جسے وہاں کی حکومت نے اس لیے پنجاب بھیجا کہ وہ اجیت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کے ساتھ دوستی قائم کرکے ان کے منصوبوں کے بارے سرکار کو خفیہ اطلاعات بہم پہنچاتا رہے لیکن وہ اجیت سنگھ کے مقصد سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس کے رنگ میں رنگ کر ایک سچا اور کھرا انقلابی بن گیا۔

ان زمین دوز سیاسی سرگرمیوں اور انقلابی تحریروں کی ترسیل کے باعث پنجاب حکومت ایک مرتبہ پھر افراتفری کا شکار ہوئی اس نے پھر ستم کا بازار گرم کر دیا اور دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہونے لگیں۔ زیادہ تر اجیت سنگھ کے ساتھیوں کو نشانہ بنایا گیا لیکن اصل مقصد اجیت سنگھ پر ہاتھ ڈالنا تھا اس سلسلے میں 5 نومبر 1909ء کو لاہور میں واقع قومی بک ایجنسی' اردبان بک ایجنسی، سہانک پریس، سوراج پریس، بندے ماترم بک ایجنسی، بھارت ماتا بک ایجنسی اور ہندوستان پریس پر چھاپہ مارا گیا اس کے علاوہ لائل پور میں اجیت سنگھ کے والد ارجن سنگھ اور قصور میں ان کے سسر دھنپت رائے ایڈووکیٹ کے گھروں کی بھی تلاشی لی گئی۔ ان تمام مقامات سے پولیس کو بھاری تعداد میں "باغیانہ" تحریروں پر مبنی کتابیں' کتابچے اور غیر شائع شدہ مسودے ہاتھ لگے جن سے یہ بات بھی پولیس کے علم میں آئی کہ اجیت سنگھ کا بھائی کشن سنگھ اس قسم کے مواد کی اشاعت و ترسیل کا مرکزی کردار تھا اور یہ کام وہ جون 1909ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد

سے کر رہا تھا۔

حکومت نے اس تمام مواد کو احاطہ تحریر میں لانے والے افراد کو گرفتار کر لیا لیکن اجیت سنگھ اور صوفی، مبا پرشاد جن کو حالات کا اندازہ پہلے ہی سے ہو گیا تھا ان چھاپوں سے قبل خلیج فارس کے شہر بوشیر چلے گئے تھے اور جس روز ان کے ٹھکانوں کی تلاشی لی گئی وہ وہاں سے بھی غائب ہو گئے۔ ان گرفتار شدگان کو طویل المیعاد قید کی سزائیں دی گئیں ان میں کشن سنگھ' نند لال' ایشوری پرشاد اور منشی رام بھی شامل تھے جن کو کالے پانی بھیج دیا گیا۔

1907ء اور 1909ء کے دوران چلنے والی یہ انقلابی تحریک رہنماؤں کے جیل چلے جانے کی وجہ سے اس مرحلے پر تقریباً ختم ہو جاتی ہے اس کے جاری نہ رہنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے رہنماؤں نے مسلمان اور سکھ کسانوں کے ساتھ یکساں رابطہ نہ رکھا اور نہ ہی مشرقی پنجاب کے ہندو کسانوں کو متاثر کیا۔ اس کے یوں یک لخت دم توڑ دینے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت کی قومی سیاسی قیادت بڑی حد تک انتہا پسندی کے برعکس اعتدال کی راہ اپنانے کی بات کر رہی تھی اور سوراج اور سودیشی کے نعرے مقبول سے مقبول تر ہوتے جا رہے تھے۔ دوسری طرف مسلمانوں کا رویہ تھا انہیں اس تحریک کے حوالے سے بہت سے شکوک تھے اور پھر اس دوران 1906ء میں مسلمانوں کے ایک وفد کی شملہ میں لارڈ منٹو کے ساتھ ملاقات کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کا قائم ہونا اور جداگانہ انتخاب کا مؤقف اختیار کرنا وغیرہ کے حالات و واقعات نے بھی اس انقلابی تحریک کے خاتمے کا جواز فراہم کیا۔ پنجاب میں بھی جہاں بڑی تعداد میں مسلمان کسان اس تحریک کے حامی تھے وہاں ان کی قومی قیادت سودیشی تحریک کے خلاف کام کر رہی تھی مسلمانوں کی قیادت نے تو سودیشی کے خلاف ایک ایسی تحریک قائم کرنے کا اعلان کیا جس کا مقصد مسلمانوں کی ترقی تھا۔

لیکن ایک بات طے شدہ ہے کہ یہ تحریک اقتصادی صورتحال کے حوالے سے چلی اور اس کی بنیاد زرعی زمین تھی جس پر قبضہ کیلئے حکومت نے کئی قانونی اقدامات کئے۔ برطانوی حکومت کے لیے یہ تحریک ایک ایسا دھچکا تھا جس میں سکھوں کی وفاداری کے بارے میں اس کے نظریات باطل ہوئے سکھوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو قومی قوتوں کیلئے طاقت کا باعث بنا۔ انہوں نے قومی مفاد کو اولین ترجیح دی اور اس کا ثبوت آئندہ پیش آنے والے حالات ہیں اس تحریک کے باعث قوم پرست قوتیں سکھوں کو اپنا قدرتی حلیف سمجھنے لگیں۔ بپن چندر پال نے 29 دسمبر 1908ء کو لندن کے کیکسٹن ہال میں تقریر کرتے ہوئے کہا "پنجاب نے ثابت کر دیا ہے کہ اس کا جسم مرا نہیں سکھوں نے اسے ایک ایسی طاقت بخشی ہے کہ وہاں وہ ہاتھ میں تلوار لیے اس کے لیے اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کو تیار ہے۔ سکھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ سر کٹوا سکتے ہیں لیکن مقصد کی سچائی اور وطن پرستی پر یقین کو

متزلزل نہیں ہونے دیں گے۔"

اس تحریک نے اقتصادی بحران کی گود میں آنکھ کھولی اور دیکھتے ہی دیکھتے خود کو نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ' جاپان اور امریکہ میں چلنے والی انقلابی تحریکوں کے ساتھ ہم آہنگ کر لیا۔ پنجاب کے بعض نوجوان جو جاپان اور یورپ میں میکینکل انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے گئے تھے اس تحریک سے متاثر ہو کر وہاں کے انقلابی گروپوں سے وابستہ ہو گئے اور ہتھیار اور دھماکہ خیز مواد کی تیاری کی تربیت بھی حاصل کی جو بعد ازاں ہندوستان میں ان کے اور دیگر انتہا پسند تنظیموں کے کام آئی۔ لیکن جب پنجاب میں حکومت کی سختیاں بڑھیں اور ایسے افراد کیلئے عرصہ حیات تنگ ہو گیا تو وہ یہاں انقلابی سرگرمیاں جاری نہ رکھ سکے اس قسم کے پنجابی انقلابیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو بیرون ملک گئے اور وہاں اپنی بنیاد بنا کر ہندوستان کے اندر انقلابی تحریکوں اور گروپوں کی مدد کرتے تھے۔

÷

باب:2

غیر ملک میں انقلابی تحریکیں (1907 تا 1917ء)

پنجاب میں زرعی زمین اور اقتصادی حوالے سے چلنے والی انقلابی تحریک تقریباً دم توڑ چکی تھی اور اس کی ایک بڑی وجہ حکومتی جبر اور تشدد کی پالیسی تھی تاہم اس تحریک کی مکمل بیخ کنی نہیں ہو سکی۔ اس کے مرکزی رہنما اب ہندوستان چھوڑ کر دوسرے ممالک میں بس گئے تھے اور یوں انقلابی سرگرمیاں اب دیار غیر میں منتقل ہو چکی تھیں اور یہ عمل 1910ء اور 1914ء کے درمیان مکمل ہوا اس کے باوجود حکومت کے اندیشوں میں کوئی خاص کمی نہیں آئی کیونکہ صوبے میں اب بھی ایسے لوگ موجود تھے جن کے بارے شبہ تھا کہ وہ انقلابی ذہن رکھتے ہیں اور تحریک کے بیرون ملک رہنماؤں سے ہدایات لیتے رہتے ہیں۔ اگرچہ کالونیز قانون واپس لے لیا گیا تھا امن وامان قائم رکھنے کیلئے حفاظتی اقدامات سخت کر دیئے گئے تھے لیکن ان وجوہات کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی جو انقلابی تحریک کی بنیاد بنیں لہٰذا بدامنی اور عوام میں پائی جانے والی بے چینی ختم نہ ہو پائی۔

برطانوی فوج میں پنجابیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہ دوسرے ممالک میں بھی گئے اور برطانیہ کے اتحادیوں کی حیثیت سے ان کی جنگیں بھی لڑتے رہے وہ تعلیمی اور معاشی طور پر پسماندہ تھے ان کو جان بوجھ کر پسماندہ رکھا گیا کیونکہ حکومت صرف ان جسموں پر اپنی عطا کردہ وردی اور بندوق دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ پنجاب کا نوجوان برطانیہ کی لڑائیوں میں خواہ وہ کسی بھی جگہ لڑی جا رہی ہوں شامل ہو اور ان کی جلائی ہوئی بھٹی کا ایندھن بنے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز سرکار نے اس صوبے میں لوگوں کو جاگیریں عطا کیں خطابات سے نوازا۔ سیاسی لیڈروں کو اپنی قانون ساز اور اداروں میں نامزد کیا اور سرکاری ملازمتوں میں بھرتی کے لیے پنجابی امیدواروں کو ترجیح دی لیکن ایسا کوئی منصوبہ نہیں بنایا جس سے

یہاں تعلیم اور ہنر مندی عام ہو اور لوگوں کے شعور میں اضافہ ہو۔ زرعی اراضی منصفانہ طور پر تقسیم ہو اور صنعتیں لگائی جائیں انگریز حکومت کو خوف تھا کہ ان اقدامات کے بعد علم و دانش میں جو اضافہ ہوگا اور جو خوشحالی آئے گی وہ اس کے عسکری عزائم کیلئے زہر قاتل ہو گی چونکہ معاشی مسئلہ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا اس لیے انقلابی ذہن رکھنے والوں کے علاوہ بھی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہندوستان چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں جا کر آباد ہو گیا اور یوں کسی نہ کسی طور پر تشدد طریقوں سے انقلاب کا شعلہ جلتا رہا۔

منٹو مارلے تنظیمی و سیاسی اصلاحات 1909ء میں نافذ ہوئیں جن کے تحت مسلمان آبادی کو ہندو اکثریت کے غلبہ کے خلاف دستوری تحفظ جداگانہ انتخابات کی صورت میں ملا۔ انڈین نیشنل کانگریس اس طریق انتخاب کے خلاف تھی اور ان دنوں مسلمانوں کے خلاف یہ پراپیگنڈا کیا جا رہا تھا کہ انہیں انگریز کے ساتھ وفاداری کا انعام اس سیاسی امتیاز کی صورت میں دیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ انگریز حکومت کی اس پالیسی کا حصہ تھا جس کا مقصد ہندوستان کی آبادی کو مذہب اور دیگر حوالوں سے تقسیم کر کے اہل ہند کی سیاسی طاقت اور اتحاد کو کمزور کرنا تھا۔ گو ان اقدامات سے انقلابی سرگرمیوں کا خاتمہ تو نہیں ہوا لیکن قومی سیاسی قوت بڑی حد تک کمزور ہوئی مثال کے طور پر آریا سماج جیسی مذہبی اور سیاسی تنظیم جو کہ 1907ء اور 1909ء کے درمیانی عرصہ میں "باغیانہ" سرگرمیوں میں حصہ لیتی رہی ان "اصلاحات" کے نافذ ہونے کے بعد فرقہ واریت کے مسائل میں الجھ کر رہ گئی۔ اس نے سرکار کی سیاسی امتیاز کی پالیسی کو تنقید کا نشانہ بنایا اور سوال اٹھایا کہ آیا حکومت ہندوؤں کو پنجاب میں یہی حق دینے کو تیار ہے جہاں ہندو مسلمانوں کے مقابلے میں اقلیت میں تھے۔

حکومت نے صرف سیاسی سطح پر ہی نہیں بلکہ معاشرتی سطح پر بھی اس پالیسی کا نفاذ کیا مثال کے طور پر سکولوں اور کالجوں کو مذہبی حوالوں سے نیا نام دیا گیا۔ اگرچہ بظاہر اس کا مقصد عیسائی مشنری تنظیموں کیلئے تعلیم کے میدان میں ایک خاص جگہ بنانا تھا لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی منافرت معاشرے کی نچلی سطح تک پھیل گئی اور قومی سیاسی قوتیں کمزور تر ہو گئیں انگریز نے بڑے منظم اور غیر محسوس طریقے سے مذہبی نفرت کے بیج بوئے اور اس کا واحد مقصد جدوجہد آزادی سے آگے ہر قسم کی دیوار کھڑی کرنا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی نہیں نکلا کہ آریا سماج یا خالصہ دیوان جیسی تنظیموں نے جدوجہد سے ہاتھ روک لیا تاہم اب یہ تنظیمیں مذہب اور فرقوں کے حوالے سے پہچانی جانے لگیں اور ان کا جارحانہ قومی کردار مجروح ہوا خصوصاً آریہ سماج ایک ایسی نیشنلسٹ تنظیم تھی جو معاشرے پر مغربی اثر و نفوذ کے خلاف ہندوستانی سوچ کو فروغ دینے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے اس کا ایک سامراج مخالف تاثر تھا اور قائم رہا اگرچہ ان تنظیموں میں بھی انتہا پسند اور اعتدال پسند عناصر کی تقسیم پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں آئندہ آنے والے برسوں میں ان کی پہچان صرف معاشرتی اصلاح اور فلاح کے کام کے حوالے سے رہ گئی۔ حکومت نے ہندوستان میں انقلابی

سرگرمیوں پر بڑی حد تک قابو پالیا تھا لیکن بیرون ملک ان میں معنی خیز اضافہ ہوا۔

اس سلسلے میں ایک معتبر نام شیاما جی کرشن ورما کا ہے جنہوں نے لندن میں انڈین ہاؤس قائم کیا جو بعد ازاں انقلابی سوچ کے فروغ اور سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ شیاما جی "انڈین سوشیالوجسٹ" کے نام سے ایک رسالہ کی اشاعت کرتے تھے جس میں اکثر مضامین میں ہندوستان کے سیاسی معاملات کا تانا بانا دیگر عالمی انقلابی تنظیموں سے ملایا جاتا۔ ان مضامین میں خاص طور پر ہندوستان کے نوجوانوں کو یہ پیغام دیا جاتا کہ وہ خود کو مادر وطن کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ انہوں نے ہندوستانی طلبا کے لیے وظائف کا اہتمام بھی کیا۔ یہ نوجوان نہ صرف انگلستان میں تعلیم حاصل کرتے بلکہ انڈین ہاؤس کا انقلابی فلسفہ بھی سیکھتے۔ انہوں نے ہندوستان کی کئی انقلابی تحریکوں میں مالی معاونت بھی کی۔ شیاما جی کی ایک شریک کار میڈم کام تھیں جو 1902ء میں یورپ گئیں اور وہاں اور امریکہ میں ہندوستان کی آزادی کے حق میں آواز اٹھائی انہوں نے فرانس میں بندے ماترم کے نام سے ایک رسالہ بھی شائع کیا جس میں ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے مختلف بحثیں شروع کی گئیں۔ یہ رسالہ کسی نہ کسی طور پر ہندوستان پہنچتا اور دیگر ممالک کو بھی ارسال کیا جاتا۔ ان مضامین کا مقصد اہل ہند میں آزادی کے شعور کا فروغ تھا اس کے علاوہ انہوں نے پیرس میں انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم بھی اسی مقصد کیلئے قائم کی۔ میڈم کام پیدائشی انقلابی نہ تھیں لیکن شیاما جی کے انڈین ہاؤس نے ان کا ذہن اس طرف مائل کیا۔ 1908ء میں انہوں نے ایک تقریر میں کہا "تین برس قبل میں پر تشدد سرگرمیوں کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی لیکن لبرل ازم کا پرچار کرنے والوں (انگلستان کی حکومت کا حوالہ) کی منافقت اور بدمعاشی کی وجہ آج میں اسے جائز سمجھتی ہوں۔" پنجاب میں اس خاتون کے ساتھ کام کرنے والوں میں ہردیال اور پرمانند نمایاں تھے جو بعد ازاں امریکہ چلے گئے۔

ہندوستان میں ظلم و ستم نوجوانوں کو قتل کیے جانے اور گنیش سرکار کو عمر قید اور جائیداد کی ضبطی کی جو سزا سنائی گئی اور لندن میں مقیم ہندوستانی اس سے بیحد مشتعل ہوئے۔ امرتسر کے ایک نوجوان مدن لال ڈھینگرا نے مشتعل ہو کر انڈین آفس کے کرتا دھرتا سر ولیم کرزن ولی کو یکم جولائی 1909ء کو اس وقت گولی سے اڑا دیا جب وہ لندن کے امپیریل انسٹی ٹیوٹ میں نیشنل انڈین ایسوسی ایشن کی سالانہ تقریب میں شریک تھے سر ولیم اس حوالے سے بھی جانے جاتے ہیں کہ انہوں نے ہندوستانی طلبا میں کام کرنے کیلئے ایک خصوصی انٹیلی جنس فورس قائم کی تھی۔ مدن لال انجینئرنگ کی تعلیم ختم کر چکا تھا اور ہندوستان واپسی کی تیاری کر چکا تھا۔ سر ولیم کے اس طرح سر عام قتل نے لندن میں خوف کی ایک فضا قائم کر دی۔ ہندوستان کے بعض رہنماؤں نے جن میں سر آغا خان' گوکھلے' سر سریندر ناتھ بینرجی' سر منچر جی بھونگری' سر کھر پاڈے' این سی کلکر' بی سی پال' سر ڈنشا پیٹ اور فضل بھائی کریم بھائی شامل تھے مدن لال کے اس

"بزدلانہ" فعل کی سخت مذمت کی۔

مقدمہ قتل کی سماعت کے دوران مدن لال نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا وہ قابلِ داد ہے۔ اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا "میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ایک انگریز کا خون کیا اور اس کی وجہ محب وطن ہندوستانی نوجوانوں کو پھانسی پر لٹکانا اور ملک بدر کرنا ہے اس کی وجہ وہ ظلم و ستم ہے جو برطانوی سرکار نے ہندوستان میں روا رکھا ہوا ہے۔ اس قتل کا ذمہ دار صرف میں ہوں میں نے اپنے ضمیر کے علاوہ کسی سے مشورہ نہیں کیا اور اگر میں نے کوئی سازش کی ہے تو اپنے فرض سے...... یہ ایک جنگ ہے جو جاری ہے...... میرا ایمان ہے کہ جس قوم کو سنگین کے زور پر غلام بنا لیا جاتا ہے وہ ہمیشہ حالت جنگ میں رہتی ہے...... چونکہ ایسی نہتی قوم کیلئے اعلانیہ جنگ ممکن نہیں ہوتی اس لیے میں نے اچانک حملہ کیا۔ مجھے جنگ کیلئے بندوق میسر نہیں تھی اس لیے میں نے پستول نکالا اور فائر کر دیا...... اس وقت ہندوستانیوں کو صرف ایک ہی سبق سیکھنا ہے کہ مرا کس طرح جاسکتا ہے اور اس کے لیے واحد طریقہ یہ ہے کہ خود مر کے دکھایا جائے۔ اس لیے میں موت کو گلے لگا رہا ہوں۔ میں مر جاؤں گا لیکن شہید کی موت...... اگر مجھے دوبارہ زندگی ملے تو بھی اسے اسی اعلیٰ مقصد کیلئے قربان کردوں گا۔ ایسا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک ماں (وطن) کو آزادی نہیں مل جاتی اور انسانیت کا بول بالا نہیں ہو جاتا اور بھگوان راضی نہیں ہو جاتا۔ بندے ماترم۔"

دھن جی کیر نے اپنی کتاب "ویر سرکار" میں مدن لال کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا "ہمارے اس غلام وطن میں کتنے ایسے لعل ہیں جو آزادی کی دیوی کو خوش کرنے کے لیے خود کو اس کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں" سر ولیم کے قتل پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈبلیو ایس بلنٹ نے اپنی ڈائری میں لکھا "بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سیاسی قتل حقیقی منزل کو دور لے جاتے ہیں یہ بے حد لغو خیال ہے اس قسم کے واقعات ایسے خود غرض حکمرانوں کو ہلانے کیلئے ضروری ہوتے ہیں تاکہ انہیں احساس ہو کہ خود غرضی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ شائد انگلستان کے حکمران اس وقت ایسے احساس سے عاری ہیں۔ جب تک انہیں ایسے جھٹکے نہ لگیں شاید تھپڑ کھانے کے بعد انہیں معذرت خواہی کا خیال آ جائے۔"

امریکہ اور کینیڈا میں مقیم ہندوستانی لوگ بھی اس عرصہ میں انقلابی تحریکوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اگرچہ وہاں کی صورتحال قدرے مختلف تھی۔ پنجاب کے بعض افراد بیسویں صدی کے اوائل میں ان ممالک میں ہجرت کر گئے تھے۔ ان میں اکثر لوگ چین کی طرف سے آئے تھے شائد انہوں نے سنا ہو کہ مغرب کے ان ممالک میں انہیں زندگی کے بہتر مواقع میسر آئیں گے۔ انہوں نے وہاں لکڑی کے کارخانوں، کانوں اور کینیڈین پیسفک ریلوے کی تعمیر کے کاموں میں ملازمت اختیار کر لی۔ اگرچہ انہیں سفید فام مزدوروں کے مقابلے میں کم اجرت ملتی تھی لیکن ان کی آمدن اس قدر ضرور تھی کہ وہ اپنی

ضروریات پر اخراجات کے بعد بچت بھی کر لیتے تھے یہ خبر جب ہندوستان میں ان کے عزیزوں اور دوستوں کو ملی تو ان میں سے ایسے افراد جن کے پاس کاشت کے لیے زمین ناکافی تھی اور جن کی آمدنی محدود تھی ہجرت کر گیے۔

یہ وہ دور تھا جب برطانوی حکومت نے فصلوں کی خریداری شروع کر دی اور ان کا معاوضہ نقدی کی صورت میں کسانوں کو دینے لگے لیکن یہ معاوضہ اس قدر کم تھا کہ پنجاب کی زرعی معیشت پر برا اثر پڑا خصوصاً جب مالیہ جنس کی بجائے نقدی کی صورت میں وصول کیا جانے لگا۔ دیہات کے دیہات کسانوں سے خالی ہونے لگے کیونکہ وہ اپنی محدود اراضی یا تو بیچ باٹ کر یا سود خوروں کے پاس رہن رکھ کر وہاں سے جانا شروع ہو گیے۔ خشونت سنگھ اور ستندر رسنگھ نے اپنی کتاب ''غدر'' میں لکھا ہے کہ زمین گروی رکھنے پر کسان کو جو رقم ملتی تھی وہ تیزی سے کم ہوتی گئی جس زمین کے عوض 1870ء کے عشرے میں 50ہزار روپے تک مل جاتے تھے 20برس بعد یہ رقم صرف 15ہزار تک آ گئی۔ اس کے علاوہ گروی رکھنے کی شرح میں بھی متعدد بہ اضافہ ہوا مثال کے طور پر 1875ء اور 1878ء کے سالوں کے دوران تقریباً ایک لاکھ 65ہزار ایکڑ زمین گروی رکھی گئی تھی 1884ء اور 1888ء کے دوران چار برسوں میں یہ زمین تین لاکھ 85ہزار ایکڑ ہو چکی تھی۔

صورت حال اس قدر خراب ہو چکی تھی کہ حکومت کو انتقال اراضی کا قانون نافذ کرنا پڑا جب یہ قانون آیا تو حکام نے کہا کہ اس سے کسانوں کو سود خوروں سے نجات مل جائے گی لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا چنانچہ پنجاب کے لوگوں خصوصاً سکھوں نے دھڑا دھڑ بیرون ملک جانا شروع کر دیا۔ کینیڈا پیسفک ریلوے بنانے والے چاہتے تھے کہ پنجاب کے تنومند نوجوانوں کو ملازمتیں دیں لیکن سفید فام مزدوروں نے ایشیائی لوگوں کے خلاف فضا خراب کر دی اور ریلوے حکام کو اس قدر مجبور کیا کہ انہوں نے اجرتوں میں امتیاز برتنا شروع کر دیا۔ اس کے باوجود ہندوستان سے آنے والوں کی تعداد میں کمی نہیں ہوئی۔ 1901ء کے اعداد و شمار کے مطابق کینیڈا میں ہندوستانیوں کی تعداد 2312 جبکہ امریکہ میں 6313 تھی۔ 1906ء سے 1908ء کے اوائل میں صرف کینیڈا میں آنے والے ہندوستانی لوگوں کی تعداد 5000 سے زائد تھی۔ اس عرصہ کے دوران ہندوستانی دیگر برطانوی نوآبادیوں مثلاً فجی' برٹش گیانا' ملایا اور ہونڈراس میں بھی ملازمت کیلئے گئے لیکن وہاں ان سے غلاموں جیسا سلوک کیا گیا۔ ہندوستانی آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ بھی گئے مگر ان کا مقصد تجارت کرنا تھا۔ اب دیگر برطانوی نوآبادیوں سے بھی ہندوستانی کینیڈا پہنچنا شروع ہو گئے اور یوں ان کی ایک بڑی تعداد اس ملک میں بس گئی تھی۔

چند برسوں کے اندر ہی ان کو احساس ہو گیا کہ سفید فام لوگ ان سے نسلی امتیاز برتنا شروع ہو گئے ہیں بعض مقامات پر سے تو تشدد کی خبریں بھی آنے لگیں۔ ہندوستانیوں نے اس پر احتجاج کیا لیکن

ان کا طریق کار پر امن تھا انہوں نے حکام کو درخواستیں یادداشتیں اور چٹھیاں بھیجنا شروع کر دیں لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا اس دوران سفید فام لوگوں نے کھلے عام اشتعال انگیز کارروائیاں شروع کر دیں۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب ہندوستانیوں نے محسوس کر لیا کہ درخواستیں بھیجنے کی بجائے حالات سے نمٹنے کیلئے کوئی اور راستہ اختیار کرنا چاہیے اس کا فوری جواز وینکوور میں 18 اکتوبر 1906ء کو ہونے والا وہ اجتماع تھا جس میں سفید فام لوگوں نے ہندوستانیوں کے خلاف زہر اگلا ہندوستانیوں کی معاشرت خصوصاً سکھوں کے طرز زندگی کو نشانہ بنایا گیا وہاں کے اخبارات نے بھی ان کا ساتھ دیا ساتھ ہی وزیر نوآبادیات ونسٹن چرچل کو تار بھیجے گئے اور کینیڈا کے وزیر اعظم کو یہ مراسلہ بھیجا گیا کہ وینکوور میں اب مزید کسی ہندوستانی کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

کینیڈا میں بس جانے والے پنجابی لوگوں میں وہ ریٹائرڈ فوجی بھی تھے جنہوں نے برطانیہ کے لیے کئی جنگیں لڑیں اور تمغے جیتے تھے ان کا خیال تھا کہ برطانوی رعایا کی حیثیت سے اگر وہ کسی جگہ جنگ لڑ سکتے ہیں تو انہیں کسی بھی برطانوی نوآبادی میں رہنے کا اتنا ہی حق ہے لیکن کینیڈا میں ان کے ساتھ جس نسلی امتیاز کا سلوک روا رکھا گیا انہیں سمجھ آ گئی کہ صرف آزاد قوموں کے افراد کو ہی عزت ملا کرتی ہے یہی وہ احساس تھا جس نے انہیں اپنے وطن کی آزادی کیلئے لڑنے کا حوصلہ دیا اسی حوصلے کے تحت انہوں نے پہلے امریکہ اور کینیڈا میں تارکین وطن کیلئے امتیازی قانون کے خلاف جدوجہد کا فیصلہ کیا اور یہی جدوجہد بعد میں وطن کی آزادی کی لڑائی میں تبدیل ہوئی قانونی جدوجہد میں انہیں جس بات سے جرأت ملی وہ یہ تھی کہ ہندوستانیوں نے ایک آزاد ملک میں جمہوریت اور جمہوری مزاج کا بھی قریب سے مطالعہ کیا چونکہ وہاں شہری آزادیاں حاصل تھیں اس لیے بھی انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی وطن کو آزاد کرا کے ایسی ہی جمہوریت لائیں گے لیکن جب انہیں ذلت آمیز سلوک کا سامنا کرنا پڑا تو ان کا لڑائی کا ارادہ اور بھی مصمم ہو گیا بعض اوقات ان سے ایسے سوال بھی پوچھے جاتے کہ ہندوستان کی آبادی کتنی ہے۔ آیا تمام 30 کروڑ لوگ انسانوں کی طرح رہتے ہیں یا جانوروں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہ کہ وہ کس طرح غلامی میں زندگی گزار رہے ہیں۔

اس جدوجہد کا آغاز تنظیموں کی تشکیل اور اجلاس منعقد کرنے سے ہوا جہاں تارکین وطن کو سیاسی سوچ سے لیس کیا جاتا بعض تنظیموں نے چھوٹے موٹے جریدوں کی اشاعت بھی شروع کر دی۔ ان میں زیادہ تر تعداد سکھوں کی تھی جو گوروں کے ذلت آمیز سلوک کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ اولاً انہوں نے گوردوارے تعمیر کرنا شروع کیے یہ گوردوارے وینکوور، وکٹوریہ اور دوسرے چھوٹے قصبوں میں بنے اور بعد ازاں سیاسی تحریک کے مراکز میں تبدیل ہوئے یہاں تمام ہندوستانی لوگ اجلاس کرتے سکھوں نے گورمکھی، اردو اور انگریزی میں رسالے اور پمفلٹ بھی شائع کیے۔

کینیڈا ہی نہیں ہندوستانیوں کے خلاف نسل پرستی اور نفرت کی فضا امریکہ میں بھی پائی جاتی تھی۔ امریکہ چونکہ انگلستان کی نوآبادیات میں آبادکاری کے بارے میں کسی دباؤ میں نہ تھا اس لیے امریکی انتظامیہ کئی وجوہات کی بنا پر ہندوستانیوں کے داخلے پر پابندی بھی لگا سکتی تھی اور اس کے لیے جواز یہ ہوتا کہ آبادکاران کے خزانے پر بوجھ ثابت ہوگا۔ اسے کسی قسم کی بیماری ہے یا اجنبیوں کو قبول کرنے کے معاہدے کی شرائط پوری نہیں کرتا۔ امریکہ کے سفید فام مزدوروں نے 1907ء اور 1908ء کے دوران ہندوستانی اور جاپانی مزدوروں پر حملے بھی کیے اگرچہ مغربی ساحل کے صنعتکار اور ریلوے حکام کم اجرت کی بنا پر ایشیائی لوگوں کو ملازمتیں دینے کو تیار تھے لیکن انہیں بھی سفید فام مزدوروں کے غیض وغضب کا سامنا کرنا پڑتا۔ آہستہ آہستہ ہندوستانیوں نے محسوس کرلیا کہ انہیں امریکیوں کی اس غنڈہ گردی کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ واشنگٹن کے قصبے ٹوکاما میں پنجاب کے مزدوروں نے ایک حملہ میں امریکیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں بھاگنے پر مجبور کردیا اس کے نتیجے میں اپنے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے منظم جدوجہد کا ایک شعور پیدا ہوا اس کے بعد امریکیوں کے حملے تو ختم ہوگئے لیکن ہندوستانیوں کے خلاف نفرت کی فضا بدستور قائم رہی انہیں ریل گاڑیوں، پارکوں، ہوٹلوں اور سینما گھروں میں بے عزت کیا جاتا اور طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جاتا کئی پارکوں کے باہر اس قسم کے نوٹس آویزاں کیے گئے "کتوں اور ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔"

اس مرحلے پر جی ڈی کمار اور ہرنام سنگھ کینیڈا سے امریکہ چلے گئے اور دریائے کولمبیا کے کنارے بس جانے والے ہندوستانیوں میں ہندوستانی طرز معاشرت کا پرچار شروع کیا۔ یہ رہنما وہاں کے حالات سے باخبر ہونے پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ سماجی اصلاح کی بجائے انہیں سیاسی طور پر منظم کیا جائے چنانچہ پورٹ لینڈ میں ایک اجلاس کے دوران بحرالکاہل کے ساحل پر ہندوستانیوں کی پہلی تنظیم وجود میں آئی بھائی سوہن سنگھ بھکنا اس کے صدر، جی ڈی کمار جنرل سیکرٹری اور پنڈت کاشی رام اس ایسوسی ایشن کے خزانچی چنے گئے لیکن جی ڈی کمار کی علالت کے باعث ایسوسی ایشن ایک دو اجلاسوں سے آگے نہ بڑھ سکی اس دوران ٹھاکر داس سوری جو پورٹ لینڈ میں رہتے تھے کی ہدایت پر بھائی سوہن سنگھ اور پنڈت کاشی رام نے کیلیفورنیا میں لالہ ہردیال کو پورٹ لینڈ آکر ایسوسی ایشن کی قیادت سنبھالنے کی دعوت دی۔ لالہ ہردیال 25 مارچ 1913ء کو بھائی پرمانند کے ہمراہ سینٹ جان پہنچے پہلے ہی اجلاس میں یہ طے پایا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھا لینے چاہئیں یوں ہندوستانیوں نے امریکہ میں پہلی مرتبہ جارحیت اور مسلح جدوجہد کے حق میں آواز اٹھائی۔ اجلاس میں یہ فیصلہ بھی ہوا کہ "غدر" کے نام سے ایک ہفت روزہ رسالے کا اجرا کیا جائے جس کا صدر دفتر سان فرانسسکو میں ہوگا چنانچہ اس شہر میں رسالے اور جدوجہد کے لیے جو مرکز قائم کیا گیا اسے غدر آشرم یا یوگنتر آشرم کا نام دیا گیا۔ اس آشرم میں 21 اپریل کو منعقدہ

ایک اجلاس میں جو قرارداد منظور کی گئی اس کے نکات درج ذیل ہیں:

1- تنظیم کا نام ہندی پیسفک ایسوسی ایشن ہوگا ہندی ایسوسی ایشن آف پیسفک کوسٹ نہیں۔
2- تنظیم کا مقصد مسلح جدوجہد کے ذریعے ہندوستان کو برطانیہ کی غلامی سے نجات دلانا ہے تاکہ وہاں برابری کے اصولوں کی بنیاد پر ایک جمہوری ریاست قائم کی جائے۔
3- تنظیم کا مرکزی دفتر سان فرانسسکو میں ہوگا جو آج کل دنیا بھر کے انقلابیوں کا گڑھ ہے۔
4- تنظیم ''غدر'' کے نام سے اردو، پنجابی اور انگریزی زبانوں میں ایک ہفت روزہ جریدے کا اجراٗ کرے گی۔
5- تنظیم کے انتخابات ہر سال ہوا کریں گے۔
6- ہر فیکٹری اور ریلوے کے مختلف یونٹوں میں کام کرنے والے ہندوستانی اپنی کمیٹیاں چنیں گے جو مرکزی کمیٹی سے رابطہ رکھیں گی۔
7- مرکزی کمیٹی کا انتخاب علاقائی کمیٹیاں کریں گی جو الگ اپنے اخبار اور رسالے شائع کرنے اور دیگر تنظیمی کام کرنے کی پابند ہوں گی۔
8- تنظیمی کمیٹیاں ایک سہ رکنی کمیشن کا انتخاب بھی کریں گی جس کا مقصد تنظیم کے سیاسی اور خفیہ مقاصد کو آگے بڑھانا ہوگا۔
9- ہر رکن ہر ماہ ایک ڈالر چندہ کے طور پر ادا کرے گا۔
10- تنظیم مذہب اور عقیدے سے بالاتر ہو کر صرف سیاسی اور انقلابی کام کرے گی کیونکہ مذہب ہر ایک کا ذاتی معاملہ ہے۔
11- پارٹی کا کام کسی بھی صورت منفعت بخش نہیں سمجھا جائے گا نہ ہی اسے ایک پیشہ کے طور پر اپنایا جائے گا البتہ پارٹی کے سیکرٹریٹ میں کام کرنے والے افراد کو ماہانہ تنخواہ دی جائے گی لیکن کم از کم اور اس کا فیصلہ ایسے افراد کی ضروریات کے مطابق کیا جائے گا۔

چند ہی دنوں میں یہ تنظیم مقبولِ عام ہوگئی۔ ''غدر'' کا پہلا شمارہ اردو زبان میں شائع ہوا۔ بعد میں دیگر زبانوں میں بھی اس کی اشاعت کی گئی۔ گورمکھی میں شائع ہونے والا شمارہ سب سے مقبول ہوا۔ یہ رسالہ امریکہ کے مغربی ساحل پر بسنے والے افراد اور کینیڈا، فلپائن، فجی، جاپان، چین میں شنگھائی، ہانگ کانگ، جاوا، ساٹرا، ملایا، برما، سیام اور مشرقی افریقہ کے علاوہ ہندوستان بھی بھیجا گیا۔ ''غدر'' کے مقاصد جو پہلے شمارے میں شائع ہوئے یہ تھے:

''اس تحریک کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام انگریزی حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیں ان کو تباہ کر دیں ان کی بیخ کنی کر دیں۔ بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی کرم خوردہ درخت ہو۔ ہمارا

بنیادی مقصد انگریز کو نکال کر ہندوستان میں ایک قومی حکومت قائم کرنا ہے۔"

ایک اور شمارے میں یہ لکھا گیا:

"1857ء کے غدر کو 50 برس ہو گئے ہیں اب ہمیں ایک اور بغاوت کی ضرورت ہے۔ آج ہم انگریزی سرکار کے خلاف ایک جنگ کا آغاز کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد غدر ہے بغاوت برپا کرنا ہے۔ ہمارا کیا کام ہے غدر۔ یہ غدر کہاں برپا ہوگا۔ ہندوستان میں۔ وہ وقت دور نہیں جب رائفل اور خون قلم اور اس کی روشنائی کی جگہ لے لے گا۔"

غدر پارٹی کے چند نعرے یہ تھے:

اتحاد اور اتفاق کی برکت	طاقت اور آزادی
نفاق کا نتیجہ	کمزوری اور غلامی
اتحاد کی بنیاد	سوشلزم
نفاق کی بنیاد	سامراجیت

وقت بدل رہا ہے اے ہندوستانی نوجوان اٹھ اور اپنا فرض ادا کر اقتصادی' سیاسی اور معاشرتی غلامی کا طوق گردن سے اتار پھینک۔ ہمارا مذہب کیا ہے' انسانیت' فتح عوام کی ہوگی۔

"غدر" کے بعض شماروں میں گورمکھی زبان میں "باغی کی گونج" اور "باغی کا سندیسہ" کے عنوان سے مضامین شائع ہوئے ان سے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

"تلوار نکال کر دشمن پر پل پڑنے کا وقت آن پہنچا۔ وقت آ گیا ہے کہ سامراجی دشمن کے خلاف علم بغاوت بلند کیا جائے۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم میدان جنگ میں کود پڑیں۔"

اور یہ کہ:

"وفد بھیجنے درخواستیں ارسال کرنے کا زمانہ چلا گیا اب وقت ہے کہ تمہارے ہاتھ میں تلوار اور ڈھال ہو۔"

"ہمیں گوریلا جنگ لڑنی چاہیے' ایسے قدم اٹھانے چاہئیں جو وقت کا تقاضا ہیں اور وقت کہہ رہا ہے کہ دشمن پر ٹوٹ پڑو۔"

"وطن جا کر فوری طور پر باغیوں کی صف میں شامل ہو جاؤ"

جب بھائی سوہن سنگھ کو گرفتاری کے بعد منٹگمری جیل میں ڈالا گیا تو ایک روز انہوں نے جیلر کو قومی حکومت کے بارے میں بتایا "ہم ہمیشہ سے ایک جمہوری حکومت قائم کے خواہاں رہے ہیں...... پارٹی کا بنیادی مقصد کسی بھی طریقہ سے ایسی حکومت قائم کرنا ہے جو اپنی ہو۔"

پارٹی نے اپنے جھنڈے کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا کیونکہ لالہ ہردیال کا خیال تھا کہ

جھنڈا اسی وقت لہرایا جائے گا جب برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان ہو جائے گا۔ "غدر" گاہے گاہے "ضرورت ہے" کے عنوان سے درج ذیل اشتہار بھی شائع کیا کرتا تھا۔

"ضرورت ہے ایسے جوشیلے جوانوں کی اور بہادر سپاہیوں کی جو ہندوستان میں جا کر غدر کا کام منظم کریں۔"

اس کام کی تنخواہ	موت
اس کا انعام	شہادت
پنشن	آزادی
دائرہ کار	پورا ہندوستان

8 نومبر 1913ء کے شمارے میں یہ اداریہ شائع ہوا:

"پیارے قارئین! آپ کا فرض آپ سے کیا تقاضا کرتا ہے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ وہ کیا ہے آپ ہماری جسمانی ذہنی اور مالی مدد کریں۔ صرف یہ کافی نہیں کہ معدودے چند افراد آگے آئیں اور جدوجہد شروع کرنے کا عزم کریں۔ ہمارا مقصد اعلیٰ اور ارفع ہے اور یہ تبھی حاصل ہو سکتا ہے اگر آپ سب منظم ہو کر محنت اور قربانی کیلئے تیار ہو جائیں۔"

غدر پارٹی کے اکثر اجلاس امریکہ، کینیڈا، شنگھائی، ہانگ کانگ اور سنگاپور کے گوردواروں میں ہوتے جن میں شعلہ بیان مقرر انقلابی نظمیں پڑھتے۔ اکثر "غدر" کے سرورق پر بھارت ماتا کا نقش ہوتا جس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں غدر پارٹی کا نشان ہوتا۔ پارٹی کی تمام تحریریں "بندے ماترم" کے الفاظ سے شروع ہوتیں جو کہ پارٹی کا ایسا مقبول نعرہ بنا کہ جب بھی پارٹی کے لوگ آپس میں ملتے تو "بندے ماترم" کہتے۔ اس رسالے کے ادارتی عملہ میں لالہ ہردیال، کرتار سنگھ، پرتھی سنگھ، رام چند، بھگوان سنگھ، برکت اللہ، جگت سنگھ، محبوب علی، عنایت علی خان اور امر سنگھ شامل تھے۔

ایک شمارے میں ڈاکٹر چنبیا نے جو غدر پارٹی میں جنوبی ہندوستان سے تعلق رکھنے والے واحد رکن تھے لکھا کہ پارٹی نے سب سے پہلے ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں چھاپہ مار جنگ کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا منصوبہ یہ تھا کہ گوریلا جنگ کشمیر اور شمال مغربی سرحدی صوبہ سے شروع کی جائے کیونکہ بلند و بالا پہاڑی اور دشوار گزار علاقے ہونے کی وجہ سے یہاں انگریزی فوج کو نقل و حرکت کرنے میں دقت پیش آئے گی۔ منصوبہ بناتے وقت اس یقین کا اظہار کیا گیا تھا کہ کشمیر اور سرحدی صوبہ آسانی کے ساتھ فتح کر لیے جائیں گے اور پھر وہاں بنیاد بنا کر جنگ کا دائرہ عمل ہندوستان کے دوسرے علاقوں تک پھیلا دیا جائے۔ چونکہ ان علاقوں کے لوگ مذہب، معاشرت اور بے پناہ غربت کے باعث انگریز سے نفرت کرتے تھے اس لیے غدر پارٹی ان علاقوں میں مسلح جارحیت کو آسان سمجھتی تھی۔ لیکن پارٹی کو اس بات کا

بھی پورا احساس تھا کہ گوریلا جنگ کی تیاری کوئی آسان کام نہ ہوگا اور اس سکیم کو بارآور ہونے میں کم از کم دس برس کا عرصہ درکار ہوگا۔ لیکن 1915ء میں بنائے گئے اس منصوبہ میں اس یقین کا اظہار کیا گیا تھا کہ 1925ء تک پارٹی کشمیر کو آزاد کرالے گی جہاں سے وہ مزید پیش قدمی کرے گی اور اس کا اگلا نشانہ سرحدی صوبہ اور پھر پنجاب اور یوپی ہوگا۔

ڈاکٹر پنچھی ہی کے بقول "غدر پارٹی کی تحریک پورے امریکہ اور دیگر ممالک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے کارکن خصوصی طور پر جوق در جوق اس میں شامل ہوتے جارہے ہیں۔ کل تک جو لوگ جاہل اور ہندوستان کے حالات سے مکمل طور پر بے خبر تھے آج وہ سیاسی شعور کی بلندیوں پر ہیں آج وہ حب الوطنی اور انقلاب کے رنگ میں رنگے گئے ہیں۔ آج وہ غدر کی تحریک کو آگے بڑھانے اور پارٹی کی قیادت سنبھالنے کیلئے پوری طرح تیار ہیں۔"

لاہور سازش کیس کا فیصلہ کرتے وقت جج نے لکھا "سکھ ہمیشہ سے برطانوی حکومت کی حرکات کے بارے میں پوری طرح آگاہ تھے وہ وفادار رعایا ہیں لیکن کسی نہ کسی طریقے سے آہستہ آہستہ ان کے ذہنوں کو اس قدر مسموم کردیا گیا کہ وہ انقلابی ہندوؤں کی سازش کا شکار ہوتے گئے۔ ہردیال اور اس کے ساتھیوں نے سکھوں کی سادہ لوحی اور معصومیت کا پورا فائدہ اٹھایا ان کے جھوٹے سچے مسائل اور کینیڈا کے تارکین وطن کے لیے قوانین کے حوالے سے ہندوستانی لوگوں خصوصاً سکھوں کی مشکلات کی آڑ میں انہوں نے (ہردیال وغیرہ) اپنی سیاسی دکان چمکائی اور ایسی سازش کا بیج بویا جس کا مقصد ہندوستان میں برطانوی حکومت کا خاتمہ تھا۔"

برطانوی جج کا یہ خیال اہل پنجاب خصوصاً سکھوں کی غدر کی تحریک کے ساتھ والہانہ لگاؤ اور جوش وخروش کی روشنی میں باطل ہو جاتا ہے۔ محسوس ہوتا ہے انگریزی حکومت کا زمینی حقائق کے ساتھ معمولی تعلق بھی نہ تھا۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے غدر پارٹی کا قیام عمل میں آچکا تھا جب لالہ ہردیال اس میں شامل ہوئے پارٹی نے ان کی قیادت اور سیاسی سوچ کی نیرنگی کے باعث دنوں میں اپنا مقام بنالیا تھی کہ جب وہ اپریل 1914ء میں فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ گئے تو ان کی غیر موجودگی میں بھی پارٹی انہی کی سوچ کے سہارے چلتی رہی لیکن ہردیال اس کام میں اکیلے نہ تھے غدر پارٹی ایک اجتماعی سوچ کی بنیاد پر پروان چڑھی اور اس کی قیادت بھی اجتماعی تھی غدر پارٹی نے چند ماہ کی زندگی میں جس طرح انگریز کی حکومت کو ناکوں چنے چبوائے وہ اس اجتماعی قیادت کا ہی نتیجہ تھی پارٹی کی سوچ اور سیاسی سمت اسقدر صحیح اور تیز تھی کہ برطانوی حکومت کی لاکھ کوشش کے باوجود اس کی قیادت اور کارکنوں کے قدم نہ ڈگمگائے حکومت نے یہ بھی کوشش کر دیکھی کہ تحریک کو ہندو، سکھ اور مسلمان کی فرقہ واریت کے تناظر میں پیش کرے اور ان میں

مذہب کی بنیاد پر پھوٹ ڈلوائے لیکن تحریک کی ٹھوس سیاسی بنیاد مل نہ سکی۔

لیکن اہل ہند کی بدقسمتی کہ جب تحریک کا انقلابی نعرہ زوروں پر تھا اور چھاپہ مار جنگ شروع کرنے اور کشمیر کو آزاد کرانے کے منصوبہ کو عملی جامہ پہنایا جانے والا تھا کہ پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی ہو سکتا ہے کہ ان کا بنیادی منصوبہ کامیاب رہتا لیکن ہوا یوں کہ عالمی جنگ شروع ہونے کے ساتھ ہی یہ منصوبہ ترک کر دیا گیا۔ پارٹی نے اب یہ اندازہ لگایا اور یہ غلط اندازہ تھا کہ برطانوی حکومت کے خلاف محدود جنگ کرنے کے بجائے اس کا دائرہ کار پورے ملک تک پھیلا دینا چاہیے اور یہی سوچ غدر پارٹی کی ناکامی کا باعث بنی۔ تجارتی بحری جہاز "کام گت مارو" کا واقعہ بھی اس ناکامی کا ایک اہم حصہ بنا۔

کام گت مارو ایک تجارتی بحری جہاز تھا جو جاپان کی ایک کمپنی کی ملکیت تھا۔ جہاز معمول کے مطابق 23 مئی 1914ء کو وینکوور کی بندرگاہ کے نزدیک براوی آبنائے میں لنگر انداز ہوا اس کا غدر پارٹی سے تعلق تھا نہ ہی اس کی آمد پارٹی کی تنظیم کی کسی ہدایت کا نتیجہ تھی مگر اس جہاز کی آمد کے بعد جو کچھ ہوا اس سے سامراجی حکومت کے خلاف اس جدوجہد کو ایک نئی جہت اور قوت ملی جو کینیڈا' امریکہ اور جنوب مشرق ایشیا کے جزائر میں جاری تھی اور جس کو "غدر" کی تحریروں نے حکام کے خلاف بے چینی کی لہر کو ہوا دے کر ایک انقلابی تحریک میں تبدیل کر دیا۔ کامگت مارو کے مسافروں کو جن مشکلات کا سامنا تھا اس کا اظہار بھی بخوبی کیا گیا بعد کے حالات اور واقعات میں یہی مسافر غدر پارٹی کی سوچ اور جدوجہد کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں۔

کینیڈا نے ہندوستانی عوام کی اپنے ملک میں آمد کو روکنے کیلئے طرح طرح کے قوانین بنا رکھے تھے ان میں کینیڈین پریوی کونسل آرڈر نمبر 920 سب سے بدنام قانون تھا اس کا تعلق مسلسل سفر کے حوالے سے بہت اہم تھا اس قانون نے ہندوستانی عوام کو کینیڈا تک سفر کرنے اور وہاں بس جانے میں بے حد مشکل پیدا کی بلکہ وہاں پہلے سے اقامت پذیر ہندوستانیوں کو اپنے اہل خانہ کو اپنے پاس بلانے کے راستہ میں بھی دشواریاں پیدا کر دیں تارکین وطن کینیڈا کے حکام سے مسلسل رابطہ میں تھے کہ وہ اس قانون کو واپس لے لیں لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

اسی دوران بھائی بلونت سنگھ' بھائی نرائن سنگھ' بھائی جلوہ سنگھ اور نند سنگھ پر مشتمل ایک وفد اپریل 1913ء میں پہلے لندن اور بعد میں ہندوستان گیا تا کہ برطانوی حکومت کو اپنے نقطہ نظر سے آگاہ کر سکیں۔ ہندوستان میں وہ مقامی رہنماؤں سے بھی ملے اور عوامی رائے کی تشکیل کیلئے اجلاس بھی منعقد کیے۔ پنجاب میں کینیڈین انڈین امیگریشن سوسائٹی بھی وجود میں آئی جس کے صدر چودھری رام بھاج دت تھے سوسائٹی نے حکومت کو ایک یادداشت ارسال کی کہ کینیڈا میں ہندوستانی تارکین وطن کے خلاف نسل پرستی اور امتیازی قوانین کے باعث پیدا ہونے والی صورت حال کا ازالہ کیا جائے۔ لیکن جب لندن اور

ہندوستان میں انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو وفد نے کینیڈا واپسی کا ارادہ کیا ان کے ساتھ اور بہت سے لوگ بھی کینیڈا جانے کو تیار ہو گئے چنانچہ ایک تجارتی بحری جہاز چھ ماہ کے لیے کرایہ پر لیا گیا (چارٹر کیا گیا) اور اس کے لیے مالی مدد سنگاپور کے ایک خوشحال ہندوستانی تاجر بابا گوردوت سنگھ نے کی اس جہاز کا نام کاماگٹا مارو تھا جو جاپان کی ایک کمپنی کی ملکیت تھا۔ اس جہاز پر 376 مسافر سوار تھے ان میں سکھوں کی تعداد 346 تھی اور باقی ہندو اور مسلمان تھے ان سب کا تعلق پنجاب سے تھا۔ بابا گوردوت سنگھ بھی اس جہاز پر سوار تھے۔ جہاز ہانگ کانگ میں مسافروں کے حوالے کیا گیا اور بھائی گوردوت سنگھ نے روانگی سے قبل وہاں چوٹی کے ایک برطانوی وکیل سے قانونی مشورہ بھی کیا۔ وکیل نے انہیں یقین دلایا کہ جہاز پر سوار کسی بھی مسافر کو کینیڈا میں داخل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔

کاماگٹا مارو کا سفر ایک تاریخی واقعہ کے طور پر سامنے آیا دنیا بھر میں اس کی زور شور سے پبلسٹی ہوئی جب جہاز کینیڈا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو دی وینکوور ڈیلی' نیوز ایڈورٹائزر اور دی وکٹورین ٹائمز کے صحافیوں نے جہاز پر سوار مسافروں سے انٹرویو کئے بعد میں جہاز کی آمد کا ان اخبارات میں خوب غلغلہ ہوا ان اخبارات نے لکھا کہ جہاز کے مسافروں کی اکثریت ان طاقتور اور صحت مند پنجابی لوگوں کی ہے جنہوں نے برطانوی فوج میں خدمات سرانجام دی ہیں اور جو طویل القامت' خوبرو اور صحت مند ہیں لیکن کینیڈا کی وزارت صحت کے بعض افسروں نے 90 مسافروں کو بیمار قرار دے کر کینیڈا میں داخلہ کیلئے نااہل قرار دے دیا اور باقی افراد کے ساتھ بھی مختلف بہانے بنا کر یہی سلوک کیا گیا۔ بھائی گوردوت سنگھ نے حکام سے اپیل کی کہ انہیں جاپانی کمپنی کو کرایہ کی مد میں 20 ہزار ڈالر کی تیسری اور آخری قسط ادا کرنا ہے اور یہ رقم وہ تبھی اکٹھا کر سکتے ہیں اگر تمام مسافر ہندوستان سے لایا ہوا اپنا سامان فروخت کر دیں اور برسر روزگار ہو جائیں لیکن ان کے اس جواز کو مسترد کر دیا گیا۔

برٹش کولمبیا میں رہنے والے ہندوستانی بھی جہاز کے مسافروں کو کینیڈا میں داخلہ دلانے کے لیے کوشاں رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اجلاس کئے قراردادیں منظور کیں اور حکام سے گفت و شنید کی لیکن ان تمام کوششوں کا نتیجہ صفر رہا۔ ساتھ ہی ساتھ وینکوور کے پنجابی باسیوں نے ان مسافروں کے لیے 60 ہزار ڈالر جمع کئے تاکہ بھائی گوردوت سنگھ جاپانی فرم کو 22 ہزار ڈالر کی قسط ادا کر سکیں۔ اس فنڈ کو پنجابی عوام نے قانونی چارہ جوئی کے لیے بھی استعمال کیا۔ وکلاء کے ذریعے مسافروں کی طرف سے عدالتوں میں مقدمات دائر کرائے اور ایک کمیٹی قائم کی جو ان کی گاہے بگاہے مدد کرتی تھی اس میں ان کے لیے اشیائے خورد و نوش بھی فراہم کی جاتی تھیں۔ اس فنڈ میں بھائی بھاگ سنگھ اور حسن رحیم نے 20 ہزار ڈالر اپنی جیب سے اکٹھے کئے اور جاپانی فرم کو ادا کئے اور 20 جون 1914ء کو جہاز کا چارٹر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ساتھ ہی انڈین نیشنل کانگریس اور پٹیالہ اور نابھہ کے راجاؤں کو خط لکھے گئے کہ وہ جہاز کے مسافروں

کے کینیڈا میں داخلے کے لیے برطانوی حکام پر زور ڈالیں۔ ان تمام کوششوں کا نتیجہ وہی صفر نکلا۔

برطانوی اخبارات نے اس واقعہ پر نسل پرستی کا مظاہرہ کیا لندن کے اخبار دی ٹائمز نے لکھا" مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ فرق اتنا ہی گہرا اور واضح ہے جیسے دو متوازی خطوط۔ دونوں کبھی ایک دوسرے سے نسلی اور معاشرتی طور پر مسابقت نہیں کر سکتے خواہ ہم کتنا ہی جھکجائیں دونوں میں جو خلیج حائل ہے اسے کبھی پاٹا نہیں جاسکتا۔"

اس کا ردعمل شدید ہوا امریکہ اور کینیڈا کے ہندوستانی تارکین کے لیے تو یہ کسی سانحہ سے کم نہ تھا جس کے بعد سامراج اور اس کی ریشہ دانیوں کے خلاف نفرت گہری ہوئی۔ "غدر" کا ایک خصوصی شمارہ اس جہاز کے حوالے سے شائع ہوا جس میں مضامین اور نظموں کے ذریعے سامراجی پالیسیوں اور حکام کی سنگدلی کی مذمت کی گئی ہندوستان میں بھی اس کا گہرا اثر ہوا۔ ہندوستانی آبادی پہلے بھی زیادہ کینیڈا اور امریکہ میں رہائش پذیر اپنے بہن بھائیوں کی حالت زار پر تشویش کا اظہار کرنے لگی۔ وزیر ہند، وائسرائے اور گورنر پنجاب کو احتجاجی تار ارسال کیے گئے اور لندن میں اینی بیسنٹ نے برطانوی اخبارات میں اس رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اس شور وغلغلہ کا اثر کینیڈا کے حکام نے بھی قبول کیا اور پہلی مرتبہ ہندوستانیوں کو اجازت دی کہ وہ جہاز میں موجود افراد کو خوراک بھجوا سکتے ہیں۔ ان کے سامان کو بھی چھوٹی کشتیوں کے ذریعے اتارنے کا عمل شروع ہوا لیکن اس کے باوجود مسافروں کو اترنے کی اجازت نہ مل سکی۔

لیکن اس دوران بابا گوردت سنگھ نے جو امیگریشن حکام کے ساتھ روز روز کی دلیل بازی اور منت سماجت سے تنگ آچکے تھے اچانک واپسی کا فیصلہ کر لیا اور اس کے لیے 7 جولائی کی تاریخ مقرر کی۔ اس اچانک فیصلے نے مسافروں اور کینیڈا میں ان کے لیے کام کرنے والی کمیٹی کے ارکان کو سخت مایوس کیا کیونکہ وہ دیگر بہت سی قباحتوں کے علاوہ کرایہ کی مد میں 22 ہزار ڈالر ادا کر چکے تھے اس کے علاوہ مسافروں کے لیے ہانگ کانگ تک کھانے پینے اور دیگر اشیائے صرف کا بندوبست بھی کوئی آسان کام نہ تھا اسی دوران کینیڈا کے رکن پارلیمنٹ سر چارلس ٹپر نے جو ساحل پر آئے وزیر اعظم کو کہا کہ مسافروں کے لیے چار ہزار ڈالر کا بندوبست کریں۔ یہ تجویز اس شرط پر تسلیم کر لی گئی کہ جہاز فوری طور پر کینیڈا کے ساحل سے منزل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔

مسافروں نے بھی جو 43 روز تک ذہنی تناؤ اور مشکلات کا سامنا کرتے رہے تھے واپسی کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ انہیں اب بھی یقین تھا کہ شائد کسی روز وہ کینیڈا کی زمین پر قدم رکھنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ان کا ردعمل شدید تھا انہوں نے جہاز پر قبضہ کر لیا اور کپتان کو حراست میں لے لیا۔ یہ ایک طرح کی بغاوت تھی۔ مسافروں اور وینکوور کے ہندوستانیوں کو اور باتوں کے علاوہ افسوس

بھی تھا کہ اس قدر کٹھن جدوجہد کے بعد واپسی کا فیصلہ شکست تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ جہاز پر قبضہ کے بعد عملہ کو انجن میں ایندھن ڈالنے سے روک دیا گیا کیونکہ باغیوں کے رہنماؤں کو خوف تھا کہ جہاز کا عملہ ان کی بے خبری میں روانہ ہو جائے گا۔ کینیڈا کے حکام نے یوں ردعمل ظاہر کیا کہ انہوں نے خوراک اور تازہ پانی کی فراہمی بند کر دی اس کے نتیجے میں عورتوں اور بچوں سمیت مسافروں کو کئی روز تک بھوکا پیاسا رہنا پڑا اس کے ساتھ ہی حکام نے اقدام کرنے کا فیصلہ کیا۔ مسلح پولیس کے ایک بھاری دستے کو جہاز پر بھیجنے کا حکم جاری کیا گیا پولیس جہاز پر چڑھنے ہی والی تھی کہ مسافروں نے ان پر پتھر، کوئلہ اور بھاری آہنی آلات وغیرہ سے حملہ کر دیا اور پولیس پسپا ہو گئی۔ اس کے بعد فوجی ایکشن کا فیصلہ ہوا۔ رین بو نامی ایک اور جہاز کو کامگاٹا مارو کا محاصرہ کرنے کا حکم ہوا اس جہاز پر ڈیڑھ سو کے لگ بھگ فوجی پورے ساز و سامان اور توپوں کے ساتھ سوار تھے رین بو کے علاوہ ساحل پر بھی مسلح فوجیوں کی ایک بھاری نفری تعینات کر دی گئی۔ یہ ایک خوفناک منظر تھا جسے وینکوور کے شہری اپنے مکانوں اور کھڑکیوں اور چھتوں سے دیکھ رہے تھے۔ ہندوستانی تارکین وطن گوردواروں میں جمع ہونا شروع ہوئے ان اجتماعات میں عہد کیا گیا کہ اگر کامگاٹا مارو پر فوجی حملہ ہوا تو وہ وینکوور کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے اس کشیدگی نے نہ صرف کینیڈا بلکہ دنیا میں ہر جگہ برطانوی حکام میں تشویش کی لہر دوڑا دی یہ وہ دور تھا کہ جب برطانوی حکومت کو معلوم ہو چکا تھا کہ جرمنی جنگ کی تیاری کر رہا ہے ان حالات میں وہ اس جہاز پر حملہ کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے جس کے تقریباً تمام مسافروں کا تعلق پنجاب سے تھا وہ پنجاب جو سامراجی حکومت کا بازوئے شمشیر زن تھا اس حملہ کا لازمی نتیجہ پنجاب میں شدید بے چینی کی صورت میں نکلتا چنانچہ کینیڈا کے وزیر اعظم کی طرف سے وزیر زراعت مسٹر برڈ نے جہاز کے مسافروں کو واپسی پر آمادہ کر لیا اور اس کے بدلے بہت سی مراعات کا وعدہ کیا ان مراعات میں ان 22 ہزار ڈالروں کی ادائیگی بھی شامل تھی جس کا تقاضا جہاز کا نیا پٹے دار شدت سے کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ لنگر انداز ہونے سے اب تک کے تمام نقصان کی تلافی بھی کی گئی جو وینکوور میں رہائشی ہندوستانیوں کی کمیٹی نے برداشت کیا تھا حکومت نے جہاز پر جو اشیائے صرف فراہم کیں ان میں آٹا، دالیں، گھی، مرچ، مصالحے، نمک، سبزیاں، گھی، مکھن، چائے، دودھ، تیل، صابن، سرکہ، اچار، انڈے، تمباکو، سگریٹ اور مٹی کا تیل بھی شامل تھے اور یوں کامگاٹا مارو دو ماہ بعد 23 جولائی 1914ء کو وینکوور کی بندرگاہ سے واپسی کے سفر پر روانہ ہوا۔

اگرچہ جہاز کا قصہ تمام ہوا لیکن اس حوالے سے ہندوستانی تارکین وطن ہیں اور ہندوستان کے اندر بھی سامراجیوں کے ہاتھوں ذلت اور توہین کا ایک ایسا احساس پیدا ہوا جس نے ان میں غم و غصہ کا جذبہ اور بھی گہرا کر دیا انہیں اب اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ غلاموں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے اور نسلی امتیاز کی سرکاری پالیسی نے کس طرح انہیں ہر طرح کی محرومیوں میں جکڑ دیا تھا۔ کینیڈا کے

حکام کو تارکین وطن کے ان جذبات کا پورا احساس تھا انہیں شدید ردعمل کا خوف بھی تھا چنانچہ انہوں نے تارکین وطن کو دہشت زدہ کرنے کی ٹھانی کینیڈا کی نوکر شاہی نے اب ہندوستانیوں پر اکا دکا حملے کروانے کا منصوبہ تیار کیا تارکین وطن میں سے ہی انہیں ایجنٹ بھی مل گئے جن کے ذریعے وہ چیدہ چیدہ رہنماؤں کے قتل کرانے لگے ان ایجنٹوں میں بیلا سنگھ مرکزی کردار کے طور پر سامنے آیا وہ اور اس کے گروپ کے لوگ کینیڈا پولیس کے مخبر بن گئے اور انہیں پل پل کی خبریں فراہم کرنے لگے ان کی پشت پناہی پولیس افسر ولیم ہوپکنسن کر رہا تھا۔ 5 ستمبر 1915ء کو اس سلسلے کا سب سے خوفناک واقعہ پیش آیا۔ بیلا سنگھ نے اچانک سکھوں کے ایک اجتماع پر فائرنگ شروع کر دی یہ اجتماع ارجن سنگھ کی ایک حادثاتی موت کے بعد تعزیت کیلئے ایک جگہ ہو رہا تھا کہ ان پر فائرنگ شروع ہو گئی بیلا سنگھ دونوں ہاتھوں سے مجمع پر گولیاں چلا رہا تھا فائرنگ کے نتیجہ میں پنجاب کے گاؤں بھیکھی وِنڈ کا رام سنگھ شیخ دولت اور گاؤں ولال سنگھ کا بتن سنگھ ہلاک ہو گئے دو اور سکھ بری طرح زخمی ہوئے ان کے علاوہ دلیپ سنگھ اتم سنگھ نور پوری جوالا سنگھ شیخ دولت لابھ سنگھ دھکوں اور دو اور لوگوں کو بھی زخم آئے۔ عدالت میں بیلا سنگھ نے بتایا کہ اس نے اپنے دفاع میں فائرنگ کی کیونکہ پہلے اس پر گولی چلائی گئی۔ اس کا گواہ ہوپکنسن تھا وہ عدالت میں جانے کیلئے برآمدے میں موجود تھا کہ میوہ سنگھ نے اسے قتل کر دیا۔ یہ 21 اکتوبر 1914ء کا دن تھا۔ بیلا سنگھ تو عدم ثبوت کی بنا پر بری ہو گیا لیکن میوہ سنگھ کو سزائے موت سنائی گئی۔

پھانسی پانے کے بعد میوہ سنگھ دیو مالائی کردار کے طور پر ابھرا اور سکھ ہر برس اس کا شہیدی دن منانے لگے۔ اس نے عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا "میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ ہوپکنسن سے میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی وہ میری قوم کا مجرم تھا وہ میری برادری کا مجرم تھا اس کے ہاتھ میرے معصوم ہم وطنوں کے خون سے رنگے ہوئے تھے۔ ہوپکنسن درحقیقت اس ظلم و بربریت کا نمائندہ تھا جو میری قوم کے لوگوں کے خلاف روا رکھا جا رہا ہے۔ میں اسے مار کر اپنی جان کا نذرانہ پیش کر رہا ہوں تا کہ ہم لوگوں پر مظالم بند ہوں۔ ہمیں بھی انسان سمجھا جائے۔ میں نے ایک سچے سکھ کا کردار ادا کیا ہے ایسا کرتے وقت مجھے اپنے تمام گوروؤں کی قربانیاں یاد آئیں بھگوان میرے دل میں ہے اور میں نے اس کے نام پر گولی چلائی ہے۔ مجھے اپنی موت کا دکھ نہیں بلکہ خوشی ہے بالکل اسی طرح جیسے بھوکے بچے کو ماں کا دودھ پیتے وقت خوشی ہوتی ہے۔ میں جب پھانسی چڑھوں گا تو پھندے کا رسہ اپنے ہونٹوں سے چوموں گا کہ میرے بھگوان نے میرے گلے میں اپنی نعمتوں کی مالا ڈال دی ہے......"

اگرچہ کاماگاٹا مارو واپسی کے سفر پر روانہ ہو چکا تھا اس پر سوار مسافروں کی مشکلات میں کمی نہ آئی جب جہاز 16 اگست کو جاپان کی بندرگاہ یوکوہاما میں لنگر انداز ہوا تو وہاں گوردت سنگھ کو ایک تحریری حکم نامہ دیا گیا کہ مسافر جاپان ہی نہیں ہانگ کانگ میں بھی نہیں اتر سکیں گے۔ مسافروں کیلئے یہ ایک نیا مسئلہ

تھا کہ ان کے پاس ہانگ کانگ تک کا زادراہ تو تھا لیکن اس کے بعد انہیں کلکتہ تک خوراک اور پانی کی کمی لازمی طور پر واقع ہونا تھی۔ جاپان میں برطانوی سفیر نے جہاز پر مزید رسد پہنچانے کی تجویز پیش کی جسے جاپانیوں نے مسترد کردیا مگر جہاز کے بہت سے مسافروں کا خیال تھا کہ برطانوی سفیر نے دراصل ایسی کوئی درخواست حکومت جاپان کو پیش نہیں کی۔

جہاز کے ایک مسافر جواہر مل نے ایک مضمون میں جو لاہور سے لائل گزٹ میں شائع ہوا لکھا "جب سے ہم یوکوہاما پہنچے ہیں جہاز کا جاپانی مالک اور برطانوی قونصل جنرل ہمارے خلاف سازش کررہے ہیں۔ ہم پر بدترین ظلم کیا جارہا ہے۔ حتیٰ کہ کھانے پینے کی اشیاء تک کی فراہمی روک دی گئی ہے...... ہم سے ہر ایک سے کہا جارہا ہے کہ ہانگ کانگ میں اترنے کیلئے 50 ڈالر ادا کریں آیا کبھی پہلے بھی یہ رقم طلب کی گئی ہے۔ جہاز کے مالک پر دباؤ ڈالا گیا تو اس نے حقیقت بیان کردی اس نے کہا کہ ہانگ کانگ کی برطانوی حکومت وہاں مقیم سکھوں سے بے حد خائف ہے کہ جب وہ جہاز پر سوار اپنے ہم وطنوں کو غلاموں کی سی حالت میں قید تنہائی میں دیکھیں گے تو ان کا ردِ عمل شدید ہوگا......"

ایک اور روایت کے مطابق غدر پارٹی کے رہنماؤں پرنام سنگھ کھوڑا اور بابا ہرنام سنگھ گوجرانوالہ نے جو جہاز کے مسافروں میں شامل تھے اور جنہوں نے ہانگ کانگ سے ان کے ساتھ سفر شروع کیا تھا اب اس واقع کو سیاسی اور انقلابی رخ دینا شروع کردیا۔ وہ وینکوور سے اپنے ساتھ آٹے کی بوریوں میں غدر پارٹی کی دستاویزات اور دیگر تحریریں لائے تھے۔ انہیں یہ لٹریچر مولوی برکت اللہ اور بھائی بھگوان سنگھ نے اس وقت فراہم کیا جب وہ وینکوور میں جہاز کے مسافروں سے ملنے آیا کرتے وہ انہیں ہندوستان میں انگریز حکومت کا تختہ الٹنے پر مائل کیا کرتے۔ غدر پارٹی کے صدر سوہن سنگھ بھکنا جہاز کے مسافروں سے ملنے یوکوہاما آئے اور انہیں ہندوستان میں مسلح انقلاب برپا کرنے پر قائل کرلیا۔ وہ مسافروں کیلئے 200 پستول اور بہت سا بارود بھی لائے یہ اسلحہ جاپان میں غدر پارٹی کے ارکان نے خفیہ طور پر جہاز پر پہنچایا۔ بھائی سوہن سنگھ بھکنا یوکوہاما سے جہاز پر سوار ہوئے ان کا ارادہ ہندوستان جانے کا تھا۔ کوبے کی بندرگاہ میں مسافروں نے برٹش کونسل کے دفتر کے سامنے مظاہرہ کیا اور کلکتہ تک اشیائے خورد و نوش فراہم کرنے کا مطالبہ کیا یہ مطالبہ مان لیا گیا لیکن اس شرط پر کہ جہاز اب کلکتہ کے بجائے مدراس جائے گا۔ تاہم بعد میں شرط ختم کردی گئی۔

کاماگاٹا مارو پر اسلحہ کے ڈھیر اور "باغیانہ" لٹریچر موجود تھا اس دوران پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور پوری دنیا میں برطانوی مفادات کے نگران معمولی شورش بھی برداشت نہیں کررہے تھے تمام تنصیبات کی کڑی نگرانی شروع ہو چکی تھی اور بحری جہازوں کی تلاشی میں معمولی غفلت بھی برداشت نہیں

کی جاری تھی ان حالات میں جہاز کے مسافروں نے سنگاپور پہنچنے سے پہلے ہی تمام اسلحہ اور تحریریں سمندر میں غرق کر دیں۔ جب جہاز 29 ستمبر کو کلکتہ کی بج بج کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا تو اس کی کڑی تلاشی لی گئی لیکن حکام کو اس میں سے کچھ بھی نہ ملا۔ اس کے بعد جہاز کو کلکتہ روانگی کی اجازت ملی۔ جہاز کا ایک مسافر ڈاکٹر رگھوناتھ سنگھ تھا یہ در حقیقت برطانوی حکومت کا مخبر تھا اس نے بعد میں بتایا کہ جہاز کے اکثر مسافر بابا گوروودت سنگھ کے خلاف ہو گئے تھے وہ اسے اپنے تمام مصائب کا ذمہ دار ٹھہراتے۔ کئی ایسے بھی تھے جو اس کی وفاداری پر شک کرتے تھے بہت ہی کم مسافر ایسے تھے جو بابا گوردت سنگھ کے حامی رہ گئے تھے۔

جہاز جب کلکتہ میں لنگر انداز ہوا تو حکام کی خواہش تھی کہ تمام مسافروں کو اگلی گاڑی میں سوار کرا کے پنجاب بھیج دیا جائے لیکن مسافر چاہتے تھے کہ اپنے گرنتھ صاحب کو کسی گوردوارے میں رکھ دیں ان میں کئی خریداری بھی کرنا چاہتے تھے پولیس ان میں صرف 59 مسافروں کو جن میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی تھی گاڑی میں سوار کرانے میں کامیاب ہو سکی باقی لوگوں نے پولیس کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ پولیس نے کلکتہ میں حکام کو صورت حال سے مطلع کر دیا تو فوج کے ایک دستے اور برطانوی پولیس کے 30 افراد کو شہر میں داخلہ کے راستے پر تعینات کر دیا گیا انہوں نے جلوس کی صورت میں مسافروں کو شہر میں داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی اور ان کو گھیرے میں لے لیا اس پر فساد ہو گیا۔ مسافر مصر تھے کہ وہ گرنتھ صاحب کو گوردوارے میں رکھنے کے بعد سوچیں گے کہ اب انہیں کیا کرنا ہے۔ اس کشمکش میں تیزی آئی تو پولیس اور فوج نے مسافروں پر گولی چلا دی جس کے نتیجے میں 18 افراد ہلاک اور 25 زخمی ہو گئے۔ مسافروں نے پولیس والوں سے اسلحہ چھین کر فائرنگ شروع کر دی۔ منشا سنگھ کی گولی سے کلکتہ کا سپرنٹنڈنٹ پولیس ایسٹ وڈ ہلاک ہو گیا۔ اس کے علاوہ دو اور پولیس والے بھی ہلاک ہوئے اور چھ انگریز فوجی اور پولیس والے زخمی ہوئے۔ پنجاب پولیس کے دو ایسے افراد بھی ہلاک ہوئے جن کا تعلق پنجاب سے تھا۔ زخمی پولیس والوں کو ہسپتال پہنچا دیا گیا لیکن زخمی ہونے والے مسافروں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ان میں سے ایک کا نام منگل سنگھ تھا جسے قریب ہی ایستادہ ایک ایسے کھمبے کے ساتھ پھانسی دے دی گئی جس پر سر شام چراغ جلایا جاتا تھا۔ مسافروں نے زخمی اور نہتے ہونے کے باوجود جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا۔ ان میں سے 60 مسافر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے انہوں نے راتوں رات دریائے ہگلی عبور کیا اور ہاوڑہ، مدنا پور، ہگلی اور بنکورہ کی طرف فرار ہو گئے۔ 17 مسافروں کو گرفتار کیا گیا۔ لگ بھگ 10 مسافروں کا ایک گروپ ایسا بھی تھا جو دریا عبور کر کے خفیہ ٹھکانوں پر چھپ گیا۔ یہ مسافر دن میں چھپے رہتے اور رات کو سفر کرتے۔ اس طرح وہ بنکورہ پہنچے جہاں انہیں حراست میں لے لیا گیا۔ حکام نے ان افسوسناک واقعات کی جو رپورٹ تیار کی اس کے مطابق 321 میں سے 203 مسافروں کو گرفتار کر کے علی

پور جیل میں ڈال دیا گیا۔ان کے علاوہ نو مسافر کلکتہ کے میڈیکل ہسپتال میں زخمی حالت میں لائے گئے۔ 32 فرار ہونے میں کامیاب ہوئے اور 19 پولیس اور فوج کی گولیوں سے ہلاک ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد 31 کے علاوہ باقی تمام قیدیوں کو علی پور جیل اور ہسپتال سے رہا کر دیا گیا۔

کلکتہ کی بج بج بندرگاہ پر فائرنگ اور اس کے نتیجے میں ہونے والے دلخراش واقعات کی تحقیقات کے لیے حکومت نے ایک کمیشن تشکیل دیا جس کے سربراہ سر ولیم ونسنٹ تھے۔اس کے ارکان میں انڈین سول سروس کے مسٹر واسلے اور مسٹر فاگان شامل تھے۔ ہندوستانیوں کی طرف سے سر بجوئے چاند کو مقرر کیا گیا جو بردوان کے مہاراجہ تھے اور جو ہندوستانی قوم پرستوں کے خلاف اپنی نفرت کی وجہ سے بدنام تھے دوسرے ہندوستانی رکن راجہ دلجیت سنگھ تھے جن کو اپنی "خدمات" کے عوض بعد میں سر کا خطاب دیا گیا۔اس کمیشن سے جو پہلے ہی ہندوستانیوں کے خلاف تعصب رکھتا تھا انصاف کی توقع کیسے کی جا سکتی تھی۔ وہی ہوا کہ اس نے سارا الزام ہندوستانی مسافروں پر رکھ دیا اور برطانوی فوجیوں اور پولیس کو بے قصور قرار دے دیا۔

کاماگاٹا مارو کا واقعہ برطانوی حکام کی سنگدلی اور کینیڈا کی حکومت کی نسل پرست پالیسی کا شاہکار تھا۔ اگرچہ مسافروں کو بھی مکمل طور پر بری الزمہ قرار نہیں دیا جا سکتا خصوصاً ان کا کلکتہ میں داخل ہونے پر اصرار بلا جواز تھا البتہ اسے پورے سفر کے دوران ذہنی پریشانی حکومت کے نفرت آمیز اور نسلی رویے اور دیگر مسائل و مشکلات کے خلاف ردعمل ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس جہاز کے مسافروں کے ساتھ ہانگ کانگ سے روانگی وینکوور میں آمد اور واپسی کے سفر کے دوران ہوا جیسے بھی حالات پیش آئے اس کا اندرون اور بیرون ملک شدید ردعمل ہوا لیکن ملک کی سب سے بڑی اور نمائندہ جماعت انڈین نیشنل کانگریس نے مکمل خاموشی اختیار کیے رکھی اس اہم مسئلہ پر جو دنیا بھر کی قوموں کی توجہ کا مرکز بنا رہا کانگریس نے کوئی پوزیشن اختیار نہ کی شائد اس لیے کہ وہ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی حکومت کا ساتھ دے رہی تھی یا اپنی موقع پرستی کے باعث خاموش تھی۔ صرف لالہ لاجپت رائے نے ذاتی حیثیت میں کہا انگریز نے ایک مرتبہ پھر نازک حالات میں بیوقوفی کا مظاہرہ کیا ہے۔

البتہ تلک نے اپنے اخبار کیسری میں اس واقعہ کے خلاف ایک خودمختار اور غیر جانبدار تحقیقات کا مطالبہ کیا اور لکھا "ہم نہیں سمجھتے کہ جہاز کے مسافر جو شروع سے آخر تک قانونی جنگ لڑتے رہے اور قانون کے اندر رہ کر اپنے جائز مطالبات منوانے کیلئے کوشاں رہے بغیر کسی جواز کے فساد کھڑا کر سکتے ہیں" ایک اور اخبار انڈین سوشل ریفارمر نے خیال ظاہر کیا کہ تمام تر واقعات اس لیے پیش آئے کہ برطانوی حکام نے انصاف اور قانون کی پاسداری نہیں کی اور جہاز کے مسافروں کو اپنے تعصب کی بھینٹ چڑھا دیا

اور اس کا نتیجہ کلکتہ کے فساد اور کشت وخون کی صورت میں نکلا۔ ایک اور اخبار گجراتی نے لکھا کہ ہندوستان کے عوام جہاز کے واقعات کے بارے میں صرف پنجابی مسافروں کا نکتہ نظر جاننا چاہتے ہیں۔ پنجاب کے اخبارات کو البتہ حکومت کی طرف سے سخت وارننگ تھی وہ ان واقعات کی جذباتی رپورٹنگ اور اشتعال انگیز مضامین اور اداریوں کا سلسلہ بند کریں اس دوران اخبار شیر پنجاب کے خلاف سخت اقدام بھی کیا گیا اس کا پریس سربمہر کردیا گیا کیونکہ حکومت اس کے مدیر کو "بدترین مخالف" سمجھتی تھی۔

ان تمام واقعات کا اگر جائزہ لیا جائے تو غدر پارٹی کی سیاسی ناپختگی بھی ظاہر ہوتی ہے جہاز کا واقع تو اس سے براہ راست متعلق نہیں تھا البتہ اس نے کینیڈا میں برطانوی حکام کو سخت دھچکا پہنچایا خصوصاً جنگ عظیم اول کے آغاز میں تو وہ کسی بھی طور پر وہاں مقیم ہندوستانی تارکین وطن کی ہمدردیاں حاصل نہیں کر سکی انہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے موقف کی بھی سخت مخالفت کی اور اس کے رہنماؤں کی اپیلوں کے باوجود اپنے موقف میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کی۔

لیکن غدر پارٹی بجائے خود کیا تھی اس کی قوت کیا تھی آیا کینیڈا امریکہ اور جنوب مشرقی افریقہ کے ہندوستانی اس قدر پختہ سیاسی نظریات کے حامل تھے کہ انہیں سامراج مخالف کسی جدوجہد میں آنکھ بند کر کے انقلابی سپاہیوں کی طرح استعمال کیا جا سکتا۔ پارٹی نے جس چھاپہ مار جنگ کا منصوبہ بنایا تھا اور اس کی پوری حکمت عملی بھی تیار کر لی تھی آیا وہ اس کے لیے پوری طرح تیار تھی آیا اس کی صفوں میں ایسے لوگ موجود تھے جنہیں چھاپہ مار جنگ کی تربیت حاصل تھی آیا پارٹی نے کشمیر اور سرحدی صوبہ میں جہاں سے چھاپہ مار جنگ کا آغاز کیا جانا تھا لوگوں سے رابطہ کے لیے کوئی سیاسی کام کیا آیا فوج میں اپنے ہمدرد پیدا کیے پنجابی فوجیوں کے ساتھ کوئی تعلق قائم کیا ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے تو کیا غدر پارٹی کا پورا منصوبہ ایک طرح کی مہم جوئی نہیں تھی۔ پھر بھی غدر پارٹی نے جنگ عظیم اول سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور فیصلہ کیا کہ برطانوی مفادات کو نشانہ بنایا جائے۔ جنگ شروع ہونے کے فوراً بعد پارٹی نے یوگنتر آشرم میں تارکین وطن اور کارکنوں کا ایک اجلاس منعقد کیا تقریباً پانچ روز منصوبہ اور حکمت عملی پر بحث ہوتی رہی اسی دوران صرف ایک بات ابھر کر سامنے آئی کہ اجلاس کے شرکاء اس بات پر متفق تھے کہ پارٹی کے پاس اس قدر فوجی ساز وسامان اور پیسہ نہیں جتنا ایک چھاپہ مار جنگ کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ انہیں یہ بھی احساس تھا کہ اس لڑائی میں ان کا سامنا صرف برطانوی سامراج نہیں بلکہ ان کے حلیف بھی ہوں گے اور انڈین نیشنل کانگریس بھی ان میں شامل تھی۔ ہندوستان میں بھی بنگال کے علاوہ کسی اور صوبے میں کوئی پختہ سیاسی اور انقلابی تحریک موجود نہ تھی دوسرے صوبوں کے لوگ تو تنظیمی سطح پر اور انفرادی حیثیت میں برطانوی حکومت کو مالی اور مادی مدد دے رہے تھے اور پنجاب اور سرحدی صوبہ تو ان کی فوجوں کے

لیے ٹھوس افرادی قوت فراہم کر رہے تھے غدر پارٹی کو پھر بھی ایک مبہم سا احساس تھا کہ جب بھی برطانوی سامراج کے خلاف ہندوستان میں جنگ چھڑی تو ہندوستانی عوام سامراج کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے کیونکہ انہیں وطن سے محبت ہے اور اس کے لیے وہ جان بھی دے سکتے ہیں۔ پارٹی کو فیصلہ یہ کرنا تھا کہ آیا اب کاری وار کرنے کی حکمت عملی بنانا چاہیے یا کسی اور موقع کی تلاش کرنا چاہیے لیکن ہر سطح پر اپنی کم مائیگی کے باوجود پارٹی نے مرنے یا مارنے کا فیصلہ کر لیا ان کے سیاسی نظریات نے انہیں یہ پختہ عزم فراہم کیا کہ اگر وہ شکست بھی کھا گئے تو یہ ان کی فتح ہو گی۔

یہ وہ صورتحال تھی جس میں غدر پارٹی نے پہلی جنگ عظیم کے دوران برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کا طبل بجا دیا اور اپنے کارکنوں کو ہندوستان جانے کی تلقین کی ان کارکنوں کو دو کام کرنا تھے ایک تو پنجاب کے دیہات میں جا کر وہاں کے عوام کو غیر ملکی تسلط اور نسل در نسل غلامی کے خلاف ذہنی طور پر صف آرا کرنا اور دوسرا فوج میں ایسی بغاوت پیدا کرنا کہ پنجابی فوجی سامراج کے خلاف اٹھ کھڑا ہو۔ غدر کے 5 اگست 1914ء کے شمارے میں برطانوی حکومت کے خلاف جو اعلان جنگ شائع ہوا اس میں لکھا تھا ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہم یورپی تسلط کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں...... ہتھیار اٹھا لیں انہیں موت کے گھاٹ اتار دیں اور اپنے وطن کو آزاد کرا لیں...... اب جبکہ جنگ جاری ہے آیا کوئی بھی ہندوستانی چین کی نیند سو سکتا ہے...... آپ ایک سپاہی ہیں دشمن کے خلاف صف بندی کر لیں...... جنگ شروع کر دیں...... آپ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں۔ منظم اور متحد ہو جائیں اور ایسی لڑائی لڑیں کہ موجودہ برطانوی راج جڑ سے اکھاڑ پھینکیں ہمیں وطن کو آزاد کرانا ہے ایک جمہوری سماج قائم کرنا ہے۔''

اس دوران سان فرانسسکو اور سکرامنٹو میں جو کانفرنسیں منعقد ہوئیں ان میں برطانوی حکومت کے خلاف جذبات عروج پر تھے۔ ان اجلاسوں میں ان لوگوں کے لیے فراخدلی سے چندہ اکٹھا ہوا جو ہندوستان جا کر جنگ شروع کرنا چاہتے تھے۔ ہزاروں نوجوانوں اور بڑی عمر کے لوگوں نے ''پارٹی کی فوج میں بھرتی'' کی درخواستیں دیں اور یہ فیصلہ بھی ہو گیا کہ ہندوستانی نومبر 1914ء تک ہندوستان پہنچ جائیں گے ہندوستان تک سفر کے لیے بحری جہازوں سے ٹکٹ دھڑا دھڑ فروخت ہونا شروع ہو گئے۔ پورٹ لینڈ (اوریگان) سے جو رپورٹ اس موقع پر برطانوی حکام کو ارسال کی گئی اس میں لکھا تھا کہ ہندوستانی عوام کا آج کل ایک ہی نعرہ ہے ''ہر ہندوستانی گھر جائے اور انقلاب کیلئے جنگ لڑے'' اس مسئلے میں آج کل تمام ریل گاڑیوں' بحری جہازوں وغیرہ پر بہت رش ہے سفر کرنے والوں کی بھاری اکثریت ہندوستانیوں کی ہے اور اگر اتنے وسیع پیمانے پر ہندوستانیوں کا انخلا جاری رہا تو شائد ہی کوئی ایسٹ انڈین ایسٹوریا میں رہے۔'' یہ وہ جذبہ تھا جو غدر پارٹی نے پیدا کیا۔ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ

کسی ملک کے تارکین وطن جذبہ حب الوطنی سے اس قدر سرشار ہوں اور ایک ایسی تحریک بنالیں جو جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ایک سنہری باب بن جائے ایسا ہی ایک انقلاب غدر پارٹی نے برپا کیا کہ وہ ہندوستانی جو دیار غیر میں پیسہ بنانے آئے تھے اور اپنے وطن کے مقابلے میں ایک بہتر زندگی گزار رہے تھے یک لخت اپنا سب کچھ تج کر وطن واپس پہنچے اور جان دینے کی ٹھان لی۔

+

باب:3

اعلانِ جنگ ــــ بہادری اور غداری کی داستان

زرعی اراضی کے حوالے سے بعض امتیازی قوانین کی واپسی اور اجیت سنگھ اور صوفی امبا پرشاد کے ملک سے فرار کے بعد پنجاب میں انقلابی تحریک وقتی طور پر ختم ہو گئی تھی لیکن جیسا کہ مزینی نے کہا ہے کہ انقلاب کسی وقتی جذبے کا مرہون منت نہیں نہ ہی ایسی کوئی تحریک کسی ایک واقع اور اس کے نتیجے میں ہونے والے صدمات کی وجہ سے رک سکتی ہے پنجاب میں شدید حکومتی دباؤ اور استبداد کے باوجود انقلابی سرگرمیاں جاری رہیں برطانوی حکومت کو اب بھی سیاسی سمندر کی پرسکون سطح کے نیچے انقلابی طلاطم محسوس ہوتا تھا حکام کے خوف کا یہ عالم تھا کہ جب سر مائیکل اڈوائر کو پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا گیا تو وائسرائے نے اسے نصیحت کی کہ ''......اب بھی بہت سا دھماکہ خیز مواد ادھر ادھر بکھرا پڑا ہے اگر تم کسی بڑے دھماکے سے بچنا چاہتے ہو تو اس بارود کو ٹھکانے لگانے میں احتیاط سے کام لینا۔''

پنجاب میں انقلابی سرگرمیاں از سرِ نو شروع کرنے کا سہرا بلاشبہ ہردیال کو جاتا ہے جو بیحد ذہین طالبعلم تھا وہ دہلی کا رہنے والا تھا اور لاہور اور دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ سرکاری وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے 1905ء میں آکسفورڈ چلا گیا لیکن 1907ء میں اس نے وظیفہ کی مزید رقم لینے سے انکار کر دیا اور اگلے ایک برس تک اپنے خرچ پر تعلیم حاصل کرتا رہا۔ مائیکل اڈوائر ہردیال کے بارے میں اپنی کتاب ''ہندوستان' جیسے میں نے اسے دیکھا'' میں لکھتا ہے کہ ''1907ء تک وہ مکمل انقلابی بن چکا تھا اور پھر اس نے اپنی بے پناہ ذہانت کو انقلابی کاموں کے لیے وقف کر دیا۔''

1908ء میں ہردیال انگلستان سے لاہور پہنچا تو اس نے کچھ عرصہ لالہ لاجپت رائے کے ساتھ گزارا۔ لیکن پھر یورپ چلا گیا اور جنیوا پہنچ کر ''بندے ماترم'' کے نام سے ایک رسالے کا اجرا کیا۔ پھر اس کی ملاقات

پیرس میں شیام جی کرشن ورما سے ہوئی۔

وہ 1910ء میں ہندوستان واپس آیا تو اس کی منزل پھر لاہور تھی اس مرتبہ وہ ایک جوشیلے نوجوان دینا ناتھ اور سینٹ سٹیفن کالج دہلی کے ساتھی امیر چند سے ملا جوان دنوں کیمبرج مشن ہائی سکول میں سینئر استاد تھے ان دونوں کے ساتھ ہر دیال نے پہلی مرتبہ برطانوی حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کے امکان پر بات چیت کی دراصل اس قسم کا مشورہ اسے پیرس میں شیام جی کرشن ورما نے دیا ہر دیال کا ارادہ یورپ میں ابھی مزید قیام کا تھا لیکن ورما کی بات اس کے دل کو یوں لگی کہ وہ الٹے پاؤں واپس آ گیا اس کے بعد بھی ہر دیال کو پھر ملک چھوڑنا پڑا اب اس کی منزل امریکہ تھی لیکن پنجاب میں اپنے مختصر قیام کے دوران اس نے سیاسی سطح پر اور مسلح جدوجہد کے حوالے سے جو کام کرنا تھا وہ مکمل ہو چکا تھا اس کی عدم موجودگی میں برطانوی حکومت کے خلاف سیاسی کام اور بغاوت کی سوچ کو آگے بڑھانے میں امیر چند نے بہت محنت کی۔ اس کا ایک ساتھی رش بہاری بوس تھا جس کا تعلق بنگال سے تھا اور جو دہرہ دون میں محکمہ جنگلات میں کلرک کی حیثیت میں ملازم تھا۔ رش بہاری نے امیر چند کے ساتھ سیاسی سطح پر کام کیا تو مسلح جدوجہد کے کام میں اس کے ساتھی دینا ناتھ۔ اودھ بہاری اور اس کا ذاتی ملازم بسنت کمار بسواس تھے یہ لوگ بنگال کے دہشت گرد گروپوں سے رابطہ میں تھے اور خفیہ طور پر ان کیلئے بم تیار کیا کرتے تھے۔ ایک مرحلے پر ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ حکام کو خوفزدہ کرنے کے لیے ایک ہی وقت میں کئی مقامات پر بموں کے دھماکے کرنا چاہئیں لیکن بعد میں اس ارادہ کو ختم کر کے ایک وقت میں ایک ہی جگہ دھماکہ کا فیصلہ کیا گیا۔

اس سلسلے کا پہلا دھماکہ دہلی کے چاندنی چوک میں اس وقت کیا گیا جب وائسرائے لارڈ ہارڈنگ کی سواری وہاں سے گزر رہی تھی یہ 23 دسمبر 1912ء کا دن تھا اس روز ایک سرکاری تقریب کے سلسلے میں ایک جلوس نکالا گیا وائسرائے بگھی پر سوار تھا کہ اس پر بم پھینکا گیا جو ایک دھماکہ کے ساتھ پھٹا اس حادثہ میں وائسرائے کا چوبدار جس نے برطانوی ریاست کا نشان اور چھاتہ اٹھا رکھا تھا موقع پر ہی ہلاک ہو گیا اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک چپراسی زخمی ہوا۔ بالکل اس طرح کا ایک بم دھماکہ مئی 1913ء میں لاہور کے لارنس باغ میں ہوا جہاں برطانوی حکام بڑی تعداد میں ایک تقریب میں شریک تھے اس دھماکے میں ایک چپراسی ہلاک ہوا۔ برطانوی حکام میں ان دھماکوں کی وجہ سے خوف کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن ان کی خفیہ پولیس ان عناصر کا سراغ لگانے میں ناکام رہی جن کا ان دھماکوں میں ہاتھ تھا۔ برطانوی سی آئی ڈی نے اگست 1913ء میں ان افراد کا سراغ اس وقت لگایا جب دینا ناتھ نے غداری کی اور پولیس کو سب کچھ بتا دیا اس کی نشاندہی پر اس گروپ کے تمام افراد کو گرفتار کر لیا گیا۔ ایک سیشن عدالت نے بسنت کمار بسواس کو عمر قید کی سزا سنائی اور بھائی بال مکند' امیر چند اور اودھ بہاری کو سزائے موت ہوئی

تاہم گورنر اڈوائر کی مداخلت پر بسنت کمار کو بھی پھانسی کا حکم سنایا گیا۔ پھانسی سے چند روز قبل بسنت کمار نے حکام کو بتایا کہ اس نے چاندنی چوک میں وائسرائے پر بم پھینکا تھا اس وقت وہ سیاہ برقع میں ملبوس پنجاب نیشنل بنک کے باہر کھڑا تھا۔ ان چاروں کو پھانسی پر چڑھا کر برطانوی حکومت نے پنجاب سے انقلابیوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔

لالہ لاجپت رائے نے ایک اخباری مضمون میں ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ”دھلی سازش کیس میں ملوث افراد کو بنگال میں اس قسم کے واقعات کے الزام میں گرفتار ہونے والے افراد سے زیادہ سخت سزا دی گئی۔ ان میں سے دو کو اس لیے پھانسی دی گئی کہ ان کا تعلق ایک خفیہ دہشت گرد تنظیم سے تھا اور وہ سازش میں شامل تھے لیکن ان کے خلاف اصل جرم میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت میسر نہیں۔ لالہ لاجپت رائے کے بقول ”پنجاب کی حکومت دیگر صوبوں میں برطانوی حکومتوں سے کہیں زیادہ سختی سے کام لے رہی ہے ہر طرح کی پر امن اور کھلی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی ہے سیاسی زندگی یوں زنجیروں میں جکڑ دی گئی ہے کہ اس سے دم گھٹنے کا احساس ہوتا ہے یہی وہ حالات ہیں جنھوں نے خفیہ سرگرمیوں اور دہشت گردی کو جنم دیا“ لیکن ان تمام تر سختیوں اور مائیکل اڈوائر کے اعلان کہ وہ ایسے ”دہشت گرد عناصر کو کچل دے گا“ کے باوجود انقلابی سرگرمیاں جاری رہیں بلکہ ان میں اس وقت مزید تیزی آ گئی جب غدر پارٹی کے لوگ امریکہ، کینیڈا اور مشرقی افریقہ کے ممالک سے واپس آئے۔

انقلابیوں کا پہلا گروپ اگست 1914ء میں سان فرانسسکو سے وطن واپسی کیلئے روانہ ہوا۔ بحری جہاز کے عرشہ پر ایک اجتماع کا اہتمام کیا گیا جس سے خطاب کرتے ہوئے رام چندر نے کہا ”آپ کو کیا فرائض انجام دینا ہیں اس میں اب کوئی ابہام نہیں رہا۔ ہندوستان جاؤ اور وہاں ملک کے کونے کونے میں بغاوت کا جھنڈا لہرا دو۔ امیروں سے دولت چھین لو غریبوں کے ساتھ ہمدردی سے پیش آؤ۔ اس طرح ہمیں اور ہمارے مقصد کو مقبولیت حاصل ہو گی۔ جب آپ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھیں گے آپ کو ہتھیار فراہم کر دیئے جائیں گے اور اگر کسی وجہ سے ہتھیاروں کی ترسیل میں تاخیر ہو گئی تو پولیس تھانوں پر حملہ کر کے وہاں سے ہتھیار چھین لو۔ اپنے رہنماؤں کے احکامات بلا تاخیر اور کسی چوں و چرا کے بغیر بجا لاؤ۔“ اس سفر میں جو کینٹن کی بندرگاہ سے شروع ہوا اور بھی مسافر جہاز پر چڑھے۔ کلکتہ پہنچنے پر انقلابیوں کو حسب وعدہ ہتھیار فراہم کر دیئے گئے ان مسلح افراد کا پہلا نشانہ پنجاب تھا۔ لیکن حکومت کو ان کے ارادوں کی خبر ہو گئی اس لیے ان سب افراد کو گرفتار کر لیا گیا ان میں جلوہ سنگھ بھی شامل تھا۔ لیکن متعدد افراد بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ پروگرام کے مطابق یہ آپس میں موگا کے قصبہ میں ملے۔ لیکن ان کے پاس ہتھیار نہیں تھے لہٰذا انہوں نے اپنے اپنے گاؤں جانے کا فیصلہ کیا اور وہ پھر آپس میں کبھی نہیں ملے۔

اس طرح کا پیغام جاپان میں بھائی سوہن سنگھ بھکنا کو پارٹی ہیڈ آفس کی طرف سے موصول

ہوا انہیں ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے کارکنوں کو لے کر جاپان سے فلپائن روانہ ہوں اور وہاں سے شنگھائی۔ کینٹن اور ہانگ کانگ ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچیں۔ پنڈت سوہن لال پاٹھک کو سیام اور برما کے راستے اور بھائی سنتو کھ سنگھ کو ملایا اور سنگاپور کے راستے ہندوستان پہنچنے کی ہدایات بھی ہیڈ آفس کی طرف سے جاری کی گئیں۔

بھائی سوہن سنگھ بھکنا کو جاپان اور کینٹن سے کچھ ہتھیار بھی مل گئے جنہیں انگریزی فوج کے ایک سکھ اردلی کی مدد سے جو کلکتہ کی جانب سفر کر رہا تھا ہندوستان پہنچایا گیا۔ لیکن اردلی جب یہ ہتھیار لے کر ملایا کی بندرگاہ پینانگ پہنچا تو اسے حکم ملا کہ وہ کلکتہ کی بجائے پیرس روانہ ہو جائے اس نے حکم کی بجا آوری کی لیکن اس کی وجہ سے ہتھیاروں کی ایک معقول کھیپ ہندوستان نہ پہنچ پائی۔ اب عملی صورتحال کچھ یوں تھی کہ امریکہ، کینیڈا، جاپان اور مشرق بعید کے ممالک میں غدر پارٹی کے تمام رہنماؤں اور کارکنوں کے جتھوں کے جتھے ہندوستان کی جانب روانہ ہو چکے تھے اور غدر پارٹی کے ہیڈ آفس سن فرانسسکو میں صرف رام چندر بعض پرانے کارکنوں کے ساتھ رہ گئے یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ بعض حوالوں میں سکھ اردلی کو ملنے والے احکامات کے بارے میں شبہات کا اظہار کیا گیا ہے سب سے معتبر روایت یہ ہے کہ اسے اس قسم کے کوئی احکامات موصول نہیں ہوئے اور اس نے وہ تمام ہتھیار چوری کر لیے اور راستہ میں ایک بندرگاہ پر اتر گیا اس کے بعد سکھ اردلی نے ان ہتھیاروں کا کیا کیا اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ملتیں لیکن اردلی کی اس چوری کا اعلانیہ اظہار خود سوہن سنگھ بھکنا نے کیا۔

ان ممالک سے جو بحری جہاز غدر پارٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کو لے کر ہندوستان روانہ ہوئے ان میں سب سے اہم جاپان کا توسا مارو تھا جس پر تین سو سے زائد انقلابی سوار تھے۔ یہ جہاز 29 اکتوبر کو جب کلکتہ کی بندگاہ میں لنگر انداز ہوا تو برطانوی فوج اور پولیس کی ایک بھاری نفری نے اسے گھیرے میں لے لیا ان کی سربراہی کلکتہ کا پولیس کمشنر کر رہا تھا اس نے اپنی اعانت کیلئے پنجاب اور بنگال کے متعدد افسروں کو بھی ساتھ رکھا ہوا تھا۔ پولیس کی ایک بھاری نفری کے علاوہ اس جہاز کا محاصرہ کرنے والوں میں ملٹری پولیس کے جوان گورکھا جنٹ اور برطانوی افسروں کا ایک دستہ بھی شامل تھا۔ سب سے پہلے جہاز سے چڑھنے والوں میں کمشنر کے اسسٹنٹ کمشنر مسٹر بائیڈ تھے انہوں نے اپنی مدد کے لیے پنجاب پولیس کے ایک انسپکٹر کی خدمات حاصل کر رکھی تھیں وہ انسپکٹر بھی جہاز پر چڑھا۔ کمشنر کے عملہ نے بیچ پارہ میں ہی مسافروں کے سامان کی تلاشی لے لی خصوصاً ان کے بھاری بکسوں کو خوب کھنگالا۔ چار سکھ مسافروں کے قبضہ سے باغیانہ تحریریں برآمد ہوئیں ان کو باقی مسافروں سے الگ کر کے خاموشی کے ساتھ ایک خصوصی ٹرین کے ذریعے پنجاب روانہ کر دیا گیا ان کو گارڈ کے ڈبے میں محصور کیا گیا اور جب وہ لاہور پہنچے تو پنجاب پولیس نے انہیں حراست میں لے لیا۔

ایک اور چھوٹے سے صندوق میں سے دو پستول چار ریوالور اور گورمکھی میں لکھی باغیانہ تحریریں برآمد ہوئیں یہ صندوق ڈاکٹر ونود بہاری کے کیبن سے برآمد ہوا۔ ڈاکٹر ونود بہاری کلکتہ کے رہنے والے تھے انہوں نے اس سامان سے لاتعلقی کا اظہار کیا اور شبہ ظاہر کیا کہ یہ غدر پارٹی کے لوگوں نے ان کے کیبن میں رکھ دیا تھا۔

خفیہ سرکاری رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام اس جہاز کے بارے میں خاص طور پر تشویش میں مبتلا تھے انہیں علم ہوا تھا کہ اس کے مسافر واپسی کے سفر کے دوران نازی جرمنوں سے ملے انہوں نے ان جرمنوں کو بتایا تھا کہ وہ ہندوستان واپسی پر بغاوت کا علم بلند کرنے اور شورش برپا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جن چار سکھ مسافروں کو خصوصی ٹرین کے ذریعے لاہور بھیجا گیا انہیں لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر کے حکم پر منٹگمری اور ملتان کی جیلوں میں ڈال دیا گیا حالانکہ صوبے کے انسپکٹر جنرل پولیس اور دوسرے انگریز افسروں نے انہیں جیل میں ڈالنے کی مخالفت کی تھی۔ مگر یہ لوگ صرف چار نہیں تھے ان کی تعداد ایک سو سے زائد تھی اور ان میں غدر پارٹی کے وہ لوگ بھی شامل تھے جو پہلے سے ہی حکومت کی حراست میں تھے اب جیلوں میں ان کی تعداد بڑھ کر تقریباً ڈیڑھ سو ہو گئی تھی۔

غدر پارٹی کے ان کارکنوں میں سے بعد ازاں 76 کو "کم خطرناک" قرار دے کر رہا کر دیا گیا لیکن جب باغیانہ سرگرمیاں نہ رکیں اور پنجاب میں بم دھماکوں، سرکاری املاک کے نقصان اور انگریز حکام کے قتل کا سلسلہ چلا تو ان میں سے چھ کو سزائے موت دے کر پھانسی پر لٹکا دیا گیا اگر ان "کم خطرناک" لوگوں میں سے چند کو پھانسی دی جا سکتی تھی تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غدر پارٹی کے دوسرے اور "زیادہ خطرناک" لوگوں کے بارے میں حکومت کیا رائے رکھتی تھی۔ چھ کو پھانسی پر لٹکایا گیا تو ان میں سے مزید 6 کو عمر قید اور 6 کو صوبہ بدری کا حکم سنایا گیا۔ بعد ازاں مزید جہاز غدر پارٹی کے کارکنوں اور رہنماؤں کو لے کر ہندوستان پہنچے۔ اسی دوران جاری ہونے والے ایک آرڈی نینس (انگرس آرڈی نینس) کے تحت ان لوگوں پر جہاز پر چڑھتے ہی نگرانی کا عمل جاری ہو جاتا۔ بعد ازاں ایک اور حکم کے تحت دیگر ممالک سے آنے والے پنجابی افراد کو لدھیانہ میں پولیس کے سنٹرل انکوائری آفس میں حاضری دینے اور اپنے کوائف درج کرانے کا پابند کیا گیا۔ ان کوائف کی چھان بین ہوتی جس کے لیے خصوصی پولیس اور مجسٹریٹ مقرر کیے گئے اس کے بعد ہی حکومت فیصلہ کرتی کہ آیا انہیں گرفتار کر لیا جائے اپنے گاؤں میں بھجوا کر باہر نکلنے پر پابندی عائد کر دی جائے یا پھر اسے وارننگ دے کر چھوڑ دیا جائے۔

غدر پارٹی کے جو رہنما اور کارکن ان دو برسوں میں واپس آئے ان کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار بتائی گئی ہے ان میں سے 400 کو جیل بھجوایا گیا اڑھائی ہزار کو ان کے دیہات میں پابند کر دیا گیا اور پانچ ہزار کو وارننگ کے بعد چھوڑ دیا گیا لیکن اس کے بعد بھی کئی برس ان کی نگرانی کا سلسلہ جاری رہا۔ غدر پارٹی

کے تمام بڑے بڑے عہدیداروں کو جن میں صدر بھائی سوہن سنگھ بھکنا' نائب صدر بھائی کیسر سنگھ ٹھٹگر ، بھائی جوالا سنگھ اور بھائی شیر سنگھ' بھائی ایشر سنگھ ماسٹر ادم سنگھ وغیرہ شامل تھے ہندوستان واپسی پر فوری طور پر گرفتار کر لیا گیا۔ جو فرار ہونے میں کامیاب ہوئے ان میں کرتار سنگھ سرابا' بھائی ندھان سنگھ چوغہ' ہرنام سنگھ ٹنڈی لت اور بھائی بھگت سنگھ کا نام لیا جاتا ہے۔ بعض ایسے بھی تھے جو کلکتہ سے لدھیانہ سفر کے دوران گاڑی سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گئے ان میں پر بھانند جھانسی' پنڈت جگت رام اور بھائی پرتھوی سنگھ نمایاں ہیں پولیس کی حراست سے فرار ہونے والوں میں بھائی گجر سنگھ بھکنا' بھائی پریم سنگھ' بھائی جگت سنگھ' بھائی جیون سنگھ' بھائی رحمت علی' بھائی حافظ عبداللہ اور بی بی گلاب کور شامل ہیں۔ پولیس ان میں اکثر لوگوں کو تلاش نہ کر سکی ان کی تلاش کا کام کئی برس بعد ختم ہو گیا۔

غدر پارٹی کے ان چوٹی کے رہنماؤں کی گرفتاری سے پارٹی کے تمام منصوبے خاک میں مل گئے کم از کم وہ ایک منظم تحریک شروع کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہے تھے اور نہ یہ برطانوی فوج میں پھوٹ ڈال کر پنجابی سپاہیوں کی بغاوت کی سکیم کو کامیاب بنا سکے۔ سر مائیکل اڈوائر اپنی یادداشت میں لکھتا ہے "یہ لوگ بے حد خطرناک تھے ان میں تخریب کاری کا رجحان نمایاں تھا ہم نے ان کی سازشوں کو اپنی حکمت عملی سے ناکام بنایا۔ میں یہ سوچ کر ہی کانپ اٹھتا ہوں اگر یہ سب گرفتار نہ ہوتے اور اپنی سکیم کے مطابق بغاوت برپا کر دیتے تو صوبے میں کیا نہیں ہوتا۔"

گرفتاریوں اور کڑی سزاؤں کے باعث ہی نہیں غدر پارٹی کے انقلابیوں کو ایک اور محاذ پر بھی سخت ہزیمت اٹھانا پڑی انہیں توقع تھی کہ ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب باغیانہ سرگرمیوں کیلئے بے حد سازگار ہوگا لیکن انہیں یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ اس صوبے کے لوگ عام طور پر اطمینان کی فضا میں سانس لے رہے ہیں ان کے لیے اجنبی حکومت ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ پنجاب کے نہری نظام اور زرعی انتظام کے لیے صوبائی اراضی کی تقسیم کی بدولت کسانوں کی مالی حالت خاصی بہتر ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ انڈین نیشنل کانگریس جو ملک کی سب سے بڑی اور موثر سیاسی تنظیم تھی جنگ عظیم اول میں انگریزی حکومت کا ساتھ دے رہی تھی پنجاب کے لوگ جوق در جوق انگریزی فوج میں بھرتی ہوئے یہاں کے بااثر سیاسی اور زمیندار طبقہ نے بھی انگریز کی مدد کی۔ خود مہاتما گاندھی نے ایک طبی مشن کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور چیف دیوان خالصہ نے کھلم کھلا انگریزی حکومت کے ساتھ وفاداری کا اعلان کیا۔ ان حالات میں جبکہ صوبے کی آبادی کی ایک بڑی اکثریت برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کر رہی تھی غدر پارٹی کے انقلابیوں کیلئے کام کرنا اور آبادی اور فوج میں پھوٹ ڈلوانا بے حد مشکل تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غدر پارٹی کی جڑیں عوام میں نہیں تھیں اس نے یہاں کوئی سیاسی کام نہیں کیا تھا اور ان کی سکیم ان حالات میں نہ صرف عوامی ہمدردی حاصل نہیں کر سکی لہٰذا اسے صرف ایسی مہم جوئی قرار دیا جا سکتا تھا

جس کا انجام تباہی اور بربادی تھا۔

ان حالات کے باوجود غدر پارٹی اپنے مقصد پر ڈٹی رہی جو لوگ قانون کے شکنجے سے بچ نکلے انہوں نے اپنی اس سکیم کو ایک مضبوط ارادے سے عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جس کے خدوخال سان فرانسسکو میں طے کیئے گئے تھے اور جس کا اعادہ جہاز تو سامارو میں کیا گیا۔ اس سکیم کے چیدہ چیدہ نکات درج ذیل ہیں۔

☆ پنجاب کے دیہات میں پھیل جانا کسانوں کے ساتھ کام کرنا اور انہیں سامراج کے خلاف جدوجہد کے لیے تیار کرنا۔

☆ برطانوی فوج میں پھوٹ ڈالنا اور ہندوستانی فوجیوں میں یہ تحریک پیدا کرنا کہ وہ وطن کی آزادی کے حصول سے قبل غیر ملک جاکر کسی اور کی جنگ نہیں لڑیں گے۔

☆ ہتھیار حاصل کرنا۔

☆ عوام میں غدر پارٹی کی تحریریں پمفلٹوں کی شکل میں تقسیم کرنا جن میں حکومتی کارکردگی کو نشانہ بنایا گیا ہو۔

☆ ہندوستان کے اندر اور باہر سامراج دشمن طاقتوں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا اور ان کے ساتھ اظہار یک جہتی کرنا۔

☆ انگریزی فوج کی جرمنی اور ترکی کے ہاتھوں شکست کی صورت میں ہندوستان کے اندر برطانوی مفادات خصوصاً عسکری اہمیت کے ٹھکانوں کو نشانہ بنانا۔

☆ اپنے مالی وسائل مضبوط بنانے کے لیے ڈکیتیوں کا ارتکاب کرنا۔

☆ بم بنانا اور انہیں مناسب مواقع اور مقامات پر استعمال کرنا۔

☆ ریلوے اور تار کے نظام کو تباہ کرنا۔

☆ نوجوان لوگوں کو غدر پارٹی میں شامل کر کے انہیں انقلابی سرگرمیوں کے لیے تیار کرنا۔

☆ پولیس تھانوں اور سرکاری خزانوں کو لوٹنا اور وہاں سے اسلحہ اور پیسہ حاصل کرنا۔

یہ اس سکیم کی جزئیات تھیں جو پنجاب کے معروضی حالات کا جائزہ لیے بغیر تیار کی گئی تھی یہ سب کچھ اس صوبے کے لیے کیا جارہا تھا جس کی اکثر آبادی اپنی کھال میں مست تھی اس صورت میں سوائے اس کے اور کچھ نہیں کیا جاسکتا کہ یا تو غدر پارٹی کے لوگ خوش فہمی میں مبتلا تھے یا پاگل تھے اور یا پھر ایسے دیوانے تھے جو وطن کی آزادی کے لیے ہر آگ میں کودنے کو تیار تھے آخری بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے کیونکہ اس پارٹی کے لوگوں نے جو قربانیاں دیں ان کی مثال جدوجہد آزادی کی تاریخ میں نہیں ملتی وہ بھی ان حالات میں کہ وہ امریکہ، کینیڈا اور دیگر ممالک میں خوب پیسہ کمارہے تھے اور ان کی ذاتی زندگی

خوش حالی سے عبارت تھی۔

ان ممالک سے ہندوستان آنے والے غدر پارٹی کے رہنماؤں کا پہلا کام عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنا انہیں آزادی اور غلامی میں فرق سمجھانا اور انہیں جدوجہد کے لیے تیار کرنا تھا چنانچہ انہوں نے ہندوستان میں سب سے پہلے اپنے نظریہ کے حامی لوگوں کو اکٹھا کیا اور پارٹی کی تنظیم کا کام شروع کیا۔ کرتار سنگھ سرابا نے جو پارٹی کے جوشیلے لوگوں میں سے تھے اور انقلاب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا اس کام کا آغاز کیا انہوں نے بھائی ندھان سنگھ کی معیت میں سب سے پہلے امرتسر کے قصبہ موگا اور لدھیانہ کے گاؤں کھنہ میں اجلاس شروع کیے جن میں مقامی لوگ بھاری تعداد میں شریک ہوتے دونوں رہنما ان اجلاسوں میں اپنے ہم وطنوں کو بتایا کرتے کہ غیر ملکی حکمران ان کا معاشی استحصال کر رہے ہیں سماجی طور پر انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے غیر ممالک میں بھی ان کی توہین کی جاتی ہے کیونکہ وہ کسی آزاد قوم کے باشندے نہیں وہ انہیں بتاتے کہ کس طرح ایک آزاد معاشرے اور جمہوری ملک میں وہ کس طرح عزت و وقار کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں وہ عوام کو غلامی کی زنجیریں توڑنے اور مادر وطن کو غیروں کی حکمرانی سے آزاد کرانے کیلئے جدوجہد کے لیے کمربستہ ہو جانے کی تلقین کرتے وہ لوگوں سے یہ بھی کہتے کہ وہ برطانوی فوج میں ملازم اپنے رشتہ داروں تک غدر پارٹی کا پیغام پہنچائیں اور انہیں انقلاب برپا کرنے پر آمادہ کریں۔

یہی جذبہ اور مقصد کے لیے غدر پاری کے کئی سرگرم رکن اور حامی فوج میں ملازم ہو گئے وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر ہندوستانی فوجیوں کو خفیہ اجلاس میں شریک کرتے ان کی سیاسی تربیت کرتے اور اپنی انقلاب کے لیے کام کرنے اور وطن کی آزادی کے لیے انقلاب برپا کرنے کی تلقین کرتے تاکہ برطانوی سامراج کا تختہ الٹایا جا سکے۔ اس کے لیے وہ ہندوستانی فوجیوں کی چھاؤنیوں میں جاتے۔

بھائی پریم سنگھ لاہور کی میاں میر کی چھاؤنی میں اس کام پر کمربستہ تھے تو ہردے رام جالندھر کی چھاؤنی میں یہی کام کر رہے تھے۔ وشنو پر نگلے کو ان فرائض کی انجام دہی کے لیے میرٹھ کی چھاؤنی میں تعینات کیا گیا اور بھائی کرتار سنگھ سرابا اس قسم کے سب رضا کاروں کے ساتھ امبالہ میرٹھ' کانپور' آگرہ' الہ آباد' بنارس' دنیا پور اور لکھنؤ کی فوجی چھاؤنیوں کے ساتھ رابطہ میں تھے وہ ان کے کلام کو باہم مربوط بناتے ان کے پاس ان تمام چھاؤنیوں کے اندر ہونے والی سرگرمیوں کی رپورٹیں پہنچتیں وہ ان کا مطالعہ کرنے اور جائزہ لینے کے بعد مناسب احکامات جاری کر کے بعد ازاں فیروز پور چھاؤنی میں خود بھی ایسا ہی کام کرتے۔

اس دوران فیصلہ ہوا کہ پارٹی کے کام کو آگے بڑھانے کے لیے ڈکیتیوں کا سلسلہ شروع کیا جائے تاکہ مالی استحکام حاصل ہو ساتھ ہی پولیس تھانوں پر حملہ کر کے ہتھیار حاصل کرنے کا منصوبہ بھی تیار

ہو گیا۔ سیاسی آگہی کے لیے جن نوجوانوں نے دیہات کے دورے کیے انہیں وہاں خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی بعض دیہات میں تو لوگ ان کی بات تک سننے کو تیار نہیں تھے اکثر یہ سننے میں آیا کہ فلاں گاؤں کے لوگوں نے غدر پارٹی کے کارکنوں کو مار بھگایا ہے۔ یعنی کسانوں کے محاذ پر ان کی کوشش رائیگاں جاتی نظر آئی۔ لیکن بعض مقامات سے ان کے لیے حوصلہ افزا خبریں بھی موصول ہوئیں خصوصاً میاں میر اور فیروز پور کی فوجی چھاؤنیوں سے جو بعد میں پارٹی کی سرگرمیوں کا مرکز بنیں۔

ان سرگرمیوں کے تیز ہونے کی وجہ سے یہ تھی کہ جنگ عظیم اول کے دوران یورپ کے مختلف محاذوں پر ہندوستانی سپاہیوں کا جانی نقصان برطانوی فوجیوں سے کہیں زیادہ ہوا تھا اور یہ بات ہندوستانیوں کے دلوں پر ایک برا اثر چھوڑنے لگی اس کے علاوہ ہندوستان میں تعینات برطانوی فوجی بھاری تعداد میں باہر کے محاذوں پر بھیجے گئے ان کی عدم موجودگی کے باعث انگریزی حکومت عسکری طور پر کمزور ہوئی یہ وہ صورت حال تھی جس سے غدر پارٹی کے کارکن زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

اس سلسلے میں جب غدر پارٹی کی تنظیم نے کچھ زور پکڑا تو انہوں نے اندرون ملک دوسرے انقلابیوں سے وسیع پیمانے پر رابطہ قائم کیا اس دوران اس قسم کا تاثر بھی عام ہوا کہ انگریزی حکومت کمزور پڑ رہی ہے اس کے علاوہ پنجاب سے کرتار سنگھ سرابا مسلسل دوسرے رہنماؤں کے ساتھ رابطہ میں رہا ان کی اطلاعات کی بنا پر سچن سانیال' وشنو پر نگلے اور پنڈت پرمانند جھانسی جنوری 1915ء میں لاہور پہنچے انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان اور جنوب مشرقی ایشیا میں تعینات ہندوستانی فوجیوں کے دلوں میں ایک ہی وقت میں بغاوت کا شعلہ پیدا کیا جائے ان کا خیال تھا کہ ہندوستانی فوجیوں کی بغاوت سے عوام بھی جدوجہد کے میدان میں نکل آئیں گے اگر اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں تو ہندوستان کے بعض حصوں میں ایک انقلابی حکومت کا قیام ممکن ہوگا اور اس حکومت کو سامراج دشمن ممالک خصوصاً افغانستان اور جرمنی تسلیم بھی کر لیں گے۔

اس عمل میں غدر پارٹی کے لیے جو مسئلہ پیدا ہوا وہ مالی تھا سان فرانسسکو اور جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک میں انہیں فنڈز کی کمی کا احساس نہیں ہوا اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ جن ہتھیاروں اور مالی وسائل کا ان سے وعدہ کیا گیا تھا وہ انہیں مہیا نہیں کیے گئے ایک تو برطانوی حکومت کی سختی اور کڑی نگرانی کے باعث ایسا نہ ہوا اور دوسرے اس بنا پر کہ امریکہ میں پارٹی کے ہیڈکوارٹر میں رام چندر نے اس معاملے میں دلچسپی نہیں لی بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا۔ ان حالات میں غیر ممالک سے آنے والے ہندوستانی انقلابیوں نے دوسرے ذرائع سے وسائل پیدا کرنے کا فیصلہ کیا اور اس فیصلہ کا اہم ترین جزو ڈکیتیوں کے ذریعے روپیہ پیسہ جمع کرنا تھا دسمبر 1914ء اور فروری 1915ء کے درمیانی عرصہ میں جالندھر کے قصبوں کرنا ما اور پھر فیروز پور' ہوشیار پور اور جالندھر شہر' منتگری' گورداسپور کے گاؤں شری

ہرگوبند پور، کپورتھلہ ریاست کے ایک شہر میں ایک ہندو ساہوکار کی دکان لدھیانہ کے قصبہ ساہنیوال کے جوہری کی دکان، ریاست ملیر کوٹلہ میں جھمیر کے ایک سود خور ہندو، امرتسر کے قصبہ چمبہ کے ایک گھر اور لدھیانہ کے قصبہ اونچی ربن میں 6 ڈکیتیاں ہوئیں جن میں لاکھوں روپے اور زیورات لوٹے گئے ان سب کا الزام غدر پارٹی کے کارکنوں پر عائد کیا جاتا ہے۔

ان ڈکیتیوں سے حاصل ہونے والے روپے اور پولیس تھانوں سے لوٹے گئے اسلحہ نے پارٹی کو ایک نئی طاقت عطا کی وہ اب فوج کے اندر بغاوت پیدا کرنے کے کام کو آسان سمجھنے لگ گئے تھے۔

انہیں حالات میں رش بہاری بوس نے 21 فروری 1915ء کو عملی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا منصوبہ یہ تھا کہ سب سے پہلے لاہور کی 23 ویں کیولری اپنے اسلحہ سمیت یونٹ کو چھوڑ جائے گی اس کے فوراً بعد تمام چھاؤنیوں میں یہی عمل دہرایا جانا تھا ان ہندوستانی فوجیوں سے یہ توقع رکھی گئی تھی کہ وہ اپنے انگریز افسروں کو گرفتار یا قتل کر دیں گے اور بھاری مقدار میں رائفلیں، گولیاں اور دوسرا بارود قبضہ میں لے لیں گے۔ اسی دوران پارٹی کے کارکن ٹیلیفون اور تار کی لائنیں کاٹ دیں گے۔ ریل کی پٹڑی اکھاڑ دیں گے اور پنجاب میں تقریباً ایک سو ریل گاڑیوں کو پٹڑی سے اتارنے کے بعد لوٹ لیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انگریز فوجیوں اور دوسرے افسروں اور شہریوں کو حراست میں لینا۔ سرکاری خزانے لوٹنا، جیلوں سے ہندوستانی قیدیوں کو رہا کرنا اور آخر میں لاہور کے شاہی قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرانا اس منصوبے کے دیگر حصے تھے۔ قلعہ پر جھنڈا لہرانے کا مقصد صوبے میں انگریز حکومت کے خاتمے کا اعلان اور اپنی انقلابی حکومت کا قیام تھا تاکہ پنجاب میں سیاسی اور انتظامی نظم نسق سنبھالا جا سکے۔ جہاں تک غدر پارٹی کے جھنڈے کا تعلق ہے اس میں پہلے دو رنگ نیلا اور زرد تھے جو مسلمان اور ہندوؤں کی یک جہتی ظاہر کرتے تھے بعد میں اس جھنڈے میں تبدیلی کی گئی اب یہ سبز سرخ اور زرد رنگ کا جھنڈا (ترنگا) تھا جو بالترتیب مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی نمائندگی کرتا تھا یہ جھنڈا مادام کالے نے ڈیزائن کیا اور سب سے پہلے اسے سان فرانسسکو میں غدر پارٹی کے ہیڈ کوارٹر پر لہرایا گیا۔

بغاوت کے اس منصوبے کی تکمیل کے لیے پارٹی نے سائیکلوسٹائل پمفلٹ بڑی تعداد میں لوگوں میں تقسیم کیے۔ پمفلٹ کا عنوان ''اعلانِ جنگ'' تھا جوں جوں عمل کا دن قریب آ رہا تھا پارٹی کے کارکنوں میں جوش و خروش بڑھتا جا رہا تھا لیکن اس موہوم منصوبے کو جس کی جڑیں عوام میں نہ تھیں انگریزی حکومت نے اپنی مؤثر حکمتِ عملی سے ناکام بنا دیا اس ناکامی کی ایک بڑی وجہ رش بہاری بوس کے ایک قریبی ساتھی مولا سنگھ کی گرفتاری تھی اسے متعین کردہ دن سے ایک ہفتہ قبل حراست میں لیا گیا اور پولیس نے اس پر اس وقت تک تشدد جاری رکھا جب تک اس نے منصوبے کی ایک ایک تفصیل نہیں بتا

دی۔

رش بہاری بوس کے نزدیک یہ مولا سنگھ کی غداری تھی اس لیے اس نے 17 فروری کی بجائے دو روز بعد منصوبے پر عملدرآمد کا فیصلہ کیا۔ لیکن انگریز حکومت نے بڑی چالاکی سے اپنے ایک ایجنٹ کرپال سنگھ کو پارٹی کی صفوں میں شامل کرالیا کرپال سنگھ نے حکومت کی حکمت عملی کی جھوٹی تفصیلات اس طریقے سے پارٹی کے ممتاز لوگوں تک پہنچایا کہ اسے رش بہاری بوس کے بے حد قریب ہونے کا موقع میسر آ گیا۔ یہ کرپال سنگھ کی ہی اطلاع تھی جس کے بعد پولیس نے یوم عمل (19 فروری) کو صبح صبح ہی رش بہاری کے ہیڈ کوارٹر پر بے حد احتیاط سے چھاپہ مارا' اس کامیاب چھاپے میں پولیس نے سات انقلابیوں کو گرفتار کر لیا ان کے قبضہ سے ریوالور' بم اور بم بنانے کا سامان برآمد ہوا۔ ہیڈ کوارٹر سے غدر پارٹی کے جھنڈے اور تحریری مواد بھی ملا۔ بعد کی سرگرمیوں میں پولیس نے اس قسم کا مزید تخریبی ساز و سامان کئی دیگر مقامات سے بھی برآمد کیا۔ ان انقلابیوں سے جو بم برآمد ہوئے وہ بنگالی ساخت کے تھے۔

ان گرفتاریوں اور برآمدگیوں کا فوری نتیجہ یہ نکلا کہ برطانوی حکام نے متعلقہ چھاؤنیوں کے مشتبہ ہندوستانی فوجیوں کو غیر مسلح کر دیا ان کو پریڈ سے نکال دیا گیا اور ان میں سے اکثر کو گرفتار کر کے بغاوت کے مقدمے بنا دیئے گئے۔ پارٹی کے دو رہنما پریم سنگھ اور جگت سنگھ میاں میر کی چھاؤنی کے باہر ریلوے کی پٹڑی کے قریب انتظار ہی کرتے رہ گئے کہ کب چھاؤنی سے ہندوستانی فوجی اسلحہ سمیت ان سے آن ملیں گے اور جب انہوں نے ان فوجیوں کو برطانوی فوجی افسروں کے ساتھ غیر مسلح دیکھا تو وہ وہاں سے واپس آ گئے۔ پنجاب حکومت نے سیالکوٹ' فیروز پور' راولپنڈی اور دیگر فوجی چھاؤنیوں کے افسروں کو بھی یہ اطلاع بذریعہ تار فراہم کر دی چنانچہ دوسرے ہی روز ان چھاؤنیوں کے سکھ فوجیوں کو یورپ کے مختلف محاذوں پر بھیج دیا گیا۔

میرٹھ میں باغیوں کے منصوبے کے بارے میں برطانوی افسروں کو ایک پٹھان فوجی نے اطلاع بہم پہنچائی کہ کرتار سنگھ سرابا' وشنو پر نگلے اور سچا سنگھ کو خصوصی طور پر پارٹی نے بھیجا ہے یہ پٹھان فوجی جو 12 ویں کیولری کا ایک نان کمشنڈ افسر تھا بعد میں ترقی پا کر کمشنڈ افسر بنا۔ اس فوجی کو تین دوسرے پٹھان سواروں نے اطلاع دی تھی یہ تین سوار کس طریقے سے غدر پارٹی کے دفتر سے اطلاع لے اڑے تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کو برطانوی حکام نے پارٹی میں اسی طرح شامل کرایا تھا جس طرح کرپال سنگھ رش بہاری کے قریب ہوا۔ ان میں سے ایک تو پر نگلے کے ساتھ بنارس بم لینے گیا تھا۔ ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ ان پٹھان سواروں سے پوچھ گچھ خود رش بہاری نے کی تھی اور ان کے بارے میں اطمینان کا اظہار بھی کیا تھا۔ یہ تھی بے وفائی اور غداری کی وہ داستان جس نے غدر پارٹی کے اس منصوبے کو ناکام بنانے میں اہم کردار ادا کیا اگرچہ صرف یہی وجہ نہیں تھی۔

بہر حال غدر پارٹی کی بغاوت ناکام ہوئی کیونکہ انگریزی حکومت ان کے تصور سے کہیں زیادہ چوکس تھی۔ رس بہاری بوس فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ کرتار سنگھ سرابا شاہ پور سے اور پرنگلے میرٹھ سے گرفتار ہوا۔ اس کے علاوہ بھی بڑی تعداد میں گرفتاریاں ہوئیں ان میں سے بڑی تعداد میں گرفتار شدگان اپنی جان بچانے کے لیے وعدہ معاف گواہ بن گئے انہوں نے پارٹی کے بارے میں اہم معلومات حکام کو فراہم کیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنے مقصد کی سچائی پر یقین رکھتے تھے لیکن پولیس کے وحشیانہ تشدد نے انہیں بھی زبان کھولنے پر مجبور کر دیا اور ان کی اطلاع پر مزید گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر نے مارچ 1915ء میں کمشنروں، ڈپٹی کمشنروں اور سیاسی رفقا کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں اس نے غدر پارٹی کے مزید کارکنوں کو گرفتار کرنے اور بغاوت کو مکمل طور پر کچل دینے کی بات کی۔ اس کے دو ماہ کے اندر پارٹی کے زیادہ تر رہنما اور کارکن حراست میں لے لیے گئے۔ ان میں سے بعض کارکن پولیس کی حراست سے فرار ہو گئے اور بعد میں انہوں نے پولیس کے مخبروں کو نشانہ بنایا اس دوران انہوں نے کئی مخبروں کو قتل کیا ان میں ہوشیار پور کا چندا سنگھ، امرتسر کا دولت مند سکھ اچر سنگھ اور لاہور سازش کیس (اس مقدمہ کو بعد ازاں یہی نام دیا گیا) کا ایک گواہ کپور سنگھ شامل ہیں۔ اگست 1915ء تک انگریزی حکومت نے غدر پارٹی کی بغاوت کو مکمل طور پر کچل دیا تھا پارٹی کے تقریباً سبھی رہنما اور کارکن پولیس حراست میں تھے۔ مائیکل اڈوائر نے اپنی یادداشت میں لکھا "وقت نے ایک مرتبہ پھر ثابت کر دیا کہ سکھ قوم ہماری وفادار ہے۔"

باغیوں پر مقدمات کیلئے خصوصی ٹربیونل تشکیل دیئے گئے جنہیں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت سزا دینے کے وسیع اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ ٹربیونلوں کے لیے از سر نو قوانین وضوابط وضع کیے گئے جو اگرچہ مبہم تھے لیکن اس قدر مؤثر ضرور تھے کہ باغیوں کو کڑی سزائیں دی جا سکیں ٹربیونل کے فیصلے کے خلاف اعلیٰ عدالتوں میں اپیل کا حق بھی چھین لیا گیا تھا۔ کرتار سنگھ سرابا نے بڑی جرأت کے ساتھ ہردیال اور پارٹی کے دوسرے رہنماؤں کے ساتھ اپنے تعلق کا اظہار کیا اس نے پارٹی کے نکتہ نظر اور نظریات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ آزادی کے متوالوں کی طرح اس کا بھی حق ہے کہ وہ وطن کو غیروں کے چنگل سے چھڑانے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے اس نے اپنی صفائی میں کوئی دلیل نہیں دی کیونکہ اس طرح وہ ایک غداری کا مرتکب ہوتا۔ ٹربیونل نے کرتار سنگھ کو سزائے موت کا حکم سناتے ہوئے کہا "یہ خطرناک ترین شخص ہے۔"

حکام نے پارٹی کو توڑنے اور باغیوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے اور حربے بھی استعمال کیے مثلاً بھائی سوہن سنگھ کی ماں کو جیل میں بھیجا گیا کہ اگر وہ اقبال جرم کر لے اور پارٹی کے راز سرکار کو بتا دے تو اسے معاف کیا جا سکتا ہے سوہن سنگھ نے اس بات کا انکشاف عدالت میں کیا اور کہا کہ اس نے اپنی ماں

سے پوچھا کہ آیا وہ یہ چاہتی ہے کہ اور ماؤں کے وہ بیٹے بھی موت کی آغوش میں چلے جائیں جو ابھی گرفتار نہیں ہوئے اور جن کی سرگرمیوں کے بارے میں حکام کو کچھ علم نہیں۔ سوہن سنگھ نے کہا میری ماں خاموش ہوگئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن دل میں میرے لیے پیار اور دعا تھی " وہ میری ماں ہے وہ کس طرح ایسی مذموم حرکتوں میں سامراجی حکام کا ساتھ دے سکتی تھی۔" ان خصوصی عدالتوں میں پارٹی کے اکثر لوگوں نے وطن کی آزادی کے حوالے سے جو باتیں بیان کیں وہ پنجاب کے عوام کی اکثریت کے لیے غم و غصہ کا باعث نہیں۔ اگرچہ پنجاب میں یہ بغاوت دبا دی گئی اس کے سیاسی اور سماجی اثرات ختم نہیں کیے جا سکے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے غدر پارٹی کے رہنماؤں نے امریکہ سے وطن واپسی کے سفر کے دوران ہانگ کانگ، شنگھائی، ملایا اور سنگاپور میں ہندوستانی فوجیوں سے رابطے کیے لیکن اکثر مقامات سے انہیں کوئی حوصلہ افزا جواب نہیں ملا ان فوجیوں کا ردعمل منفی تھا لیکن سنگاپور کے ایک لائٹ انفنٹری یونٹ نے جو تمام کا تمام ہندوستانی مسلمانوں پر مشتمل تھا ان کی باتیں غور سے سنیں اور حتی الامکان مدد اور تعاون کا یقین دلایا۔ اس یونٹ نے جو تقریباً 800 مسلمان فوجیوں پر مشتمل تھا 15 فروری 1915ء کو (یوم عمل کے روز) برطانوی چھاؤنی کا محاصرہ کر لیا۔ انہوں نے یونٹ کو تین گروپوں میں تقسیم کیا دو گروپوں نے اس جیل کے نزدیک پوزیشن سنبھالی جس میں جرمن فوجی قید تھے وہ اپنی بغاوت کی کامیابی کے لیے ان جرمنوں پر بہت انحصار کیے ہوئے تھے۔ لیکن جرمنوں نے موقع کے باوجود جیل سے رہا ہونے سے انکار کر دیا ان کا کہنا تھا کہ وہ اس بغاوت میں فریق بننے کو تیار نہیں تیسرے گروپ کے فوجیوں نے سنگاپور کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور آبادی میں پھیل گئے انہوں نے محاصرہ دو روز تک برقرار رکھا اور اندر محصور برطانوی فوجیوں پر گولیاں برساتے رہے جوابی فائرنگ سے ان کا زیادہ نقصان ہوا۔ کیونکہ قلعہ کے اندر بھاری توپ خانہ بھی تھا اور ان مسلمان فوجیوں کے پاس صرف رائفلیں تھیں اس جھڑپ میں جو 48 گھنٹے جاری رہی 44 ہندوستانی اور 8 انگریز فوجی مارے گئے۔ جب قلعہ بند فوجیوں کو تازہ کمک پہنچی تو ہندوستانیوں کا محاصرہ اور مقابلہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ان میں سے 126 باغیوں کو حراست میں لے لیا گیا ان کو سرسری سماعت کی فوجی عدالتوں نے مختلف المیعاد قید کی سزائیں سنائیں۔ ان میں 37 کو سزائے موت سنائی گئی۔ 41 کو عمر قید ہوئی۔ موت کی سزا پانے والوں کو سنگاپور کے چوراہوں پر پھانسی دی گئی تا کہ لوگوں کے دلوں میں انگریز کی دہشت بیٹھ جائے۔

II

غدر پارٹی کے قیام سے ایک عشرہ قبل لندن، پیرس اور برلن ہندوستانی انقلابیوں کے بڑے

مراکز رہے تھے یہاں کے انقلابیوں نے جن خطوط پر سیاسی کام شروع کیا اسی کے نتیجے میں سان فرانسسکو میں غدر پارٹی کی بنیاد رکھی گئی گویا غدر پارٹی یورپ' امریکہ اور مشرق بعید میں سیاسی سوچ رکھنے والے اور وطن کی آزادی کے خواب دیکھنے والوں کے لیے طاقت اور نظریہ کا سرچشمہ تھی یہ سرگرمیاں پہلی جنگ عظیم کے دوران تیز تر ہوئیں کیونکہ انہیں ایک انگریز دشمن طاقت یعنی جرمنی کی قدرتی رفاقت اس طرح حاصل تھی کہ وہ دشمن کا دشمن تھا گویا وہ اس حوالے سے جرمنی کو اپنا قدرتی حلیف سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے سب سے زیادہ سیاسی کام جرمنی میں ہوا اور جنگ عظیم کے دوران برلن ہندوستانی انقلابیوں کا گڑھ بن گیا۔

جرمن حکومت کی مدد سے سب سے پہلے ایک تنظیم قائم کی گئی جس کا نام ہندوستانی انقلابی کمیٹی تھا۔ پنجاب سے ہردیال جو اب تک انگلستان سے تعلیم کے بعد سیاسی کاموں میں مصروف تھا اپریل 1914ء میں جرمنی پہنچا۔ اس نے وہاں مقیم ہندوستانیوں کو وطن کی سیاسی صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ غدر پارٹی برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت برپا کرنے کیلئے کام کر رہی ہے۔ ہردیال نے ہندوستانی انقلابی کمیٹی کو وسعت دے کر انڈیا برلن کمیٹی قائم کی جس میں جرمن انقلابیوں کی ایک خاصی بڑی تعداد بھی شامل تھی اس کمیٹی نے جرمنی کی حکومت سے رابطہ کیا کہ غدر پارٹی کو روپیہ اور اسلحہ فراہم کیا جائے تا کہ وہ ہندوستان میں اپنے منصوبوں پر مؤثر انداز میں عمل کر سکے۔

جرمن حکومت نے کمیٹی کی یہ درخواست بلا تامل قبول کر لی کیونکہ اسے اس میں اپنا سیاسی اور عسکری مفاد نظر آتا تھا برلن کے حکام نے اس کمیٹی کے منصوبے کو اپنے لیے سودمند سمجھا کیونکہ ان کے نزدیک اگر ہندوستان میں سیاسی ابتری کی حالت پیدا ہوتی ہے تو انگلستان کی حکومت کا فوجی دباؤ یورپ میں کمزور ہو گا چنانچہ غدر پارٹی کو پیسہ اور اسلحہ فراہم کرنے کی درخواست نہ صرف مان لی گئی بلکہ جرمنی نے ہندوستان انقلابیوں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ جرمنی یا کسی اور حلیف ملک میں ہندوستان کی عبوری حکومت بھی قائم کر لیں جرمنوں کا کہنا تھا کہ اس عبوری حکومت کو متعدد ممالک کی ہمدردی بھی حاصل ہو جائے گی اور تقریباً نصف دنیا اسے تسلیم بھی کر لے گی۔ ایک آزاد جلاوطن حکومت کا تصور ہندوستانی انقلابیوں کے لیے بے حد ولولہ انگیز تھا لیکن اس پر مزید غور اور دنیا بھر میں اس بارے میں مشوروں کے لیے اس پر عملدرآمد ملتوی کر دیا گیا تاہم جرمنی نے غدر پارٹی کو فوری مدد کے لیے پانچ ہزار ریوالوروں کی پہلی کھیپ مہیا کر دی جن کو ہندوستان پہنچانے کے لیے ایک جہاز "دی ہنری ایس" کرایہ پر حاصل کیا گیا یہ کرایہ بھی جرمنی نے ادا کیا۔ لیکن شومئی قسمت کہ یہ جہاز جب ہانگ کانگ پہنچا تو ایک جاپانی ڈاکٹر داؤس دیکر کو حراست میں لے لیا گیا اور اس نے اس جہاز پر موجود اسلحہ کے بارے میں معلومات وہاں کے برطانوی حکام کو فراہم کر دیں۔ برطانوی حکام نے جہاز قبضہ میں لے کر پورے عملہ کو حراست میں لے لیا اس واقعہ

کے بعد دنیا بھر میں برطانوی ہند کے حکام جرمن سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنے لگے۔ مارچ 1915ء میں ہندوستان اسلحہ سمگل کرنے کی ایک اور کوشش کی گئی۔ جرمن حکام نے اسلحہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ''اینی لارسن'' نامی جہاز پر لادا اس جہاز کو براہ راست کلکتہ لنگرانداز نہیں ہونا تھا پروگرام یہ تھا کہ یہ جہاز مشرقی بنگال کے جنگل سندر بن میں ایک جگہ ٹھہرے گا جہاں ''میورک'' نامی ایک تیل بردار جہاز بھی آئے گا یہ آئل ٹینکر امریکہ سے روانہ ہوا اور اس پر غدر پارٹی کے پانچ ارکان بیرولہ کی وردیوں میں ملبوس ہو کر چڑھ آئے تھے۔ سندر بن میں پارٹی کے ان ارکان نے ''اینی لارسن'' پر لدا ہوا اسلحہ حاصل کر کے جنگلات اور دلدلی زمین کے راستے کلکتہ کے نواحی علاقوں میں پہنچانا تھا۔ لیکن دونوں جہازوں کے ملنے کا جو وقت طے ہوا تھا ''میورک'' اس وقت وہاں نہیں پہنچا۔ ایک روز کے انتظار کے بعد ''اینی لارسن'' اسلحہ سمیت واپس روانہ ہو گیا۔

تیسرے واقع میں بے وفائی اور غداری کا عنصر غالب تھا جرمنوں نے فروری 1916ء میں اپنی وزارت خارجہ کی منظوری سے برلن انڈیا کمیٹی کو ایک بڑی رقم دینے کا فیصلہ کیا یہ رقم بنگال کے ڈاکٹر سی کے چکرورتی کے سپرد کی گئی تا کہ وہ ہندوستان جا کر اسے غدر پارٹی کے حوالے کر دے۔ ایم این رائے نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر چکرورتی نے اس رقم کا بے دریغ استعمال کیا اس نے اس سے کلکتہ میں جائیداد خریدی اس نے غدر پارٹی کو تھوڑی سی رقم دی اور باقی جلد ادا کرنے کا وعدہ کیا اس دوران وہ جاپان' جرمنی اور امریکہ میں انقلابیوں کو غدر پارٹی کی سرگرمیوں کے بارے میں مبالغہ آمیز رپورٹیں دیتا رہا ان ممالک میں یہ تاثر قائم ہو گیا کہ چکرورتی کا دیا ہوا روپیہ پارٹی کے خوب کام آ رہا ہے۔ وہ ان جھوٹی خبروں اور رپورٹوں کی بنیاد پر جرمنوں سے ایک برس تک مزید رقم حاصل کرتا رہا اور جب اس عرصہ کے بعد جرمنی کی حکومت کو اصل واقعات کا علم ہو گیا تو اس نے نہ صرف مزید رقم دینے سے انکار کر دیا بلکہ غدر پارٹی کی اعانت سے پوری طرح ہاتھ کھینچ لیا۔ اب پارٹی کے لیے جرمنی کی کوئی مدد کسی حوالے سے نہیں مل رہی تھی۔

III

برلن میں ہی کیے گئے ایک فیصلے کے مطابق غدر پارٹی نے یکم دسمبر 1915ء کو کابل میں ہندوستان کی ایک آزاد عبوری حکومت قائم کر دی اس حکومت نے جلاوطنی سے بیان جاری کیا کہ ہندوستانیوں پر لازم ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے خاتمے اور وطن کی آزادی کیلئے ہر قدم اٹھائیں اس حکومت نے کہا جو ہندوستانی جہاں ہے اور جو کام کر رہا ہے وہ اس کا محاذ ہے بہتر یہ ہے کہ مسلح جدوجہد کی جائے اس کے بعد عدم تعاون کا درجہ آتا ہے لیکن کوئی بھی قدم اٹھائیں اس سے مقامی غدر پارٹی کو مطلع

کریں تا کہ وہ کابل کی عبوری انتظامیہ کے ساتھ اپنی سرگرمیاں مربوط کر سکیں۔اس عبوری حکومت کے صدر راجہ مہندر پرتاپ تھے اور برکت اللہ وزیر اعظم چنے گئے۔مولانا عبیداللہ کو داخلہ امور کا محکمہ دیا گیا ان کے علاوہ مولانا بشیر احمد' چندر پلائی' ڈاکٹر شمشیر سنگھ' خدا بخش اور محمد علی بھی کابینہ میں شامل تھے۔اس حکومت نے افغانستان کے شاہی خاندان کے بعض افراد کی ہمدردیاں بھی حاصل کر لیں گو کہ وہ امیر افغانستان کو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کرنے پر قائل نہ کر سکے۔

اسی دوران ہندوستان میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہو گئی جس کا مقصد جنگ عظیم میں ترکی کی مدد کرنا تھا کیونکہ وہ اس وقت عالم اسلام کا مرکز تھا دنیا کے متعدد مسلمان ملکوں میں بھی اس حوالے سے جذبات بیدار ہوئے لیکن سوائے ہندوستان کے کسی اور ملک میں اس بارے میں کوئی سیاسی کام نہیں ہوا۔فروری 1915ء میں 15 مسلمان طلبا نے کالجوں میں اپنی پڑھائی کو خیر باد کہا اور ترکی کے لیے کام کرنے والے مجاہدین گروپ میں شامل ہو گئے جس کے زیادہ تر ارکان وہابی فرقہ سے تعلق رکھتے تھے۔بعد ازاں ان مجاہدین کا ایک دستہ کابل گیا اور وہاں آزاد عبوری حکومت سے رابطہ قائم کیا۔اس کے علاوہ بعض اور مسلمان بھی کابل گئے اور عبوری حکومت کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے ان مسلمان گروپوں کا تقاضا تھا کہ انگریز کے خلاف جہاد کا اعلان کیا جائے۔عبوری حکومت کے سربراہ راجہ مہندر پرتاپ نے ماسکو' نیپال اور ہندوستان میں وفود بھیجے جہاں انہوں نے بعض ریاستی راجاؤں کے ساتھ رابطہ کیا اور انہیں آزاد حکومت کے ساتھ تعاون پر آمادہ کرنے کی کوشش کی لیکن کسی بھی وفد کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

وزیر داخلہ عبیداللہ نے سعودی عرب اور ہندوستان میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو ریشمی رومالوں پر خط لکھے جن میں انہوں نے آزاد حکومت کے مقاصد' افغانستان اور قبائلی علاقوں کی صورت حال اور "اللہ کی فوج" کے بارے میں تفصیل سے لکھا۔ان خطوط سے ظاہر ہوتا تھا کہ آزاد حکومت آخر کار مدینہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنانا چاہتی ہے جہاں شہزادہ محمد حسن کو اس فوج کا جنرل انچیف مقرر کیا جانا تھا اس طرح کے دیگر دفاتر تہران' کابل اور قسطنطنیہ میں قائم کئے جانا تھے جہاں کی فوج کی سربراہی مولانا عبیداللہ سندھی کو کرنا تھی۔

ایسے ہی دو خطوط عبدالحق کے ہاتھوں ہندوستان بھیجے گئے وہاں اس کے پیچھے انگریزی حکومت کے جاسوس لگ گئے عبدالحق نے گھبراہٹ میں یہ دونوں خطوط ملتان کے خان بہادر رب نواز خان کو دے دیئے رب نواز کے دو بیٹے فروری 1915ء سے کابل میں تھے اور آزاد حکومت کے ساتھ کام کر رہے تھے لیکن رب نواز خود انگریزی سرکار کا وفادار تھا اس نے یہ دونوں "ریشمی رومال" حکومت کو دے دیئے۔ان خطوط کے مندرجات کا علم ہوتے ہی حکومت نے ایک مرتبہ پھر گرفتاریوں اور جبر و تشدد کا سلسلہ

شروع کر دیا پنجاب، سندھ، سرحدی صوبہ اور دہلی سے بڑی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کرلیا اور یوں ایک مرتبہ پھر ہندوستان میں انقلابیوں کی سرگرمیوں کو شدید دھچکہ لگا۔ ریشمی رومال کی تحریک آغاز میں ہی دم توڑ گئی اور یوں بھی آزاد عبوری حکومت کے مقاصد کے حصول کے لیے طریق کار اور حکمت عملی ابھی پوری طرح طے نہیں کی گئی تھی اس مرحلے پر یہ دھچکہ مکمل طور پر زہر قاتل ثابت ہوا۔

تاہم کابل کی آزاد حکومت مضبوطی سے قائم تھی اس نے سوویت یونین کی بالشویک حکومت سے درخواست بھی کی کہ اسے تسلیم کرلیا جائے صدر راجہ مہندر پرتاپ نے اس کے لیے ماسکو کا دورہ کیا اور خود لینن نے انہیں خوش آمدید کہا لینن نے کابل کی اس آزاد حکومت کے ساتھ ہر ممکن تعاون کا وعدہ کیا لیکن جونہی صدر مہندر پرتاپ کابل واپس پہنچے جرمنی اور ترکی کو جنگ میں شکست ہوگئی اور افغانستان نے برطانیہ کے ساتھ امن کا معاہدہ کرلیا اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی آزاد عبوری حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

ہندوستان کی اس آزاد عبوری حکومت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ ایک سایے کا تعاقب کر رہی تھی اس کے مقاصد کی صداقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن ان کا سیاسی کام بے حد کمزور تھا۔ انہوں نے ہندوستان میں کوئی تنظیم قائم نہیں کی تھی اور یوں ان کا عوام کے ساتھ کوئی رابطہ نہ تھا یعنی پوری "حکومت" اس خیال سے چپکی ہوئی تھی کہ اہل ہندوستان ایک آواز پر مسلح ہو کر دیہات اور فیکٹریوں سے باہر نکل آئیں گے اور برطانوی حکومت کے مراکز کو تہس نہس کر دیں گے لیکن ایسا نہ ہوا اور نہ ہی ہوسکتا تھا۔ راجہ مہندر پرتاپ کو بھی صدر اس لیے بنایا گیا تھا کہ وہ ہندوستان کی ریاستوں اور ان کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کے لیے کشش کا باعث بنیں گے اور جونہی پرتاپ کوئی بات کہیں گے تمام ریاستیں مسلح بغاوت برپا کر دیں گے لیکن ایک مرتبہ پھر بات بنیادی سیاسی اصولوں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے کہ پوری عبوری انتظامیہ میں شائد ایک فرد بھی ایسا نہ تھا جسے ہندوستان کی سیاست خصوصاً وہاں کے راجاؤں اور دوسرے جاگیرداروں کی برطانوی راج کے ساتھ غیر مشروط وفاداری کا علم نہ تھا۔ گویا یہ حکومت جو کچھ بھی کر رہی تھی اس کے لیے کوئی سیاسی جائزہ نہیں لیا گیا۔ کابل میں اس حکومت کے خاتمے کے بعد بھی "وزیر اعظم" برکت اللہ وہاں مقیم رہے اور وہاں غدر پارٹی کے ایسے کارکنوں کے ساتھ مل کر کام کو آگے بڑھاتے رہے جنہیں اب سرکاری سرپرستی حاصل نہیں رہی تھی چنانچہ یہ کام بھی قطعی بے معنی ہو کر رہ گیا۔ اگست 1915ء تک غدر پارٹی کی یہ شورش بھی مکمل طور پر کچل دی گئی تھی بعد ازاں گرفتار شدہ رہنماؤں اور کارکنوں کے خلاف جو مقدمات قائم کیے گئے اور انہیں جو سزائیں دی گئیں اس کے بعد پارٹی تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔

IV

ان تمام واقعات سے قبل غدر پارٹی کے رہنما جب امریکہ سے روانہ ہو کر بغاوت پھیلانے کیلئے ہندوستان آئے تو سان فرانسسکو میں رام چندر کو پارٹی امور اور جریدے "غدر" کی اشاعت کا کام سونپا گیا۔ رام چندر وہ واحد رہنما تھا جو امریکہ میں رہ گیا۔ اگست 1915ء میں ناکامی کے بعد جنوب مشرقی ایشیا اور دیگر ممالک سے پارٹی کے کئی رہنما امریکہ چلے گئے ان کا مقصد پارٹی کو از سر نو منظم کرنا تھا سیکرٹری بھائی سنتو کھ سنگھ نے تنظیم نو میں جلد بازی سے کام لیا شائد انہوں نے گھبراہٹ میں یہ کام سرانجام دیا۔ چونکہ ان سالوں میں رام چندر امریکہ ہی میں مقیم رہے اور اسے پارٹی کے امور پر مکمل عبور حاصل تھا اس لیے اس نے پارٹی کی تنظیم پر بھی قبضہ کر لیا بعد ازاں اس پر یہ الزام لگا کہ اس نے پارٹی کے وسائل ذاتی مفادات کے حصول کے لیے صرف کیے بھائی سنتو کھ سنگھ نے جو تنظیم نو کی اس میں بھی زیادہ تر عمل دخل رام چندر ہی کا رہا۔ ان سالوں میں اس نے پارٹی کا کوئی نظریاتی اور تنظیمی کام نہیں کیا صرف "غدر" کی اشاعت باقاعدگی سے کرتا رہا۔ ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ رام چندر اور دوسرے رہنماؤں میں باقاعدہ لڑائی چھڑ گئی رام چندر کو ان الزامات کا سامنا بھی کرنا پڑا کہ اس نے ہندوستان میں انقلاب اور انقلابیوں کی مدد کے لیے نہ رقم بھیجی اور نہ ہی اسلحہ فراہم کیا اور انہیں وجوہات کی بنا پر پارٹی کے تمام منصوبے ناکام ہوئے۔

ابھی غدر پارٹی کی تنظیم نو اور نئی صف بندی کا کام جاری تھا کہ امریکہ نے جو پہلی جنگ عظیم میں تاخیر کے ساتھ 7 اپریل 1917ء کو شامل ہوا تھا اپنی سرزمین پر پارٹی کے متعدد رہنماؤں کو اس لیے گرفتار کر لیا کہ وہ ایک دوست ملک (برطانیہ) کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں سنتو کھ سنگھ، بھگوان سنگھ، رام سنگھ دھولیہ، بشن سنگھ، گوپال سنگھ، ندھان سنگھ، سی کے چکرورتی اور ترکنا تھ داس گرفتار شدگان کے اولین گروپ میں شامل تھے۔ ان پر اگست 1917ء میں سان فرانسسکو میں مقدمہ چلایا گیا اس عدالتی کارروائی پر امریکہ نے 30 لاکھ ڈالر صرف کیے ان میں سے 25 لاکھ ڈالر کی رقم برطانیہ نے فراہم کی تھی۔ "سان فرانسسکو ٹرائیل" اس قدر سنگین مسئلہ ثابت ہوا کہ گواہوں کے لیے عدالتی کارندوں کو ہندوستان آنا پڑا بڑی تعداد میں ان گواہوں کو امریکہ لیجایا گیا ایک کے سوا تمام ملزموں پر الزام ثابت ہوا اور انہیں قید اور جرمانے کی سزا سنائی گئی۔ مقدمے کے آخری روز ایک ڈرامائی صورت حال پیدا ہوئی رام سنگھ دھولیہ نے رام چندر کو جو خود بھی گرفتار شدگان میں شامل تھا عدالت کے اندر گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک عدالتی اہلکار نے رام سنگھ کو بھی گولی سے اڑا دیا رام چندر کو غدر پارٹی کے رہنماؤں کا انتقام لینے کے لیے قتل کیا گیا۔ رام چندر مقدمے کے دوران پارٹی رہنماؤں کے خلاف بیان دیتا رہا ایک ملزم سے زیادہ

وہ گواہ ثابت ہوا ایک مرحلے پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ اگست 1914ء کے بعد رام چندر برطانوی ایجنٹ بن چکا تھا اور انگریزوں ہی کے کہنے پر وہ پارٹی اور انقلاب کے خلاف کام کرتا رہا۔ سان فرانسسکو ٹرائیل غدر پارٹی کے خاتمے کا ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا کیونکہ دنیا بھر میں اب پارٹی کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی تھی۔

جیل میں قید کے دوران پارٹی کے کئی رہنماؤں کی امریکی کیمونسٹوں سے ملاقات ہوئی اور ان سے بات چیت کے بعد انہوں نے جب اپنی تحریک کا جائزہ لیا تو انہیں اس میں کئی خامیاں نظر آئیں۔ انہوں نے محسوس کیا کہ جب پارٹی کے کارکن جان ہتھیلی پر رکھ کر مادرِ وطن کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار تھے تو کمی صرف اس بات کی تھی کہ پارٹی حقیقی معنوں میں انقلابی تحریک کے لیے منظم نہ تھی۔ اس کے علاوہ قیادت فعال نہ تھی اور نہ ہی پارٹی کی صفوں میں نظریاتی وحدت کا عنصر موجود تھا۔ انہی دنوں روس میں بالشویک تحریک کی کامیابی نے بھی غدر پارٹی کے رہنماؤں کو بہت کچھ سکھایا بھائی سنتوکھ سنگھ نے جیل میں مارکسی تعلیمات اور بالشویک پارٹی کی تنظیم کا مطالعہ کیا اس کے لیے انہیں مقید امریکی کیمونسٹوں کی مدد بھی حاصل رہی جیل میں قیام کے دوران سنتوکھ سنگھ اور ان کے کئی اور ساتھی کیمونسٹ بن چکے تھے۔ کچھ عرصہ انہوں نے دیگر قیدیوں کو کیمونزم کے بارے میں آگاہ بھی کیا جیل سے رہائی کے بعد غدر پارٹی کے رہنماؤں نے پارٹی کو کیمونسٹ نظریات کے تحت منظم کرنے کا کام شروع کیا۔ اس کے لیے انہوں نے ترقی پسند افراد اور تنظیموں سے رابطہ بھی قائم کیا اور فیکٹری کے مزدوروں کے ساتھ بھی دوستی بڑھائی۔

لیکن ابھی ان کا یہ کام ابتدائی مراحل میں تھا کہ امریکی انتظامیہ نے ان کو ملک بدر کرنے کے لیے اقدام کرنے کا فیصلہ کر لیا سیٹل (Seatle) کے لیبر کمیشن کو امریکی حکومت نے یہ درخواست دی کہ ان لوگوں کا تعلق باغیانہ سرگرمیوں سے ہے اور یہ کہ وہ ایک دوست ملک کے خلاف کام کر رہے ہیں۔ جونہی ان لوگوں کے خلاف مقدمہ کا آغاز ہوا بہت سی تنظیموں نے ان ہندوستانی رہنماؤں کا دفاع کرنے کا فیصلہ کیا ان میں امریکہ کی مزدور تنظیمیں، آئرش سوسائٹی اور روس اور چین کی تنظیمیں شامل تھیں۔ دفاع کے وکلا نے بھی مضبوط موقف اختیار کیا کہ جو الزامات عائد کیے گئے پارٹی کے رہنما اس کی سزا پہلے ہی بھگت چکے ہیں اور ایک ہی الزام میں کسی کو دو مرتبہ سزا نہیں دی جا سکتی چنانچہ عدالت نے سب رہنماؤں کو بری کر دیا۔

عدالتی ہتھکنڈوں میں ناکامی کے بعد انگلستان کی حکومت نے امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈلوانے کا منصوبہ بنایا اس کا مقصد یہ بھی تھا کہ جو لوگ اب تک پارٹی کی سرگرمیوں سے دلبرداشتہ ہو چکے تھے اور نیم دلی کے ساتھ کام کر رہے تھے انہیں نظریاتی اور غیر لچکدار لوگوں سے الگ کیا جائے تا کہ امریکہ میں غدر پارٹی کی سرگرمیوں کو کچلنے میں آسانی پیدا ہو سکے اس سلسلے میں مہاراجہ پٹیالہ نے ایک تجویز وائسرائے کو پیش کی کہ سکھ نوجوانوں کا ایک وفد امریکہ اور کینیڈا بھیجا جائے تا کہ پارٹی میں

نفاق پیدا کیا جا سکے تاکہ انقلاب پسندوں کے ساتھ نمٹنے میں آسانی ہو۔

وائسرائے نے اس تجویز کو پسند کیا اور اس کی منظوری دے دی۔ ایک سکھ وفد کا انتخاب کیا گیا جس میں گوربانی کا پاٹھ کرنے والے' کالج کے اساتذہ اور دو ایک بڑی عمر کی خواتین شامل تھیں۔ اس وفد کا کام خاص طور پر سکھوں کو مذہب کے حوالے سے مسلمانوں اور ہندوؤں سے الگ کرنا تھا جب اس سکیم کا تعین کر لیا گیا تو مسلمانوں کا ایک وفد بھی الگ طور پر امریکہ بھیجا گیا اس تمام تر سکیم کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ غدر پارٹی کے کارکنوں کو مذہب کے نام پر الگ کیا جا سکے انہیں جو سبق پڑھایا گیا وہ یہ تھا کہ وہ سکھوں اور مسلمانوں کو خبردار کریں کہ وہ ہندو کی چالاکی اور بنیا پن سے ہوشیار رہیں۔

غدر پارٹی کے ایک رہنما رگھویر سنگھ نے لکھا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کو بھی کچھ اسی قسم کا کام سونپا گیا اس کے دو رہنما مسز سروجنی نائیڈو اور سید حسن کو بھی الگ طور پر امریکہ اور کینیڈا روانہ کیا گیا سید حسن مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ غدر پارٹی دہشت گردوں اور تخریب کاروں کا ایک گروہ ہے جنھوں نے حد درجہ کی مہم جوئی کے نتیجے میں سینکڑوں لوگوں کو بے گناہ مروا دیا ہے مسز سروجنی نائیڈو مہاتما گاندھی کے نظریات کا پرچار کرتی تھیں کہ عدم تشدد سب سے بڑا سیاسی ہتھیار ہے اور تشدد اور دہشت گردی سے کسی کو آزادی نہیں مل سکی۔ دونوں کانگریسی رہنماؤں کا مقصد ایک تھا لیکن طریقہ کار مختلف تھا۔ سید حسن سان فرانسسکو کے علاقے سیکرمنٹو میں رہائش پذیر ہندوستانی مسلمانوں کو اپنا ہم نوا بنانے میں کامیاب ہو گئے اور مسز سروجنی نائیڈو کے پاس عدم تشدد کا جو ہتھیار تھا وہ اس سے بھی کہیں زیادہ موثر ثابت ہوا۔ جب یہ سارے مشن سے واپس آئے تو انہوں نے حکومت کو اپنی کامیابی کی رپورٹ دی۔ یہ تھا بھی سچ کیونکہ وہ مسلمانوں اور سکھوں کے دلوں میں نہ صرف مذہبی منافرت کے بیج بو آئے تھے بلکہ سیاسی طور پر بھی انہیں الگ کر دیا تھا۔ لیکن فرقہ واریت کی یہ دیواریں بعد میں ریت کی دیواریں ثابت ہوئیں کیونکہ غدر پارٹی کے رہنماؤں نے جواب اشتراکی تنظیم اور نظریات سے ہم آہنگ ہو چکے تھے نیم دل کارکنوں کو جب اصل سازش سے آگاہ کیا تو ان کی ایک بڑی تعداد پارٹی میں واپس چلی آئی اور پہلے کی طرح گرم جوشی سے کام شروع کر دیا۔

پارٹی نے اب ایک نئی ورکنگ کمیٹی تشکیل دی۔ بھائی رتن سنگھ اس کے صدر' سنتو کھ سنگھ جنرل سیکرٹری اور بھائی سنتا سنگھ خزانچی چنے گئے۔ کمیٹی نے تنظیمی کام کے ساتھ ساتھ ہفت روزہ "ہندوستان غدر" اور انگریزی اور گورمکھی کے دو ماہناموں کی اشاعت کا اہتمام بھی کیا۔ انگریزی زبان کے ماہنامے کا نام انڈی پینڈنٹ اور ہندوستان اور گورمکھی ماہنامے کا نام یوگنتر تھا۔ ان دونوں ماہناموں کی پہلی اشاعت کی تقریباً 25 ہزار کاپیاں ہندوستان اور دوسرے ممالک میں ڈاک کے ذریعے مفت تقسیم کی گئیں۔ غدر پارٹی نے اس طرح خود کو زندہ اور فعال رکھا اگرچہ اب اس کا بنیادی کام بغاوت کے سایے کا تعاقب کرنے کے

بجائے اشاعتی اور نظریاتی شعور پھیلانے تک محدود رہ گیا تھا۔ ان رسالوں میں انگریز کی حکمت عملی کا پردہ چاک کیا جاتا ایک ایک سکیم اور قانون کا جائزہ لے کر لوگوں کو باور کر دیا جاتا کہ اس کا مقصد صرف سامراجی عزائم کی تکمیل ہے۔ ان جرائد میں حالات حاضرہ اور مختلف منصوبوں کے حوالے سے جس قدر مواد شائع ہوا شائد کسی اور جگہ نہیں ہوا۔

جب امرتسر میں جلیانوالہ باغ کا روح فرسا واقعہ پیش آیا تو دونوں ماہناموں نے خصوصی اشاعتوں کا اہتمام کیا۔ ان میں شامل مضامین میں انگریزی حکومت کو ظالم جابر اور انتہائی غیر ذمہ دار قرار دیا گیا۔ سریندر کور نے "ہندوستان میں برطانوی بربریت" کے عنوان سے مضمون لکھا اس کا ایک اقتباس یہ ہے "نہتے عوام کے قتل عام عورتوں پر جبر اور بچوں کو توپ کے گولوں سے اڑانے سے انگریز سرکار نے اپنے ظالمانہ نظام میں ایک خونیں باب کا اضافہ کیا ہے۔ اگرچہ برطانوی سامراج کی کئی حلیف طاقتوں نے ماضی کی طرح اب بھی اس قسم کی خون آشام داستانوں (جلیانوالہ) سے لاتعلقی کا اظہار کیا ہے حتیٰ کہ معذرت بھی کی لیکن انہوں نے کبھی اپنے اس حلیف (برطانیہ) کو اس طرح مورد الزام نہیں ٹھہرایا جو ان وحشی درندوں نے کیا اور جو حالات و انصاف کا تقاضا ہے۔ تاریخ شاہد ہے جہاں جہاں برطانوی سامراجیوں نے قدم جمائے ہیں وہاں غیر انسانی رویوں بے رحمی ظلم و جبر اور قتل و غارت گری کی نئی داستانیں رقم ہوئی ہیں۔"

پنجاب میں 1915ء کے بعد غدر پارٹی مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی اس کے رہنما مختلف سزائیں جھیلنے کے بعد رہا ہوئے انہوں نے بائیں بازو کی سیاسی جماعتوں اور چھوٹے چھوٹے گروپوں میں شمولیت اختیار کر لی ان میں کیرتی کسان نوجوان سبھا اور ببر اکالی قابل ذکر تنظیمیں تھیں۔ بعد میں ان کے اکثر لوگ کیمونسٹ پارٹی میں چلے گئے۔ پنجاب پولیس نے اپنی سپیشل برانچ کے ذریعے "کیرتی کی لہر" کے نام سے جو رپورٹ غدر پارٹی کے ان لوگوں کے بارے میں مرتب کی اس میں لکھا گیا ہے "یہ سچ ہے کہ غدر پارٹی نے تسلسل کے ساتھ ایک کے بعد ایک انقلابی سازش کی۔ امریکہ میں گذشتہ جنگ عظیم میں اس کو کچل دیا گیا لیکن آج تک بھی کوئی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کی سرگرمیوں کا مکمل طور پر خاتمہ ہو گیا ہے۔ آج بھی اس کی سازشیں کسی نہ کسی شکل میں جاری ہیں۔

خاص طور پر وہ سکھ جو دوسرے ممالک سے واپس آئے اس پارٹی کے ساتھ گہری نظریاتی وابستگی رکھتے ہیں۔ ان میں سے بعض ماسکو سے تربیت حاصل کر کے واپس لوٹے ہیں۔ ان تمام لوگوں میں انقلابی نظریات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں پنجاب میں رہنے والے سکھوں میں خصوصاً یہ رجحان کچھ زیادہ ہے۔ یہ لوگ انتہا پسند ہیں اور ان کے دل برطانوی راج کے خلاف نفرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ قدرتی طور پر انقلابی ہیں اور جب بھی انہیں برطانوی راج کے خلاف بغاوت کرنے یا اس کو

پھیلانے کا موقع ملا ہے انہوں نے برضا و رغبت اس میں حصہ لیا ہے اور اب بھی وہ ایسا ہی کریں گے۔"
اس رپورٹ کی بنا پر بخوبی یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ تنظیمی طور پر پنجاب میں وجود نہ ہونے کے باوجود اس پارٹی نے لوگوں کے دلوں اور ذہنوں میں انقلاب کا شعور پیدا کر دیا تھا اور یہ 1915ء کے بعد برس ہا برس قائم رہا۔ جہاں تک سان فرانسسکو میں پارٹی کے ہیڈ آفس کا تعلق ہے وہ نظریاتی شعور کی آگہی کے لیے اپنے جرائد سے کام لیتا رہا اور یہ کام 1947ء تک جاری رہا اور وہاں کا صدر دفتر تقسیم ہند کے بعد ہی بند ہوا۔

V

غدر پارٹی نے انقلاب کے لیے جس موقع کا انتخاب کیا تھا وہ صحیح تھا لیکن تنظیمی عدم استحکام رہنماؤں کی منصوبہ بندی میں غلطیوں اور مفروضوں کے ساتھ ساتھ برطانوی حکومت کی کڑی نگرانی، انٹیلی جنس ایجنسیوں کی عمدہ کارکردگی اور جبر و استبداد کے باعث یہ شاندار تحریک اس طرح ختم ہوئی جسے صرف المناک کہا جاسکتا ہے لیکن بیرون ملک اس کی کارکردگی اور اس کے پیغام کی اثر انگیزی بے حد کامیاب رہی۔ یہ تنظیم مارچ 1913ء میں قائم ہوئی اور صرف ایک برس کے اندر کینیڈا، امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا کے ہندوستانیوں میں حیرت انگیز طور پر پھیل گئی اس نے جو سیاسی فلسفہ پیش کیا وہ ان ممالک میں رہنے والے ہندوستانیوں میں جلد ہی مقبول ہو گیا۔ لیکن پنجاب میں اس تنظیم کی پراپیگنڈا مشینری قائم نہیں ہوئی تھی کہ 1914ء میں اس نے اس وسیع و عریض صوبے میں بغاوت کا علم بلند کر دیا اس میں انہیں اتنی زیادہ ناکامی بھی نہیں ہوئی اس بغاوت کے دوران عوام نے کبھی اسے ناپسند نہیں کیا نہ ہی اس سے نفرت کی پنجاب میں اس کی قیادت کی ذمہ داری زیادہ تر سکھ کسانوں کے سپرد تھی جو شعور کی اس سطح کو نہیں پہنچے تھے کہ جور و جبر کے دور میں اس کی کامیابی کی امید کی جاسکتی۔ غالباً پنجاب کی اس قیادت نے اپنی اور دشمن کی طاقت کے غلط اندازے لگائے تھے۔ اس قیادت کو عسکری تربیت یافتہ افراد کی کمی کا بھی سامنا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ انقلابی عمل کے دوران غلطیوں پر غلطیاں کرتے جارہے تھے۔ وہ اپنے جوش و خروش میں اس قدر مگن تھے اور ان کی اپنے نظریات کے ساتھ لگن اس قدر گہری تھی کہ وہ اس بات کا جائزہ نہ لے سکے کہ آیا پنجاب کے عوام عمومی طور پر کس جدوجہد کے لیے تیار ہیں اور وہ حکومت سے فوجی ٹکر لے سکتے ہیں۔

ان کی تیاری ابھی نامکمل تھی کہ انہوں نے محاذ کھول دیا۔ اگرچہ عوامی سطح پر انگریزی حکومت کے امتیازی سلوک نے نچلے طبقات میں مایوسی اور غم و غصہ کی لہر پیدا کر دی تھی لیکن یہ اس قدر شوریدہ نہ تھی کہ وہ میدان جنگ میں کود پڑتے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض بڑے زمینداروں کے علاوہ کسانوں نے بھی انگریزی حکومت کی مدد کی۔ غدر پارٹی نے بنیادی طور پر چھاپہ مار جنگ کا منصوبہ تیار کیا تھا لیکن

اپنے اس بنیادی مقصد کو پس پشت ڈال کر انہوں نے انگریز حکومت کے خلاف کھلی جنگ شروع کر دی حالانکہ انہیں کچھ پتہ نہیں تھا کہ اس جنگ کے تقاضے کیا ہیں اس کے لیے کوئی واضح حکمت عملی بھی تیار نہیں کی گئی۔

یہ بھی غالباً قیادت کی ناتجربہ کاری اور حکمت عملی سے لاعلمی کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان روانگی کے لیے جہاز پر سوار ہوتے ہی ان رہنماؤں نے جوشیلی تقریریں شروع کر دیں اور اس دوران وہ راز بھی کھول دیئے جن کا تعلق خالص جنگی اور انقلابی حکمت عملی سے تھا اس دوران وہ جس سے بھی ملے جس ملک بھی گئے انگریز حکومت کے خلاف اپنے منصوبے عام کرائے گویا وہ خفیہ منصوبے بھی عمل سے پہلے منظر عام پر آ گئے جو جنگ کے بعد بھی نہیں بتائے جاتے۔ انہوں نے کسی راز کو راز نہیں رہنے دیا۔ ہندوستان میں تنظیم سازی کے دوران بھی ان رہنماؤں نے ہر ایک کو اپنی صفوں میں خوش آمدید کہا خواہ وہ ہمدرد تھا یا خفیہ پولیس کا آدمی اس کو اپنے تمام منصوبوں سے آگاہ کر دیا۔ سی آئی ڈی ایجنٹ کرپال سنگھ پارٹی میں شمولیت کے ایک ہفتہ کے اندر اعلیٰ ترین کمیٹی کا رکن بن گیا تھا اور بابا ندھان سنگھ کی نشاندہی کے باوجود اسے عہدے سے الگ نہیں کیا گیا۔

تنظیم سازی میں بھی پارٹی رہنماؤں نے کسی بالغ نظری کا ثبوت نہیں دیا اپنی انقلابی سرگرمیوں کے دوران انہوں نے اسلحہ اور روپیہ پیسہ کی فراہمی کے لیے سان فرانسسکو میں واقع ہیڈ کوارٹر پر بہت انحصار کیا لیکن انہوں نے ایسا کوئی معتمد لیڈر وہاں نہیں چھوڑا تھا جو بروقت ان کی مدد کرتا ہر دیال نے حالانکہ رام چندر کے بارے میں شہادت کا اظہار کر دیا تھا لیکن پارٹی کے دوسرے رہنماؤں نے اس کو پورا ہیڈ آفس اور ہندوستان میں اپنی انتہائی خطرناک مہم کا عملی نگران مقرر کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ ہر ایک کو ہندوستان پہنچنے کی جلدی تھی اور اسی جوش و خروش جس کے باعث وہاں کوئی قابل اعتبار رہنما موجود نہ رہا اور شائد غدر پارٹی کے رہنماؤں کا یہ سب سے بڑا قصور تھا اصل بات بھی یہ تھی کہ ہوش مندی اور حکمت عملی سے زیادہ انہوں نے بیجا جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اور ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ کوئی فوری نتیجہ برآمد ہو جائے انہیں اپنا منصوبہ یوں لگ رہا تھا گویا وہ ہندوستان کے کسی ساحل پر اتریں گے اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک ملک کو فتح کرتے جائیں گے اور انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ برطانوی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں پر بہت انحصار کر رہے تھے یہ وہ نوجوان تھے جن کو سیاست اور نظریات کی ابجد کا علم نہیں تھا پھر بھی بعض چھاؤنیوں میں بہت کام ہوا فوجیوں نے اس بات کی حامی بھی بھری کہ بغاوت پھوٹتے ہی وہ اپنی بیرکوں سے نکل آئیں گے اور ان سے مل جائیں گے لیکن اکثر چھاؤنیوں میں ان فوجیوں کا رویہ غیر سنجیدہ تھا اور بعض مقامات پر ایسا وعدہ صرف پارٹی کے کارکنوں کو سرکاری جال میں پھنسانے کے لیے کیا گیا تھا۔

وشنو پر نگلے کی ڈیوٹی میرٹھ چھاؤنی پر تھی گرفتاری کے بعد جب پولیس نے اس پر تشدد کی انتہا کردی تو اس نے بتایا کہ پارٹی کے زیادہ تر رہنما ہندوستانی فوجیوں کے وعدوں پر ایمان کی حد تک یقین رکھتے تھے اور ان کی سکیم کی کامیابی کا زیادہ تر انحصار انہیں پر تھا۔ان چھاؤنیوں میں سے لوگ پارٹی کے ہیڈکوارٹر میں آکر یقین دلاتے کہ وعدہ ضرور پورا ہوگا اور بغاوت کی تیاری مکمل کرلی گئی ہے لیکن بعد کے حالات وواقعات نے ثابت کیا کہ وہ جھوٹ بول رہے تھے کئی ایک لوگوں پر اب یہ شبہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ وہ سرکار سے ملے ہوئے تھے اور غدر پارٹی کے رہنماؤں کے ساتھ وعدے وعید محض ان کو پھنسوانے کے لیے کئے گئے تھے۔ پر نگلے ہی کے بقول اسے یقین تھا کہ وہ میرٹھ میں قدرے بہتر کارکردگی دکھا سکے گا لیکن "مجھے اب محسوس ہوتا گویا یہ میری بیوقوفی تھی میں نے نادر خان پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی انحصار کر لیا تھا وہ اور اسکے ساتھ بے حد جوش وخروش دکھایا کرتے تھے لیکن ضرورت پڑنے پر انہیں سب سے پہلے حکام کے عتاب کا سامنا کرنا پڑا میں یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کی باتوں میں اس قدر زیادہ نہیں آنا چاہیے تھا۔"

ایسا بھی ہوا کہ پارٹی کے چیدہ چیدہ رہنما انقلابی کام شروع کرنے سے قبل ہی غائب ہو گئے اور پھر ان کی جگہ ایسے لوگوں نے لے لی جن کی وفاداریاں مشکوک تھیں بعد میں ایسا ہی ثابت ہوا کہ وہ سرکاری ایجنٹ تھے بعض مواقع پر تو خود پارٹی رہنماؤں نے غداری کا ثبوت دیا جونہی یوم عمل آیا انہوں نے انٹیلی جینس کے ڈائریکٹر جنرل سی آر کلیولینڈ کو براہ راست یا بالواسطہ ساری سکیم سے آگاہ کر دیا۔ مئی 1916ء میں کلیولینڈ نے ایک رپورٹ میں لکھا "انہیں (غدر پارٹی کو) محسوس ہو رہا تھا گویا میرٹھ میں انہیں سب سے زیادہ کامیابی ہوگی لیکن اس کامیابی کا زیادہ تر دارومدار اس پٹھان نان کمشنڈ آفیسر پر تھا جو انہیں بتایا کرتا تھا کہ بہت سے ہندوستانی فوجی بغاوت کیلئے تیار بیٹھے ہیں لیکن بعد میں ثابت ہوا کہ یہ محض فریب تھا جس کا مقصد انہیں جال میں پھنسانا تھا ان کے پاس اسلحہ کی کمی تھی اور مناسب فنڈز بھی نہیں تھے ان تمام باتوں کا نتیجہ صرف یہ تھا کہ وہ کوئی بڑی تحریک شروع کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ایک اور وجہ بھی تھی کہ تقریباً سبھی لوگوں (غدر پارٹی سے متعلق) کو دکھاوے اور بیان بازی کا بے حد شوق تھا اور یہ انقلابی روح کے خلاف ہے کوئی بھی انقلابی اپنی کسی سکیم کے بارے دوسروں پر اس قدر انحصار نہیں کرتا جیسا انہوں نے کیا۔"

پارٹی کی قیادت ضرب لگانے کے بہتر موقع کا صحیح انتخاب بھی نہ کرسکی۔ وہ ایسے لوگ تھے جن کے دل برطانوی سامراج کے خلاف نفرت سے معمور تھے لیکن دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ صورتحال کا اندازہ لگانے میں ناکام رہے۔ مثال کے طور پر لالہ لاجپت رائے غدر تحریک کے مخالف تھے اور جرمنوں کی مدد کے بارے میں بھی انہیں شبہات تھے انہیں جرمنی کی حکومت سے رقم اور اسلحہ حاصل

کرنے پر اعتراض نہیں تھا لیکن وہ اس کے فوری اور ناعاقبت اندیش استعمال کے خلاف تھے ان کا خیال تھا اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ اسلحہ حاصل کر کے کسی جگہ سنبھال لیں اور مناسب موقع آنے پر استعمال کریں۔ انڈین نیشنل کانگریس اور چیف دیوان خالصہ کے رویوں نے بھی غدر پارٹی کے مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ ڈالی پارٹی نے برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا تھا اور یہ دونوں تنظیمیں لوگوں کو تلقین کر رہی تھیں کہ جنگ عظیم اول میں برطانیہ کا ساتھ دیں انہیں سیاسی تنظیموں کی وجہ سے کئی کسان برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کیلئے بے قرار تھے۔

ان حالات میں جب ملک کی بڑی سیاسی جماعتیں ایک خاص فضا قائم کر چکی تھیں غدر پارٹی کا جرمنوں سے مدد لینے کا فیصلہ بھی غلط ثابت ہوا اس سے نہ صرف عوام میں بددلی پھیلی بلکہ خود پارٹی کے اندر بھی دو آراء پیدا ہوئیں اور پہلی مرتبہ پارٹی دو گروپوں میں تقسیم ہوئی ان میں ایک گروپ کو جرمنی کے ایجنٹ کہا گیا ان کے مخالفوں کا نظریہ یہ تھا کہ جرمنوں سے مدد کا مطالب یہ ہوگا کہ ایک سامراج کی جگہ دوسرے سامراج کو لانے کی کوشش کی جائے ایک موقع پر تو ہردیال نے بھی جرمنوں کے ساتھ تعاون کی کڑی مخالفت کی۔

خشونت سنگھ نے غدر پارٹی کی ناکامی پر اپنی کتاب میں ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "ان میں تنظیم کی کمی تھی۔ تجربہ نہیں تھا۔ اسلحہ بے حد ناکافی تھا وہ کٹر انقلابیوں کی طرح ہر معاملے کو خفیہ رکھنے کے وصف سے بھی بے بہرہ تھے۔ جوش و خروش ضرورت سے زیادہ تھا۔ وہ تقریریں بہت کرتے تھے ہر خفیہ بات حتیٰ کہ جنگی حکمت عملی وقت آنے سے پہلے عام کر دیتے تھے۔ جرمنی سے مدد کے بارے میں دو گروپوں میں تقسیم کے بعد مجموعی طور پر پارٹی اور جرمنی کی حکومت کے درمیان کشیدگی پیدا ہو چکی تھی۔ برطانوی انٹیلی جنس کی کارکردگی شاندار تھی اس نے بڑی چابکدستی سے اپنے جاسوس پارٹی میں داخل کئے اور پھر پنجاب پولیس کا وحشیانہ تشدد جو اس حد تک بڑھا کہ نواب علی' جودھ سنگھ اور مولا سنگھ جیسے رہنما بھی تمام راز بتانے پر مجبور ہو گئے غدر پارٹی کی ناکامی کسی ایک وجہ سے نہیں تھی بلکہ ان تمام وجوہات نے مل کر ان کی تحریک کو ناکامی کے سمندر میں غرق کر دیا۔"

گو غدر پارٹی کی تحریک ناکام رہی لیکن اس نے چند کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ اس نے پنجاب میں ایک نئی سیاست کی بنیاد ڈالی۔ اس نے جدوجہد آزادی کو بین الاقوامی سطح پر اس طرح متعارف کرایا کہ دوسرے ممالک میں بھی ان کے لیے ہمدردیاں پیدا ہوئیں۔ افغانستان' چین' ترکی' سوئٹزرلینڈ' انگلستان' امریکہ' کینیڈا' میکسیکو' آئرلینڈ' ملایا اور جاپان میں کئی تنظیمیں انقلابیوں کی ہمدرد بنیں۔ انہوں نے باغیانہ تحریک کو بیرون ممالک سے ہندوستان یعنی اصل مرکز میں منتقل کیا ان انقلابیوں کے آنے سے پنجاب اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں عوام کا سیاسی شعور بھی بڑھا کیونکہ یہ لوگ مختلف ممالک میں

انقلابی اور ترقی پسند تحریکوں کے ساتھی تھے ان سب سے بڑھ کر یہ کہ غدر پارٹی کے رہنماؤں اور کارکنوں نے لازوال قربانیاں دیں جس سے خصوصاً نوجوان ذہن بے حد متاثر ہوئے۔ ان رہنماؤں نے جس طرح عدالتوں میں اپنے مقصد کی سچائی اور اس پر ایمان کا ذکر کیا۔ خوشی سے پھانسی کے پھندے پر جھول گئے۔ پولیس کا وحشیانہ تشدد برداشت کیا۔ پولیس کے پہرے میں چلتی ٹرینوں سے کودے۔ جزائر انڈیمان میں جیل حکام کے ساتھ قانونی جنگ لڑی اور اس طرح کئی ایسے واقعات ہیں جن کی بنیاد پر غدر پارٹی کے لوگ لوک داستانوں کے کرداروں کی طرح مشہور ہوئے لوگ ان کی بہادری کے قصے کہانیوں کی طرح سُنایا کرتے۔ انہوں نے ملکی سیاست کے دھارے کو یوں تبدیل کیا کہ آئندہ آنے والے سالوں میں کانگریس کو بھی جارحانہ پالیسی اختیار کرنا پڑی۔ غدر پارٹی نے تنظیم سازی کے میدان میں بھی نیا رُخ متعارف کرایا ان کی پارٹی سیکولر تھی اور اس میں شامل ہونے کے لیے کوئی مذہبی حوالہ درکار نہ تھا یہ الگ بات ہے کہ اس کے ارکان کی بڑی تعداد سکھ فرقہ سے تعلق رکھتی تھی لیکن یہ اتفاق بھی نہیں کیونکہ امریکہ اور کینیڈا میں مقیم اکثریت ہندوستانی سکھ قوم سے تعلق رکھتے تھے ان میں انقلابی جذبہ بھی دوسروں سے زیادہ پایا گیا یہی وجہ ہے کہ غدر پارٹی کے 95 فیصد ارکان کا تعلق اس قوم سے تھا۔ اگرچہ برطانوی حکومت نے ایک سے زیادہ مرتبہ ان کو مذہبی اور فرقہ کی بنیاد پر تقسیم کرنے کی کوشش کی لیکن اس تنظیم کا کردار آخر تک غیر مذہبی غیر فرقہ وارانہ اور سیکولر رہا۔

+

سیاست میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا خصوصاً جب کہ یہ مقصد ظاہر کر دیا گیا ہو کہ فرقہ وارانہ قوتوں کا توڑ کر کے ایک نیا سیاسی توازن پیدا کرنا مقصود ہے۔

لیکن ان تمام اقدامات نے انگریز دشمن جذبات کو مزید ہوا دی اور حکومت کے جبر و تشدد میں بھی اس درجے کا اضافہ ہوا۔ جب ڈنڈا فورس قائم ہوئی تو صوبے کی انتظامیہ نے اس قدر شدید ردعمل ظاہر کیا کہ جلیانوالہ باغ میں نہتے لوگوں کو مشین گنوں سے بھون کر رکھ دیا گیا اور جب ببر اکالی نے غدر پارٹی کی طرح برطانوی فوج میں گھات لگانا چاہی تو حکومت نے اس تشدد سے جوابی کارروائی کی اور گوردوارہ سدھار ایجی ٹیشن کو اپاہج کر دیا لیکن کسی قسم کا جبر انقلابی سرگرمیوں کے آگے بند نہ باندھ سکا۔

ببر اکالی جتھہ پہلے پہل 1921ء کے موسم گرما میں منظر عام پر آیا اس کے قیام کا مقصد سکھوں پر زیادتیوں کا بدلہ لینا تھا اس کی تنظیمیں ہوشیار پور اور جالندھر میں نمایاں تھیں۔ حکام نے انہیں غدر پارٹی کی سرگرمیوں کا تسلسل گردانا کیونکہ اس کے ارکان زیادہ تر بیرون ملک سے آئے تھے اور انہی کی طرح 32 بور کے ریوالور اور ماؤزر استعمال کرتے تھے۔ یہ جتھہ ننکانہ صاحب اور ترن تارن میں سکھوں پر ظلم و تشدد کا ردعمل تھا ہوشیار پور میں 21 اپریل 1921ء کو ہونے والی ایک تعلیمی کانفرنس میں سکھوں کے بعض گروپ یکجا ہوئے پھر ان کا ایک اجلاس ہوا ان میں ماسٹر موتا سنگھ، کشن سنگھ بیرنگ دہلی کے امر سنگھ اور کوٹ کے امر سنگھ، بیلا سنگھ اور توتا سنگھ نمایاں تھے۔ انہوں نے ہی ببر اکالی جتھہ کی بنیاد رکھی اور اس گروپ کو بعد ازاں سکھوں کی انقلابی تحریک کا سرچشمہ قرار دیا گیا۔

اجلاس میں ایک فیصلہ یہ بھی کیا گیا کہ بیلا سنگھ اور گنڈھا سنگھ ننکانہ صاحب میں سکھوں کو قتل کرنے والے سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر براؤننگ کو قتل کر دیں گے۔ مقررہ روز یہ دونوں ایس پی کی رہائش گاہ کے قریب پہنچے مگر انہیں گرفتار کر لیا گیا کیونکہ ایس پی کے سٹاف کو ان کی حرکات و سکنات پر شبہ گزرا تھا۔ بعد ازاں پولیس تشدد کے نتیجے میں دونوں نے تمام سازش بے نقاب کر دی اس پوچھ گچھ کے بعد پولیس نے امر سنگھ، نرائن سنگھ، توتا سنگھ، چھتر سنگھ، چنچل سنگھ، ٹھاکر سنگھ اور شکر سنگھ کو حراست میں لے لیا اور ان پر مشہور زمانہ اکالی سازش کیس چلایا گیا۔ ان کو مختلف المیعاد قید کی سزائیں سنائی گئیں ان میں سے صرف موتا سنگھ اور کشن سنگھ فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔

ببر اکالی جتھہ کا روح رواں کشن سنگھ تھا اور یہ سارا گروپ گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفہ کے مخالف تھے کیونکہ انہیں یقین تھا کہ انگریز کی عدالت انصاف نہیں کر سکتی۔ جتھہ کے لوگ بعد ازاں جگہ جگہ سفر کرتے اور لوگوں کو ہتھیار اٹھانے کی تلقین کرتے رہے وہ سکھوں کے گروؤں کی قربانیوں اور روس میں بالشویک انقلاب کی مثالیں دیکر سکھوں کو یہ بتاتے کہ قربانی دیئے بغیر وطن کی آزادی ممکن نہیں اور اس

کے لیے مسلح جدوجہد ضروری ہے۔ اس مرحلے پر انہوں نے جتھہ کی جگہ گروپ کا نام چکرورتی رکھا اور اس کا مقصد نمبرداروں، سفید پوشوں اور پولیس کے مخبروں کے دلوں میں دہشت پیدا کرنا تھا یہ نام نومبر 1921ء میں تجویز ہوا لیکن بعد میں انہوں نے ببر کا نام اپنا لیا۔ کشن سنگھ 35 ویں سکھ بٹالین میں حوالدار تھا جو مارشل لاء کے دنوں میں حکومت کے تشدد سے بے حد متاثر ہوا اور اپنے یونٹ میں انگریز کے خلاف مہم شروع کردی۔ اسے گرفتار کر کے کورٹ مارشل کیا گیا اور پھر ملازمت سے الگ کردیا گیا۔

اسی دوران پولیس پوری طرح خبردار ہو چکی تھی اور سکھوں کی اس تحریک کو کچلنے کے لیے خصوصی انتظامات کر رہی تھی سرکاری ایجنٹ لوگوں کو ان کے اجلاسوں میں جانے سے روکتے اور دیہات میں لوگوں کو ہدایت کرتے کہ جتھہ کے لوگوں کو پانی تک نہ دیں اور نہ ہی انہیں پناہ لینے کی اجازت دیں۔

مقامی پولیس کی مدد کے لیے سی آئی ڈی سٹاف کا ایک خصوصی گروپ متعین کیا گیا جس کا مقصد جتھہ کے ارکان کی گرفتاری کے لیے خاص حکمت عملی تیار کرنا تھا۔ اس تمام تر انتظام کے باوجود پولیس جتھہ کے حوالے سے کوئی بڑی معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہی کیونکہ غریب لوگوں خصوصاً کسانوں میں جتھہ کی مقبولیت بڑھ رہی تھی اور اسی شرح سے انگریز کے خلاف نفرت میں اضافہ بھی ہو رہا تھا۔ 19 مارچ 1921ء کو سنگوال گاؤں میں ایک اجلاس میں جتھہ کے رہنماؤں نے پولیس مخبروں اور ایجنٹوں کو سخت ترین وارننگ دی کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں بصورت دیگر سزا کے طور پر ان کے ناک اور کان کاٹ دیے جائیں گے۔ اس اجلاس میں سکھ فوجیوں اور طلبا کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ سکھ فوجیوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے افسروں کو قتل کر کے ہتھیار ببر اکالی جتھہ کے حوالے کردیں۔ جون 1922ء میں ماسٹر موتا سنگھ کی گرفتاری نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور جتھہ کی سرگرمیاں تیز تر ہو گئیں۔

اگست 1922ء میں باضابطہ طور پر ببر اکالی پارٹی کی تشکیل کی گئی اور اس کی ایک ورکنگ کمیٹی بھی چنی گئی۔ کشن سنگھ کو کمیٹی کا جتھے دار منتخب کیا گیا۔ دلیپ سنگھ کو سل کمیٹی کے سیکرٹری اور بابو سنتا سنگھ خزانچی بنے۔ کمیٹی کے دوسرے ارکان کرم سنگھ جھنگو، کرم سنگھ دولت پور اور اودھے سنگھ تھے۔ کرم سنگھ دولت پور کو پارٹی کے رسالہ کی اشاعت کی ذمہ داری بھی سونپی گئی اور جتھیدار کشن سنگھ کو اس کا مددگار بنایا گیا کرم سنگھ دولت پور کی ایک اور ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ اودھے سنگھ کی مدد سے جالندھر اور اس کے قصبوں میں پولیس مخبروں کی نشاندہی کرے گا بعد میں جتھے دار کشن سنگھ خود ان مخبروں کو سزا دینے کیلئے جالندھر گیا۔ ستمبر سے اخبار کی اشاعت کا کام بھی شروع ہو گیا اس کا نام ببر اکالی دوآبہ اخبار تھا۔ سائیکلوسٹائل مشین پر اس کی چھپائی ہوتی تھی اور اسی حالت میں یہ امرتسر اور دیگر علاقوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ

قانونی تقاضے پورے کرنے کے لیے اس پر پرنٹ لائن بھی شائع کی جاتی جس میں لکھا جاتا یہ اخبار "سفری" پریس سے شائع ہوا کبھی یہ اخبار "اڈارو" (اڑنے والا) پریس میں بھی چھپتا۔ پرنٹ لائن ایک ایسی ستم ظریفی تھی جس کا مقصد حکومت کا تمسخر اڑانا تھا یا پھر یہ کہ اخبار حالت سفر میں شائع کیا جاسکتا ہے اخبار کی پیشانی پر گرنتھ صاحب کا یہ اشلوک شائع ہوتا۔

سورے سو پہچانئے جو لڑے دن کے ہیت
پرجا پرجا کٹ مرے کبھونہ چھڈے کھیت

(حقیقی بہادر وہ ہے جو اپنے مذہب کی حفاظت کرتا ہے خواہ ایک ایک کر کے اس کے اعضا ہی کیوں نہ کٹ جائیں۔ وہ کبھی میدان نہیں چھوڑتا)

اس اخبار میں جو در حقیقت ایک پمفلٹ کی طرح شائع ہوتا حکومت کی اقتصادی پالیسیوں اور ان کے نتیجے میں عوام کی بدحالی کو خاص طور پر نمایاں کیا جاتا ایک مضمون میں یہ لکھا کہ جبر و تشدد صرف یہ نہیں کہ پولیس تھانے میں لیجا کر ڈنڈے مارے لوگوں سے روٹی چھین لینا اس سے کہیں بڑا تشدد ہے۔ اس میں اکالی پارٹی شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی اور انڈین نیشنل کانگریس کے عدم تشدد کے فلسفہ پر کڑی تنقید کی جاتی اور لوگوں کو کہا جاتا کہ یہ سب بزدلی کے کام ہیں اصل اور بہادری کا کام یہ ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے اور انگریز صرف اس سلوک کا مستحق ہے کہ اس پر آگ برسائی جائے اس کی وضاحت یہ کی گئی کہ غیر ملکی حکمرانوں کو قتل کر دیا جائے تا کہ ایک آزاد حکومت کا قیام ممکن ہو۔ اس پراپیگنڈے کے ساتھ ساتھ اس وقت جتھہ کے لوگوں کی بہادری بھی ضرب المثل بنی جس طریقہ سے انھوں نے ایک سے زائد مرتبہ پولیس کو چکمہ دے اپنی گرفتاری کو ٹالا اس نے انہیں لوگوں کی نظروں میں ہیرو بنا دیا یہی وجہ ہے کہ کشن سنگھ اور اس کے جتھہ کو کسی بھی سیاسی تنظیم سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ دسمبر 1922ء میں ورکنگ کمیٹی کے ایک خفیہ اجلاس میں یہ طے پایا گیا کہ ناک اور کان کاٹنے کی بجائے پولیس کے مخبروں اور دیگر سرکاری ایجنٹوں کو قتل کر دیا جائے کیونکہ وہ جتھہ کے لوگوں کی نشاندہی کر کے ایک سنگین قومی جرم کا ارتکاب کر چکے تھے۔ لیکن یہ فیصلہ بھی ہوا کہ کس کو کیسے قتل کیا جائے گا۔ اس کا فیصلہ صرف کمیٹی یا اس کا قائم کردہ با اختیار گروپ کرے گا اور اخبار میں باقاعدہ طور پر اس کا اعلان کیا جائے گا کہ کس کو کیسے قتل کیا جائے۔

اس کے نتیجے میں چند روز بعد کچھ ناموں کا اعلان کیا گیا لیکن یہ محض دہشت زدہ کرنے کی کارروائی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جتھہ نے اپنے فیصلہ پر عملدرآمد نہیں کیا ہوتا یہ تھا کہ بعض فرضی

نام شائع کیے جاتے لیکن نشانہ کسی اور کو بنایا جاتا اس کا آغاز محکمہ انہار کپور تھلہ کے ریٹائرڈ ذیلدار بشن سنگھ کو 10 فروری 1923ء کے روز اس کے گاؤں کے نزدیک قتل کرنے سے ہوا۔ حکومت اس قتل پر بہت خوفزدہ ہوئی کیونکہ اس کی مخبری کا کام متاثر ہوتا نظر آ رہا تھا۔ حکومت نے اب ہر گاؤں میں اپنے لوگ پیدا کر لیے تھے اور ان کا نام حد درجہ راز میں رکھا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ حکومت نے ببر اکالی جتھہ کے رہنماؤں کی گرفتاری کے لیے انعام کا اعلان بھی کیا۔ اس کے نتیجے میں جتھے دار کشن سنگھ کو 26 فروری 1923ء کو گرفتار کر لیا گیا اسے اسی ہی کے ایک رشتہ دار کابل سنگھ کی مخبری پر حراست میں لیا گیا وہ کشن کو اپنے گھر لے گیا کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی گھر پہنچ کر کابل نے کشن کا علاج کرانے کے بجائے پولیس کو اطلاع دے دی۔ اس دوران تین اور لوگ بھی گرفتار ہوئے جس پر جتھہ والے شدید غصہ میں آ گئے۔ انہوں نے بدلہ لینے کے لیے کئی قتل کیے اور ڈکیتیوں کی وارداتیں کیں۔ 19 مارچ کو ایک پولیس کانسٹیبل کو اس کے ہوشیار پور میں اس کے گاؤں کے نزدیک اس لیے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا کہ جتھہ والوں کو اس پر جتھے دار کشن سنگھ کی گرفتاری میں مدد دینے کا شبہ تھا۔ 27 مارچ کو ہوشیار پور ہی کے ایک گاؤں کے ایک نمبردار کو اس کے گھر میں گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ 17 اپریل کو جتھہ کے چار لوگوں نے سابق صوبیدار گینڈا سنگھ کو جالندھر کے قریب اس کے گاؤں میں گولی مار دی۔ قتل کی ان وارداتوں کے بعد گرفتاریوں کا نیا سلسلہ شروع ہوا کئی بے گناہ لوگ بھی پکڑے گئے اور ان کو شدید پولیس تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مرحلے میں جتھہ کے رہنماؤں نے محسوس کیا کہ وسیع پیمانے پر ان گرفتاریوں کی وجہ سے وہ لوگوں میں غیر مقبول ہو جائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ جتھہ میں سے تین لوگوں کے بارے میں اعلان کیا جائے کہ سب قتل انہوں نے کیے ہیں اس لیے بے گناہ لوگوں کو چھوڑ دیا جائے۔ ایک خفیہ اجلاس میں یہ دلیل پیش کی گئی کہ جس طرح گورو گوبند سنگھ نے سکھ مذہب کو بچانے کے لیے پانچ سر طلب کیے تھے جتھہ والے اپنے تین لوگوں کو بے گناہ عوام کو بچانے کے لیے پیش کریں گے۔ سب سے پہلے رسالے کے ایڈیٹر کرم سنگھ نے اپنا نام پیش کیا اور پھر دھنا سنگھ، بھبھلپو را اور اودے سنگھ رام گڑھ نے بھی پیش کش کی لیکن فیصلہ کے مطابق انہیں اپنے نام تو قتل کے ذمہ دار افراد کی حیثیت سے شائع کرانے تھے لیکن حتی الامکان گرفتاری سے بچنا تھا کیونکہ ان کا نظریہ تھا کہ پھانسی پر لٹکنے کے بجائے لڑ کر مرنا بہتر ہوگا۔ ان تینوں نے گورنر پنجاب کو ایک کھلا خط لکھا انہوں نے اکالیوں پر ظلم وستم اور اپنے مذہبی مقامات کی بے حرمتی کے خلاف تلوار اٹھائی تھی اور انہوں نے ہی ذیلدار بشن سنگھ، نمبردار بوٹا سنگھ اور اس کے پوتے لابھ سنگھ کو قتل کیا ہے انہوں نے اس خط میں یہ بھی لکھا کہ وطن کے ایسے غداروں کی جنہوں نے پولیس کو مخبری کی فہرست بہت طویل ہے لیکن بہت جلد انہیں بھی ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ خط میں یہ بھی لکھا گیا کہ ان کے ضمیر کی

عدالت نے جو فیصلہ سنایا ہے اس کے تحت غداروں کو قتل کر دیا جائے گا یا ان کے اعضا کاٹ دیے جائیں گے اور اس کے علاوہ انہیں جرمانہ بھی ادا کرنا ہوگا۔ اس خط پر ان تینوں کے دستخط تھے اس کے ایک ماہ کے اندر حکومت کے پانچ ایجنٹوں کو قتل کر دیا گیا۔ اس سے خصوصاً جالندھر اور ہوشیاپور کے اضلاع میں خوف کی لہر پھیل گئی اور کئی مخبروں نے اپنے عہدوں سے استعفے دے دیے حکومت بھی ایک مرحلہ پر بے بسی کے عالم میں نظر آئی جب اکثر ایجنٹوں نے کام جاری رکھنے سے معذرت کر لی لیکن حکومت نے از سر نو صف بندی کی پولیس کو نئے احکامات جاری کیے گئے نگرانی مزید کڑی ہوئی حتیٰ کہ جتھہ کے بعض کمزور کارکنوں کو مخبری کر کے اپنی جان بچانے کی پیشکش بھی کی گئی۔ ان میں سے ایسا ہی ایک کمزور دل انوپ سنگھ تھا جو کرم' اودے اور بشن کو لے کر ڈھیلی سے اپنے گاؤں جیلی جا رہا تھا جب وہ گاؤں پہنچا تو اس نے تینوں کو سہ پہر تک آرام کرنے کا مشورہ دے کر ایک کمرے میں بند کر دیا ان کا اسلحہ بھی باہر ہی رہ گیا جو انوپ نے کسی اور جگہ منتقل کر دیا بعد میں اس نے پولیس کو اطلاع دے دی سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی خود پولیس کے ایک دستہ کی قیادت کرتے ہوئے فوری طور پر جیلی پہنچا۔ پولیس ان تینوں کو زندہ گرفتار کرنا چاہتی تھی وہ تینوں پولیس کو دیکھتے ہی بھاگ نکلے ان کا رخ دور نظر آنے والے ایک گوردوارہ کی طرف تھا لیکن اس کے راستے میں ایک ندی بھی پڑتی تھی جسے وہ جلدی میں دیکھ نہیں پائے جونہی وہ بھاگے سمتھ نے انہیں ہتھیار پھینک دینے کی وارننگ دی اتفاق سے کرم سنگھ کے پاس اس کی بندوق موجود تھی جبکہ باقی دونوں نہتے تھے کرم اپنی بندوق سے پولیس پر فائرنگ کرتے ہوئے دونوں ساتھیوں کے ہمراہ ندی میں گھس گیا اس پر پولیس نے فائرنگ شروع کر دی اس میں کرم اور اودے موقع پر ہی ہلاک ہو گئے بشن سخت زخمی ہوا اور جب پولیس اسے پکڑنے کے لیے آگے بڑھی تو اس نے کرپان نکال لی اس پر پولیس نے پھر گولی چلا دی اور اودے سنگھ بھی مارا گیا وہ اپنے وعدے کے کس قدر سچے اور پکے تھے کہ وہ گرفتاری نہیں دیں گے اور آخر تک لڑیں گے۔ دھنا سنگھ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا کیونکہ اسے بھی جتھے کے ایک کمزور دل کارکن جوالا سنگھ نے مخبری کر کے پکڑوانا چاہا۔ دھنا سنگھ اس ساتھی کے گھر سو رہا تھا کہ جوالا سنگھ نے پولیس کو اطلاع دے دی پولیس نصف شب کو اس کے گھر پہنچ گئی۔ پولیس کے دستے کی قیادت مسٹر مارٹن کر رہا تھا جب پولیس نے دروازہ توڑا اور دھنا کو گرفتار کرنا چاہا تو اس نے ان پر دستی بم پھینک دیا اس بم کے دھماکے میں دھنا سنگھ' مسٹر مارٹن اور چھ مزید پولیس والے ہلاک ہوئے۔

کچھ اسی طرح کا ایک اور واقعہ یہ تھا کہ ایک مخبر نے پولیس کو اطلاع دی کہ بنتا سنگھ' جوالا سنگھ اور وریام سنگھ ڈھگا مندرا گاؤں کے ایک مکان میں موجود ہیں پولیس نے اس گھر کو گھیرے میں لے لیا اور ان ببر اکالیوں کو خبردار کیا کہ وہ خود کو ان کے حوالے کر دیں تینوں اکالیوں نے گرفتار ہونے سے انکار کر دیا

اور فائرنگ شروع کر دی ادھر پولیس نے بھی فائرنگ شروع کر دی یہ جنگ کئی گھنٹے جاری رہی اور اس میں پولیس والوں کا جانی نقصان بھی ہوا۔ پولیس نے اشتعال میں آ کر گھر پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی اور وریام سنگھ نے ایک دیوار میں راستہ بنانا شروع کر دیا اسی دوران آگ کے شعلوں نے بنتا سنگھ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ زندہ جل مرا اور وریام سنگھ بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ان اکالیوں نے موت کے منہ میں جس بہادری کا مظاہرہ کیا اس کی بنیاد صرف حب الوطنی کے جذبات تھے ان کی اس مردانہ وار جرأت نے پنجاب کے دیہی علاقوں میں انہیں بہادری کی داستانوں کا ہیرو بنا دیا اور لوگ مدتوں تک ان کے قصے سنتے سناتے رہے۔ اس کے برعکس پولیس کے دل میں ببر اکالیوں کی دھاک بیٹھ گئی اور جب بھی مندرا گاؤں کے قصہ زبان زد عام ہوتا پولیس کی صفوں میں خوف کی لہر دوڑ جاتی۔

حکومت نے اس واقعہ کے بعد اپنی سختیوں میں اضافہ کر دیا اور ہر وہ اقدام کیا جس سے ببر اکالی تحریک کا خاتمہ ممکن تھا۔ انہیں اقدامات کے تحت 186 سکھوں کو حراست میں لیا گیا اور عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان میں سے 25 افراد وہ ہیں جنھوں نے تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں کام کیا اور جو دہشت گردی کے واقعات میں ملوث رہے تھے اور جنھوں نے برطانوی افسروں کا قتل کیا۔ حکومت کے ان اقدامات کے بعد ببر اکالی تحریک کے باقی کارکن یا تو زیر زمین چلے گئے یا فرار ہو گئے ان میں سے ایک بڑی اکثریت ضلع ہوشیار پور میں شوالک کی پہاڑیوں پر چڑھ گئے یہ چھوٹا سا پہاڑی سلسلہ تقریباً 70 میل لمبا اور 10 میل چوڑا تھا یہ ایک دشوار گزار سلسلہ تھا جہاں بے شمار ایسے مقامات تھے جہاں چھپنا آسان تھا یہاں آبادی بے حد قلیل تھی اور راستے تنگ تھے یہی وجہ تھی کہ پولیس کیلئے اپنے بھاری دستوں کو اس پہاڑی سلسلہ میں نقل و حمل میں بے حد دشواری پیش آئی۔ بعد کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ببر اکالی نوجوان پہاڑیوں سے نیچے اترتے اور اچانک پولیس یا سرکاری تنصیبات پر حملہ کرتے اور واپس پہاڑیوں پر چڑھ جاتے گویا ببر اکالی ایک چھاپہ مار جنگ شروع کر چکے تھے ان کا نشانہ عموی طور پر پولیس اور اس کے مخبر ہوتے لیکن کچھ عرصہ گزرنے کے بعد حکومت نے ان پہاڑیوں میں آپریشن کا فیصلہ کیا۔ سی آئی ڈی کے خصوصی تحقیقاتی عملہ کے علاوہ تقریباً 200 پولیس ملازمین پر مشتمل خصوصی دستہ تیار کیا ان میں 50 ریگولر پولیس کے جوان تھے اور 150 وہ تھے جن کو پہاڑی علاقوں میں دشمن کے خلاف لڑنے کی تربیت حاصل تھی ان میں سے بھی 50 وہ پولیس والے تھے جو اپنے گھوڑے لیکر پہاڑیوں پر چڑھ جانے میں مشاق تھے۔ پولیس کے اس خصوصی دستہ کو فوج کے توپ خانے کی مدد حاصل تھی۔ اس کے علاوہ 250 انفنٹری بھی اس کے پیچھے تھی اور اسے بکتر بند گاڑیوں کی سہولت حاصل تھی اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ برطانوی فضائیہ کے طیارے بھی کبھار ان پہاڑیوں پر پرواز کرتے تا کہ ببر اکالیوں کو خوفزدہ کیا جا سکے۔ قانونی محاذ پر بھی

اکالیوں کے خلاف اقدامات کیے گئے ببر اکالی جتھہ کے خلاف قانون دہشت گرد تنظیم قرار دیا گیا اور 1861 کے ایکٹ کے تحت مقامی فوجی اور پولیس حکام کو اختیار دیا گیا کہ وہ جب چاہیں اپنی مدد کے لیے خصوصی رضا کار بھرتی کر سکتے ہیں۔

اس کے بعد آپریشن شروع ہو گیا اکالیوں نے ہر جگہ مزاحمت کی اور بہادری کی داستانیں رقم کیں لیکن برطانوی پولیس کے اس قدر منظم اقدامات کے بعد ان کے لیے بچنے کے امکانات بہت کم تھے اکثر مارے گئے 91 گرفتار ہوئے اور ان کے خلاف مشہور اکالی مقدمہ شروع کیا گیا اس دوران تشدد کی وجہ سے تین نوجوان جیل میں مر گئے۔ 12 اکالیوں کو عمر قید کی سزا سنائی گئی اور 38 کو دیگر مختلف المیعاد قید کی سزا دی گئی۔ بنتا سنگھ، کشن سنگھ، دلیپا دھنیا، دھرم سنگھ اور دلیپ سنگھ کوسل کو موت کی سزا سنائی گئی اور 27 فروری 1926ء کو انہیں پھانسی پر چڑھا دیا گیا جن اکالیوں کو بھی قید کی سزا سنائی گئی انہوں نے جیل کے اندر جدوجہد جاری رکھی وہ قیدیوں کے لئے سہولتوں اور سیاسی قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کے حوالے سے صدائے احتجاج بلند کرتے رہے اور اس کے لیے انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور قید تنہائی میں رکھا گیا ان میں سے بعض نے بھوک ہڑتال بھی کی لیکن ان کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا۔

ببر اکالی تحریک 1921 اور 1926 کے دوران ایک بڑی لیکن قلیل العمر تحریک کے طور پر ابھری۔ لیکن اس دوران سکھ نوجوان نے وطن اور آزادی کی خاطر بہادری کی ایسی داستانیں رقم کی جن کا پنجاب کے دیہی علاقوں میں خاص طور پر بیحد اثر ہوا ان میں سے بعض افراد قومی ہیرو کے طور پر ابھرے خصوصی طور پر بنتا سنگھ جس کو برطانوی حکومت نے باغیوں کا سرغنہ قرار دیا اور جسے پھانسی پر چڑھایا گیا بنتا سنگھ لوک داستانوں کا ہیرو بنا اس پر گیت لکھے گئے جن میں ایک یہ بھی تھا...... بنتا سنگھ دھمے دا لنگ چلو دے ندی تر جاوے (دھمے دا گاؤں کا بنتا سنگھ دھرتی کا وہ بہادر سپوت ہے جو ہر مشکل میں کمر کس لیتا ہے اور جس کے لئے کوئی مشکل نہیں رہتی وہ تو طوفان ندی سے بھی سر اٹھا کر گزر جاتا ہے) اس کے علاوہ ہر گاؤں کے لوگوں نے ان اکالیوں میں سے اپنے اپنے ہیرو چن لیے تھے اور بڑے فخر کے ساتھ ان کی بہادری کی داستانیں سنائی جاتیں اس کے برعکس شرومنی گوردوارہ پر بندھک کمیٹی نے کئی بار ببر اکالی تحریک سے لاتعلقی کا اظہار کیا متعدد بیانات میں کمیٹی نے اکالیوں کو دہشت گرد قرار دیا اور کہا کہ ان کی ایسی کارروائیوں سے پنجاب کے لئے سیاسی مشکلات میں اضافہ ہوا ہے اور وہ ہر طرح کی سرکاری سختیوں کے ذمہ دار ہیں اور یہ سب بیانات حکومت کی ایما پر جاری کئے جاتے تاہم کمیٹی کچھ بعد از اں قیدی اکالیوں کے لئے کام بھی کیا حکومت کے ساتھ ان کے ایک معاہدے کے بعد بہت سے ایسے اکالیوں کو رہائی نصیب ہوئی جن کو قلیل المدت سزائے قید ہوئی اس کے علاوہ سیاسی قیدیوں کے ساتھ بہتر سلوک کا مطالبہ

بھی ایک حد تک تسلیم کرلیا گیا لیکن اس کے باوجود ببرا کالیوں نے پربندھک کمیٹی کو سرکاری ٹاؤٹ قرار دیا اور نوجوان سبھا کے ماسٹر موتا سنگھ نے اس حد تک ان پر الزام عائد کیا کہ اس کمیٹی کی وجہ سے ببرا کالیوں کو قتل (پھانسی) کیا گیا۔

II

ببرا کالی تحریک کے خاتمہ کے بعد انقلابی سوچ ختم نہیں ہوئی بلکہ اس میں غم وغصہ کے جذبات کا اضافہ ہوا اور بعد میں ایک ایسی تحریک پیدا ہوئی جس نے پورے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا نوجوان سبھا کا قیام ببرا کالی تحریک کا ایک منطقی نتیجہ تھی اور اس کے قائدین میں بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، بھگوتی چرن، جتن داس، ماسٹر موتا سنگھ وغیرہ شامل تھے جو بعد میں بہادری کی داستانوں میں ہندوستان بھر میں صف اول کے باغی قرار دیے گئے اور جو آج بھی جرأت کے پیکر مانے جاتے ہیں، نوجوان سبھا کا مقصد بھی غدر پارٹی اور ببرا کالی جتھہ کی طرح مادر وطن سے برطانوی سامراجی حکومت کا خاتمہ اور ایک قومی جمہوریت کا قیام تھا اور انہوں نے بھی اپنی بیشتر تنظیموں کی طرح غیر ملکی آقاؤں اور ان کے پٹھوؤں کو خوفزدہ کرنے کے لئے دہشت گردی کو اپنا ہتھیار بنایا وہ بھی سکھوں کی شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی اور اس سے اوپر کی سطح پر انڈین نیشنل کانگریس کی سیاست سے بیزار تھے ان کا بھی خیال یہی تھا کہ عدم تشدد کی پالیسی برطانیہ نواز پالیسی ہے اور غیر ملکی حکمرانوں کو قوت بازو کے زور پر ہندوستان سے نکالنا چاہیے سردار بھگت سنگھ نے اسی سیاسی سوچ کے تحت مارچ 1926 میں پنجاب میں نوجوان سبھا کی بنیاد رکھی اور اس کا مقصد بھی پنجاب کے نوجوانوں میں انقلابی فکر کو پروان چڑھانا اور انہیں سامراج کے خلاف جدوجہد پر آمادہ کرنا تھا نوجوان سبھا نے آغاز میں اپنے جن مقاصد کا اظہار کیا ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

☆ ہندوستان بھر میں مکمل طور پر کسانوں اور مزدوروں کی ایک آزاد ریاست قائم کرنا۔

☆ نوجوان نسل کو حب الوطنی کے جذبات سے معمور کرنا تاکہ ایک سیکولر اور متحدہ ہندوستانی قومیت وجود میں آسکے۔

☆ ہندوستان کی اقتصادی، صنعتی اور سماجی تحریکوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کرنا اور ان کی اعانت کرنا تاکہ مکمل طور پر ایک ایسی آزاد اور خود مختار ہندوستانی ریاست کی تشکیل دی جاسکے جو مذہبی اور فرقہ واریت سے بالاتر ہو اور جس کا چہرہ مکمل طور پر ہندوستانی ہو۔

☆ ان مقاصد کے حصول کے لئے نوجوانوں کے ساتھ ساتھ فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں کو منظم کرنا تاکہ آئندہ کا ہندوستان محنت

کشوں کا ہندوستان ہو۔

نوجوان سبھا نے اپنے پروگرام کی عوامی مقبولیت کے لئے نچلی سطح پر مناظروں کا اہتمام کیا جن میں اخلاقی اور سماجی پہلوؤں پر زور دیا جاتا تھا سودیشی تحریک کی حمائت میں بات کی جاتی تھی مذہب اور فرقوں سے بلند ہو کر بھائی چارہ قائم کرنے کی تلقین کی جاتی تھی سادہ طرز زندگی اپنانے ذہنی اور جسمانی قوت بڑھانے اور ہندوستان کی زبانوں اور رہن سہن اور ثقافت کی بنیاد کو مضبوط طور پر استوار کرنے کے جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا بہت تھوڑے عرصے میں نوجوان سبھا کی اس تحریک نے جڑ پکڑ لی اور اگلے قدم کے طور پر رکنیت سازی شروع کر دی گئی لیکن کسی بھی نوجوان کو رکن بنانے سے پہلے اس سے عہد لیا جاتا کہ وہ مادر وطن کے مفادات کو اپنی ذات اور اپنے مذہبی فرقے کے مفادات سے بالاتر سمجھے گا آہستہ آہستہ سماجی مقاصد کے پردوں سے نکل کر یہ بات منظر عام پر آئی کہ نوجوان سبھا کی اصل منزل عملی جدوجہد کو بنیاد بنا کر انقلاب برپا کرنا اور اس کیلئے انقلابی فکر کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا ہے نہ صرف عوامی سطح پر نوجوان سبھا کی مقبولیت میں اضافہ ہوا بلکہ مانے ہوئے انقلابی اور انتہا پسند رہنماؤں نے بھی اس کی حمائت کا اعلان کر دیا ان میں کیدار ناتھ سہگل، سردل سنگھ کاوشر، مہتا آنند کشور، سوڈھی پنڈی داس اور کامریڈ رام چندر بھی شامل تھے اور یہ تمام لوگ باقاعدہ طور پر نوجوان سبھا میں شامل ہو گئے ان کی شمولیت سے اس نوازئیدہ تنظیم کو بہت قوت ملی 1926 کے موسم گرما میں نوجوان سبھا نے متعدد عوامی جلسوں کا اہتمام کیا اور ان میں بڑی تعداد میں لوگ شریک ہوئے اور جاتے ہوئے ایک انقلابی سوچ بھی ساتھ لے گئے ستمبر 1926 میں کیدار ناتھ سہگل نے "نوجوان پنجاب سے اپیل" کے عنوان سے ایک پمفلٹ جاری کیا جس میں لالہ لاجپت رائے کو غدار وطن قرار دیا گیا لالہ لاجپت رائے پنجاب کانگریس کے سربراہ کے طور پر ایک مقبول رہنما تھے چنانچہ اس پمفلٹ کے بعد وہ نوجوان جو سیاسی طور پر کانگریس کے ہمنوا تھے نوجوان سبھا سے کنارہ کشی کر گئے اور کسی حد تک اس نئی تنظیم کو آغاز ہی میں ایک دھچکا لگا بعد ازاں ایک اجلاس میں کیدار ناتھ سے باز پرس کی گئی اور انہوں نے بعد ازاں اس طرح کے ایک پمفلٹ میں لالہ لاجپت رائے اور کانگریس سے معذرت کی اس واقعہ کے بعد نوجوان سبھا نے کسی ایسی مہم جوئی کا اعادہ نہیں کیا جس سے سیاسی یا مذہبی سطح پر تنظیم میں نفاق پیدا ہوتا جلد ہی یہ تنظیم ایک سیکولر تشخص قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی اور اس کے پلیٹ فارم سے کانگریس کے چوٹی کے رہنماؤں کو جلسوں سے خطاب کے لیے دعوت دی جاتی رہی ایسے ہی ایک جلسہ میں جو 15 اپریل 1926ء کو ہوا۔ پنڈت جواہر لعل نہرو نے کہا تھا کہ اب وقت آ گیا کہ ہندوستانی قومیت کو اس قدر مضبوط کر دیا جائے کہ ہر مذہب سیاست کے تابع ہو جائے۔ نوجوان سبھا کے ان جلسوں سے انقلابی سوچ رکھنے والے چوٹی کے رہنما ڈاکٹر بھوپندر ناتھ دت، ایس اے ڈانگے اور

برطانوی کمیونسٹ پارٹی کے فلپس سپریٹ بھی خطاب کیا کرتے۔ ان جلسوں میں دنیا میں مذہب اور آزادی کے حوالے سے پیدا ہونے والے نئے افکار اور تحریکوں کا ذکر ہوتا اور آخر میں ان رہنماؤں کی لوگوں سے یہی اپیل ہوتی کہ وہ اس امر پر غور کریں کہ کثیر القومی مملکت ہندوستان میں ایک مضبوط ہندوستانی قومیت کے لیے سیاست اور مذہبی اعتقادات کو الگ کرنا کیوں ضروری ہے۔ وہ کہتے کہ جب تک یہ بنیادی نکتہ طے نہیں ہو جاتا۔ ہندوستان کا سیاسی مستقبل خطرات کا شکار رہے گا اور ایسی صورت میں آزادی کی ایک واضح منزل کا تعین کرنا مشکل ہوگا۔ ساتھ ہی تنظیمی سطح پر بھی کام جاری رہا اور اپریل 1928ء میں امرتسر میں ہونے والے ایک اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ نوجوان سبھا کی شاخیں ہر ضلع میں قائم کی جائیں گی اور کیرتی کسان گروپ کو بھی سرگرمیوں میں شامل کیا جائے گا۔ اس فیصلہ کے تحت امرتسر تنظیم کا ہیڈ کوارٹر بنا۔ ساتھ ہی تنظیم کو وسعت دینے کے لیے اس کا نیا نام نوجوان بھارت سبھا رکھا گیا لیکن سب سے اہم فیصلہ یہ تھا سیاسی جدوجہد کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کے ساتھ یک جہتی کی جائے گی۔ اس اجلاس کے فیصلوں سے تنظیم میں ایک نیا جوش و خروش پیدا ہوا اور سبھا نے اپنی تنظیمی قوت کو آزمانے کے لیے فیصلہ کیا کہ پنجاب میں مالیہ کی معافی کے لیے کسانوں کی اس تحریک کا ساتھ دیا جائے گا جو 1928ء میں گندم کی فصل کا نقصان ہونے کے بعد شروع کی گئی تھی۔

نوجوان بھارت سبھا نے کئی تنظیمی شعبے بھی قائم کیے ان میں نشرواشاعت کا شعبہ "ٹریکٹ سوسائٹی" بہت اہم تھا اس شعبہ نے پتلی تماشا کرنے والوں کی مدد سے کئی اضلاع میں لالٹین کی روشنی میں ایسے شو منعقد کیے جن میں معروف ہندوستانی انقلابیوں کی زندگی کی ڈرامائی تشکیل کی گئی تھی اور یوں کھیل ہی کھیل میں سبھا لوگوں کے ذہنوں میں انقلابی سوچ پیدا کرتی جا رہی تھی۔ ساتھ ہی سوسائٹی نے بہت سے اشاعتی مواد بھی پیدا کیا ان میں ایسے پمفلٹ بھی شامل تھے جن کے ذریعے نوجوان سبھا نے خود کو دنیا بھر کے انقلابی عقائد اور تحریکوں سے منسلک کر لیا ان میں ہردیال کا لکھا ہوا کتابچہ "دولتِ اقوام" اگنس سمرلے کا "ہندوستان اور آئندہ جنگ" اور چھبیل داس کے "بھارت ماتا کے درشن" اور "نوجوانوں سے دو دو باتیں" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس دوران سبھا نے لاہور میں ہفتہ طلبا منایا اور یہ کتابچے ان میں تقسیم کیے اس ہفتہ کا اہتمام لاہور سٹوڈنٹس یونین نے کیا تھا جس کا سبھا کے ساتھ الحاق تھا۔ اس ہفتہ کے دوران سبھا نے کالجوں میں خصوصی محفلیں منعقد کیں جن میں طلبا سے کہا گیا کہ وہ آئرلینڈ' ترکی' جاپان اور چین کے طلبا کی جدوجہد کا مطالعہ کریں کہ اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں ان کا کیا کردار تھا اس دوران روس کے بالشویک انقلاب اور کمیونزم کے مطالعہ پر بھی زور دیا گیا سبھا نے اگرچہ بیرون ملک تحریکوں کے مطالعہ کو پنجاب کے نوجوانوں کے لیے ایک مشعل راہ بنایا لیکن اس کے ہیرو ہندوستان کے وہ

رہنما تھے جنہوں نے وطن کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کیا تھا وہ ان شہیدوں کے کارناموں اور آزادی' مساوات' جمہوریت' انصاف اور حق خودارادیت کے سلسلے میں ان کے افکار کو خصوصی طور پر ان مجالس میں پیش کرتے اور کہتے کہ یہی ان کے لیے قابلِ تقلید ہیں اور انہیں کو وہ مثال بنا کر اپنی راہیں متعین کر سکتے ہیں دراصل ان کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے لیے بہترین نمونہ ہندوستان ہی کے رہنما اور ان کی تحریکیں ہیں اور انہی کو بنیاد بنا کر سیاسی اور اقتصادی آزادی کے لیے ایک بہتر لائحہ عمل تیار کیا جا سکتا ہے۔

جولائی 1928ء میں سبھا کے صوبائی صدر کیدار ناتھ سہگل نے ایک اخباری بیان میں تنظیم کے لائحہ عمل اور اس کی شاخیں صوبے کے تمام دیہات شہروں اور ضلعوں میں قائم کرنے کے فیصلے کا اعلان کیا۔ انہوں نے نوجوانوں کو خصوصی طور پر سائمن کمیشن کے خلاف مظاہروں کے لیے تیار کرنے کی بات کی اور کہا کہ جب کمیشن کے ارکان پنجاب میں آئیں تو ان کا ہر شہر میں سیاہ جھنڈیوں اور پرجوش مظاہروں سے استقبال کیا جائے۔ سبھا کی ضلعی شاخیں لاہور' جالندھر' لدھیانہ' منٹگمری' گوجرانوالہ اور شیخوپورہ میں قائم کی گئیں' نوجوان سبھا نے امرتسر کے انتخاب میں کیرتی کسان پارٹی کے رہنما سوہن سنگھ جوش کو ضلعی صدر منتخب ہونے میں مدد دے کر دونوں تنظیموں کے درمیان رابطے مزید مستحکم کرنے کی بنیاد رکھی' سوہن سنگھ کا انتخاب جولائی میں ہوا اور اگست 1928ء میں دونوں تنظیموں نے مشترکہ طور پر ''روس کے ساتھ دوستی'' کا ہفتہ منایا اس میں انہیں کانگریس کے انتہاپسندوں کی حمایت بھی حاصل تھی اس دوران ایک اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں سوویت روس کی سامراج دشمن پالیسی کی حمایت کی گئی اور رر کہا گیا کہ برطانوی حکومت کو آئندہ کسی بھی جنگ میں ہندوستانی عوام کی حمایت حاصل نہیں ہونی چاہیے۔ انہوں نے ساتھ ہی مزدوروں اور کسانوں کی حکومت کے قیام اور سرمایہ داری نظام کی تباہی کے بارے میں اپنی سیاسی سوچ اور عقیدے کا ایک مرتبہ پھر اظہار کیا۔ اس ہفتے کے بعد سبھا کے ارکان سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ کمیشن 20 اکتوبر 1928ء کو لاہور پہنچا جہاں ایک بہت بڑے اجتماع نے اس کا سیاہ جھنڈیوں اور ''سائمن واپس جاؤ'' کے نعروں سے استقبال کیا۔ نوجوان سبھا کو اپنی اس تحریک میں عوام کی بھرپور حمایت حاصل ہوئی۔ یہ مظاہرہ اس قدر عظیم اور پرجوش تھا کہ پولیس کو اسے منتشر کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ مظاہرے کی قیادت لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے اور ان کے پیچھے لوگوں کا ایک سمندر موجزن تھا جونہی جوشیلے جوان آگے بڑھتے رہے پولیس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا رہا آخر کار لاٹھی چارج کا سلسلہ شروع ہو گیا جس میں متعدد مظاہرین زخمی ہوئے اس کے باوجود مظاہرین منظم انداز میں سڑک پر موجود رہے۔ اس صورتحال نے پولیس کو پریشان کر دیا اور جب ایس پی سکاٹ نے حکم دیا تو پولیس نے ان پر اندھا دھند لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں پولیس کا

حدف درحقیقت وہ نوجوان تھے جنہوں نے لالہ لاجپت رائے کے گرد حفاظتی حصار بنا رکھا تھا کیونکہ پولیس سمجھتی تھی کہ جب تک لاجپت رائے موجود ہیں مظاہرین کی قوت اور جوش وخروش میں کمی نہیں آئے گی اس دوران ایک حیران کن واقعہ پیش آیا ایک نوجوان بجلی کی طرح کسی جانب سے لاجپت رائے کے قریب آیا اور ایک چھاتہ ان کے اوپر سائبان کی طرح تان دیا اس کے بعد وہ غائب ہو گیا پولیس اس سے مزید پریشان ہوئی اور براہ راست لاجپت رائے کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کر لیا اس حملے میں کانگریس کے صوبائی صدر سمیت بے شمار افراد زخمی ہوئے۔ الزام لگایا جاتا ہے کہ ایس پی سکاٹ نے بنفس نفیس لاجپت رائے کو ڈنڈوں سے مارا۔ اس پر ہجوم غصے میں بپھر گیا عین ممکن تھا لوگوں کا پولیس کے ساتھ تصادم ہو جائے صورتحال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے لاجپت رائے نے جن کے چہرے سے خون بہہ رہا تھا ہجوم کو پر امن رہنے اور منتشر ہونے کی اپیل کی اس موقع پر انہوں نے کہا جو حکومت اپنے ہی لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنائے اسے کسی بھی طور پر مہذب نہیں کہا جا سکتا میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھ پر ہونے والا حملہ ہندوستان میں برطانوی راج کے تابوت میں آخر میں کیل ثابت ہو گا۔ لاجپت رائے پر اس حملے کے بعد بیماری کا حملہ ہوا کہا جاتا ہے کہ سر اور سینے پر چوٹوں کی وجہ سے ان کو دل کی بیماری لاحق ہو گئی اور اس بیماری کی وجہ سے وہ 17 نومبر 1928ء کو وفات پا گئے اس شام نوجوان سبھا نے ایک اجلاس میں کہا کہ شیر پنجاب (لاجپت رائے عرف عام میں شیر پنجاب کہلاتے تھے) کا قتل کیا گیا اور ان کا خون انگریزی حکومت کے سر ہے۔

بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، کیلاش پتی، راج گرو، یشپال اور دوسرے انقلابیوں نے ایک خفیہ اجلاس میں فیصلہ کیا کہ ایس پی سکاوٹ کو قتل کر کے لاجپت رائے کا بدلہ لیا جائے گا ایس پی کے قتل کے لیے 17 دسمبر 1928ء کا دن مقرر ہوا اس روز سکاٹ اور دوسرے پولیس افسر جن میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرس بھی شامل تھا ڈی اے وی کالج سے باہر آ رہے تھے تو انقلابی بھی وہاں موجود تھے جے پال کو سکاٹ پر نظر رکھنے کو کہا گیا تھا اور بھگت سنگھ اور آزاد کو انہیں گولی کا نشانہ بنانا تھا۔ جونہی سکاٹ اور سانڈرس کالج سے باہر نکل کر اپنی موٹر سائیکلوں پر بیٹھے تو بھگت سنگھ اور آزاد نے سانڈرس پر گولی چلا دی جو اس کے چہرے پر لگی۔ اس کے بعد ایک اور گولی چلائی گئی جس سے سانڈرس کا ریڈر چنن سنگھ آگے گیا تو اس پر بھی گولی چلائی گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر گیا۔ اس دوران تمام انقلابی وہاں سے بھاگ نکلے اور ان میں سے کوئی بھی گرفتار نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد بھی نوجوان سبھا نے اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انہوں نے 16 دسمبر کو لاہور اور امرتسر میں کاکوری کا دن منایا جس میں کاکوری کیس کے بہادروں کو یاد کیا۔ ان کے اخبار نوجوان میں مزدوروں اور کسانوں کے حق میں مضامین شائع ہوئے اور ان کا موضوع مدن لال

ڈھینگرا' کرتار سنگھ سرابا اور دوسرے شہدا کے علاوہ کاملت مارو ننکانہ جلیانوالہ باغ اور گرو کا باغ میں قتل عام میں مرنے والے لوگ تھے۔ اخبار نے نوجوانوں سے کہا کہ اٹھ کھڑے ہو اور اپنی تلوار کی پیاس ظالموں کے خون سے بجھاؤ۔

III

نوجوان بھارت محابہ ایک ایسی تنظیم تھی جس کا مقصد معاشرے میں انقلابی تبدیلیاں لانا اور برطانوی راج کے خلاف جدوجہد میں تشدد کی پالیسی اپنانا تھا۔ یہ تحریک پنجاب کے چند اضلاع تک محدود تھی اور انقلابیوں کو مکمل احساس تھا کہ جب تک وہ ملک کے دوسرے حصوں میں موجود تشدد پسند تنظیموں سے رابطہ پیدا نہیں کرتے اور ان کا تعاون حاصل نہیں کرتے تب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے اس مقصد کے لیے انہوں نے بنگال' یوپی' راجستھان اور بھہار کے انقلابیوں سے رابطہ قائم کیا۔ شمالی ہندوستان میں ایک انقلابی تنظیم سوچنڈ ناک سانیال نے 1920ء میں قائم کی۔ یہ بنگالی لیڈر بنارس میں رہتے تھے اور ان کی کتاب بندلی جوان کا ہندی اور پنجابی میں ترجمہ ہوا تھا جس کے باعث ان کا نام پنجاب میں مشہور تھا۔ سانیال نے یوگیش چندر' چٹرجی کے ساتھ مل کر یوپی میں ایک دہشت پسند تنظیم کا آغاز کیا 1924ء میں اس تنظیم کو ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن کا نام دے کر ایک نئی پارٹی قائم کی گئی جس میں چندر شیکھر آزاد اور سکھ دیو کو ضلع لائل پور میں پارٹی کی کمان دی گئی تاکہ وہاں سے رضا کار بھرتی کیے جا سکیں۔ اس کے لیے یشپال جے گوپال اور بعد میں ہنس دنبھدا اور بھگت سنگھ نے سکھ دیو کی مدد کی۔ اس دوران ہنس راج نے 1928ء میں ایک طالب علم تنظیم قائم کی جس میں نوجوانوں کو انقلاب برپا کرنے کے لیے تیار کیا گیا۔ فیروز پور میں گیا پرشال میں ڈاکٹر بی ایس نگم کے نام سے ایک شفاء خانہ قائم کیا جہاں انقلابی جمع ہوتے ہیں۔ کپڑے تبدیلی کرتے اور اپنی منزل پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ بعد میں اس جگہ کو بم بنانے کے لیے بھی استعمال کیا گیا امرتسر میں سکھ دیو نے ایک مکان کرائے پر لیا جہاں انقلابیوں کے اجلاس ہوا کرتے تھے۔ اسی دوران ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن نے کانگریس کی ستیہ گرہ کی ناکامی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کروائی اور اس سے کہا کہ نظام کی تبدیلی کے لیے ہتھیار اٹھانا ضروری ہیں۔ ان کا نعرہ تھا کہ انقلابی جدوجہد میں بندوق اٹھالو تاکہ ہندوستان میں برطانوی راج کا خاتمہ کیا جا سکے یہ وہ انقلاب ہے جس سے سرمایہ داری نظام اپنی موت آپ مر جائے گا اور مفادات پر مبنی سیاسی اقتدار اور ان کے حواریوں کا خاتمہ ہو جائے گا اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس ایسوسی ایشن میں ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی اگست 1928ء میں قائم کی اس تنظیم نے 8 اور 9 ستمبر کو ایک اجلاس

کوٹلہ فیروز شاہ میں کیا جس میں چندر شیکھر آزاد اور بھگت سنگھ بھی موجود تھے اس میں فیصلہ کیا گیا کہ تمام انقلابی جماعتوں کو یکجا کر کے سوشلزم قائم کیا جائے اور سوشلسٹ نظام کو ملک کے نئے نظام کی بنیاد بنایا جائے اس اجلاس میں بھی فیصلہ کیا گیا کہ یوگیش چند چٹر جی ایس این سانیال کا نور کیس کے دوسرے قیدیوں کو جیل سے چھوڑا جائے اور سائمن کمیشن کے خلاف احتجاج کیا جائے اجلاس میں ایک فیصلہ بھی ہوا کہ بنگال سے ایسے لوگوں کو بلایا جائے جو بم بنانا جانتے ہیں تا کہ نئی پارٹی کے ارکان کو بم بنانے کی تربیت دی جائے۔ اس مقصد کے لیے جو رقم خرچ ہونا تھی اسے حاصل کرنے کے لیے بنک ڈاکخانے اور سرکاری خزانہ لوٹا جائے اور اس سے ہتھیار خریدے جائیں۔ اجلاس میں محسوس کیا گیا کہ معمولی سرکاری افسروں اور پولیس کے مخبروں کونشانہ بنانا غلط ہے کیونکہ اس سے انقلابی تحریک کو کوئی مدد نہیں ملتی لیکن انہوں نے دہشت گردی کو ختم کرنے کا فیصلہ نہیں کیا کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ دہشت گردی حصول انقلاب کے لیے ایک ناگزیر مرحلہ ہے ان کا کہنا تھا کہ انقلاب دہشت گردی کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اور نہ ہی دہشت گردی کو اس مقصد کے حصول کے لیے ترک کیا جا سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ دہشت گردی سے ظالموں کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں اور ایسے لوگ جو ظلم کے خلاف نفرت کے باوجود کوئی قدم نہیں اٹھاتے ان کو بھی حوصلہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ حاکموں کا احساسِ برتری ختم ہوتا ہے اور عام لوگوں کو اپنا نیا حوصلہ ملتا ہے اور یہی حوصلہ آزادی کی منزل پانے کے لیے سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس پارٹی کا یہ خیال تھا کہ دہشت گردانہ اقدامات سے ہندوستان میں انقلاب آئے گا اس کے بعد سماجی' سیاسی اور اقتصادی آزادی نصیب ہو گی۔ ان انقلابیوں کا یہ نعرہ تھا ہم رحم نہیں چاہتے نہ ہی ہم ہتھیار پھینکیں گے۔ ہماری جنگ آخری منزل کے حصول (وائسرائے کی موت) تک جاری رہے گی۔"

اسی دوران حکومت نے دو قانون پبلک سیفٹی بل اور ٹریڈرز ڈسپیوٹ ایکٹ متعارف کروائے۔ یہ دونوں قانون مرکزی قانون ساز کونسل نے مسترد کر دیئے لیکن گورنر جنرل نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے ان کو نافذ کر دیا نوجوان بھارت سبھا نے جلسے منعقد کیے اور قوانین کو مسترد کر دیا اس کے باوجود حکومت نے عوامی احساسات کو نظر انداز کرتے ہوئے ان قوانین کو واپس لینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح کی ایک احتجاجی کارروائی میں بھگت سنگھ اور باٹو کیشور دت نے مرکزی اسمبلی حال میں آگرہ کی ایک فیکٹری میں بنے ہوئے بم پھینک کر برطانوی حکومت کو دہشت زدہ کرنے کی کوشش کی۔ بم پھینکنے کے بعد وہ وہاں سے فرار نہیں ہوئے بلکہ یہ نعرہ بازی کرتے رہے "انقلاب زندہ باد" "سامراج مردہ باد" اور "دنیا بھر کے محنت کشو ایک ہو جاؤ۔"

ان بموں سے بہت معمولی نقصان ہوا اور بقول جواہر لال نہرو کے ان کا مقصد ایک چھوٹا موٹا

شور مچانا اور دنیا کی توجہ ہندوستان کی صورت حال کی طرف مرکوز کروانا تھا۔ بھگت سنگھ اور بی کے دت نے بم پھینکنے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی اور اعلان کیا کہ ان کے اس بہادرانہ اقدام کا مقصد یہ تھا:

1- ان بموں کا مقصد کسی کی ذات کو نقصان پہنچانا نہیں تھا بلکہ دنیا پر یہ واضح کرنا تھا کہ ہندوستان کے لوگ کس قدر مجبور اور لاچار ہیں۔

2- ہمیں دنیا کو دکھانا تھا کہ سامراجی حکمران کس قدر ظالم ہیں کہ انہوں نے ہندوستان کے عوام کو غلامی کی زندگی جینے پر مجبور کر رکھا ہے۔

3- ان کا مقصد ان مجبور اور مظلوم لوگوں کے احتجاج کو منظر عام پر لانا تھا جو اپنی مصیبتوں اور ظلم کا اظہار نہیں کر سکتے۔

4- ان کا مقصد حکومت کے بہرے کانوں اور لوگوں کے احساسات کو نظر انداز کیے جانے کی پالیسی کے خلاف ایک وارننگ دینا تھا۔

5- ہمارا مقصد یہ بھی تھا کہ عدم تشدد کے موہوم فلسفہ کی حقیقت لوگوں پر ظاہر ہو جائے تاکہ انہیں احساس ہو جائے کہ اس قسم کی پالیسیوں سے آزادی کی منزل حاصل نہیں ہو سکتی۔

6- ہمارا یقین ہے کہ اگر ظلم و زیادتی کے باوجود فرانس اور سائبیریا کی انقلابی تحریکوں اور انقلاب روس کو ختم نہیں کیا جا سکا تو سیفٹی بل جیسے قوانین بھی ہندوستان میں آزادی کی لہر کو نہیں دبا سکتے۔

یہ بم کسی خاص نشانے پر نہیں پھینکا گیا اور نہ ہی اس کا مقصد کسی کو ہلاک کرنا تھا یہ بم خالی جگہ پھینکا گیا۔ اگر ان انقلابیوں کا مقصد سر جان سائمن کو مارنا ہوتا تو وہ یہ کام آسانی سے کر سکتے تھے کیونکہ وہ اس وقت صدر کی گیلری میں بیٹھا ہوا تھا۔ ان نوجوانوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس وقت کے معاشرے کی خامیاں اور حکومت کی پالیسیاں لوگوں پر ظاہر کریں اور اس کے لیے کسی ایسے ہی انقلابی اقدام کی ضرورت تھی جس سے وہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا لیتے اور اپنے سوشلسٹ فلسفے کی افادیت لوگوں پر ظاہر کر دیتے۔

بھگت سنگھ اور بی کے دت کو عمر قید کی سزا ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی جب لاہور کی ایک فیکٹری سے بموں کی ایک خاصی مقدار حادثاتی طور پر پولیس کے ہاتھ لگ گئی تو سکھ دیو اور کشوری لال سمیت بہت سے کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا بعد ازاں جب جے پال اور فنس راج وہرا نے پولیس کے سامنے اقبال جرم کر لیا تو ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن کے اکثر کارکنوں اور رہنماؤں کو حراست میں لے لیا گیا غدر پارٹی والا ڈرامہ پھر دہرایا گیا کیونکہ پولیس تشدد کی انتہا کے بعد جب کئی کارکنوں کے پاس اور کوئی

چارہ نہ رہا تو انہوں نے پارٹی کے تمام راز آشکار کر دیے اور سرکاری گواہ بننا منظور کر لیا۔ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کے سات ارکان بھی ان میں شامل تھے جو پولیس تشدد کے بعد سرکاری گواہ بن گئے۔ ان واقعات نے لاہور سازش کیس کو جنم دیا اور گرفتار شدہ انقلابیوں کے خلاف ملک سے غداری کے نئے مقدمات درج کیے گئے۔ لاہور سازش کیس 1929ء میں درج ہوا اور بھگت سنگھ، بی کے دت، سکھ دیو اور کشوری لال وہرا کو نئے سرے سے اس میں ملوث کیا گیا۔ ان حالات میں انقلابیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اس مقدمے کو اپنے سیاسی اور انقلابی مقاصد کی تشہیر کے لیے ضرور استعمال کریں گے خصوصاً برطانوی حکومت کے نظامِ انصاف کو نشانہ بنایا جائے گا۔ سازش کے الزامات عائد ہونے کے بعد ان سیاسی قیدیوں پر جیل پر مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا جس کے خلاف احتجاج کے طور پر بھگت سنگھ اور بی کے دت نے جیل میں تا مرگ بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ ان کا مطالبہ تھا کہ سیاسی قیدیوں کو جیل میں بہتر کلاس اور بہتر خوراک دی جائے۔ اخبارات اور پڑھنے لکھنے کا مواد فراہم کیا جائے اور ان سب کو ایک جگہ رکھا جائے۔ اس بھوک ہڑتال میں تقریباً سبھی انقلابی شامل ہو گئے حتیٰ کہ بابا سوہن سنگھ بھکنا بھی ان سے پیچھے نہیں رہے حالانکہ وہ 14 برس کالے پانی اور ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رہے۔ ان کی صحت خراب تھی ان کی عمر زیادہ ہو چکی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہیں فوراً بعد ہی رہا ہو جانا تھا اور حکام نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ انقلابیوں کا ساتھ دینے پر ان کی رہائی ملتوی ہو سکتی ہے۔ مگر سوہن سنگھ اور دوسرے انقلابیوں کی اپنے مقصد کے ساتھ لگن اس قدر شدید تھی کہ وہ کسی رعایت کے لالچ میں نہیں آ سکتے تھے۔

یہ بھوک ہڑتال 63 روز جاری رہی۔ اس دوران جیل حکام نے جبراً انہیں ربڑ کی نالیوں کے ذریعے خوراک دینے کی کوشش کی لیکن انقلابیوں نے یہ خوراک قے کے ذریعے باہر پھینک دی۔ جیل حکام نے یہ کام بھی کیا کہ پانی کی جگہ مٹی کے گھڑوں میں دودھ رکھ دیا اور جب انہوں نے دودھ پینے سے انکار کر دیا اور پانی کا مطالبہ کیا تو حکام نے ان پر سختی کی تا کہ وہ دودھ پینے پر مجبور ہو جائیں۔ قیدیوں نے دودھ کی گھاگھریں توڑ دیں اور حکام پر واضح کر دیا کہ وہ پیاسے رہ لیں گے لیکن دودھ نہیں پئیں گے۔ چنانچہ حکام مجبور ہو گئے کہ انہیں پانی فراہم کر دیا جائے اس دوران ایک انقلابی جتن داس کی حالت نازک ہو گئی اور ہندوستان کی دوسری جیلوں میں بھی قید سیاسی لوگوں نے بھوک ہڑتال کا آغاز کر دیا اس دوران جیل میں جتن داس کی موت واقع ہو گئی تو حکومت نے محسوس کیا کہ حالات بہت خراب ہو چکے ہیں۔ اسی لیے ایک سرکاری جیل کمیٹی مقرر کی گئی جس کے ارکان جیل میں جا کر انقلابیوں سے ملے اور انہیں یقین دلایا کہ ان کے اکثر مطالبات تسلیم کر لیے جائیں گے۔ ان یقین دہانیوں کے بعد انقلابیوں نے بھوک ہڑتال ختم کر دی۔

لاہور سازش کیس پورے ہندوستان میں مشہور ہوا۔ سیاسی تنظیموں نے جلسوں کے ذریعے اس مقدمے کو تنقید کا نشانہ بنایا اور لوگوں سے کہا کہ ان میں ایک الزام میں بھی صداقت نہیں یہ مقدمہ نو ماہ تک عدالت میں چلتا رہا لیکن قانونی معاملات آگے نہیں بڑھے بلکہ مقدمے کی کارروائی الٹی حکومت کے گلے پڑی کیونکہ انقلابیوں نے اس کارروائی کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے ایسے بیانات ریکارڈ کرائے جن سے انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد بڑی وضاحت کے ساتھ عوام تک پیش کر دیئے۔ یہ حالات حکومت کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہے تھے چنانچہ وائسرائے کے حکم کے تحت مقدمے کی کارروائی روک دی گئی اور لاہور سازش کیس آرڈی نینس 1930ء جاری کیا گیا جس کے تحت مقدمے کی سماعت کے لیے ایک خصوصی ٹربیونل قائم کیا گیا اس ٹربیونل میں انقلابیوں کو نہ وکیل کی سہولت حاصل تھی نہ اپنے دفاع میں وہ کسی گواہ کو پیش کر سکتے تھے حتیٰ کہ اس قانون کے تحت ان کی اپنی موجودگی بھی عدالت میں ضروری نہ تھی۔ یہ غیر معمولی فیصلہ اس لیے کیا گیا تھا کہ عدالتی کارروائی کے دوران سیاسی بیان بازی نہ ہو سکے۔ اس کے باوجود انقلابیوں نے عدالت میں اپنی جدوجہد جاری رکھی۔ ٹربیونل میں نعرہ بازی کی اجازت نہ تھی لیکن جب پہلے روز انقلابی اندر داخل ہوئے تو انہوں نے نعرہ بازی شروع کر دی اس پر انہیں عدالت میں ہتھکڑی لگانے کی کوشش کی گئی۔ انقلابیوں نے مزاحمت کی تو پولیس نے ان پر لاٹھیاں برسانا شروع کر دیں جس سے متعدد قیدی زخمی ہو گئے۔ انصاف کے نام پر ٹربیونل کا یہ ڈرامہ پانچ مہینے تک چلتا رہا حتیٰ کہ اکتوبر 1930ء میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو سزائے موت سنائی گئی۔ دوسرے ساتھی ملزموں کو عمر قید اور بہت سے دیگر کارکنوں کو طویل المدت قید کی سزا دی گئی۔ اس سزا نے پورے ملک کے لوگوں کو ہلا کر رکھ دیا کیونکہ کوئی شخص بھی اس ٹربیونل کو عدالت ماننے پر تیار نہیں تھا اور نہ ہی وہ سمجھتا تھا کہ اس مقدمے میں انصاف ہوا ہے چنانچہ کئی اضلاع میں اپیل کمیٹیاں قائم ہوئیں کیونکہ قانون کے تحت اس ٹربیونل کی سزا کے خلاف اپیل نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان اپیل کمیٹیوں نے سیاسی قدم اٹھانے کا فیصلہ کیا وہ اجتماعات منعقد کر کے لوگوں سے فیصلے کے خلاف بیانات حاصل کرتے۔ ان کمیٹیوں نے انگلستان کے بادشاہ کے نام رحم کی بے شمار اپیلیں بھیجیں حالانکہ بھگت سنگھ ایسی اپیلوں کے حق میں نہیں تھے۔ اس کے ساتھ ہی مرکزی اپیل کمیٹی نے 60,00-دستخطوں پر مشتمل ایک یادداشت وائسرائے کو پیش کی جس میں اپیل کی گئی تھی کہ بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کی سزائے موت عمر قید میں تبدیل کر دی جائے۔ نوجوان سبھا کے ارکان خاص طور پر سوڈھی سنگھ پنڈی داس، گرودت سنگھ اور احمد دین بہت متحرک تھے۔ اس دوران 17 فروری 1931ء کو پورے پنجاب میں بھگت سنگھ ڈے منایا گیا۔ طلبہ نے کلاسوں کا بائیکاٹ کیا اور جلوس نکالے جس میں حکومت اور اس کے اعلیٰ حکام کے خلاف نعرہ بازی کی گئی۔ اس کے

بعد پنڈت مدن موہن مالویہ نے وائسرائے کو ایک تار کے ذریعے ایک پیغام بھیجا کہ وہ اپنے اختیار کے تحت سزائے موت میں تخفیف کردیں۔ یہ معاملہ پوری کونسل تک گیا جہاں ڈی این پرٹ ہورس ڈگلس اور سڈنی نے بھگت سنگھ وغیرہ کے حق میں بات کی۔ اس سماعت کا پورے ہندوستان پر بڑا اثر ہوا اور لوگوں نے محسوس کیا کہ جنگ آزادی کے ان بہادر سپاہیوں کی جان بچانے کیلئے ہر ممکن قدم اٹھانا چاہیے۔ پریوی کونسل نے رحم کی اپیل 11 فروری 1931ء کو مسترد کردی اور ان تین بہادر سپاہیوں کو 18 فروری کو 23 مارچ 1931ء کے دوران پھانسی پر لٹکادیا گیا حالانکہ اس دوران پورے ملک میں ان کو بچانے کی ایک تحریک چل پڑی تھی اور اس نے سیاسی رخ اختیار کرلیا اور ایسے جلوس میں تقریر کرنے والے افراد عموماً عدم تشدد کی پالیسی ترک کرنے اور طاقت کے ذریعے ظالم حکومت گرانے کی بات کرتے۔

بھگت سنگھ کے حوالے سے بعد میں بہت کچھ کہا گیا۔ ڈاکٹر ستیہ پال نے کہا ان لوگوں کا اپنے مقصد پر اس قدر پختہ یقین تھا کہ ان کے قریب زندگی اور موت میں کوئی تمیز باقی نہ رہ گئی تھی۔ سبھاش چندر بوس نے انقلاب پر لوگوں کا یقین اور مستحکم کردیا ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ بھگت سنگھ کی بہادری نے پنجاب کی لوک داستانوں میں ایک اپنا مقام پیدا کرلیا اور لوگ شجاعت اور بہادری اور اپنے مقصد کے حصول پر یقین کی جو مثال پیش کرتے اس میں بھگت سنگھ کا ذکر ضرور ہوتا وہ ایک ایسا رومانوی کردار بھی بن گیا تھا جس کی داستانیں پنجاب بھر میں سنائی اور گائی جاتیں اور تھیٹر بھی ان کو اپنائے بغیر نہیں رہ سکا۔ عدالت میں دیئے گئے بھگت سنگھ کے بیان نے نوجوانوں پر ایسا گہرا اثر کیا کہ مردان کے ایک 19 سالہ نوجوان ہری کرشن نے پنجاب کے گورنر سر جیفری ڈی مونٹ مورینس کو قتل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ 23 دسمبر 1930ء کو جب گورنر پنجاب یونیورسٹی کا سالانہ کانووکیشن کی صدارت کررہے تھے تو ہری کرشن کتاب کے اندر پیدا کیئے جانے والے خلا میں پستول چھپا کر کانووکیشن ہال میں چلا گیا گورنر تقریب کے بعد جانے ہی والا تھا کہ ہری کرشن نے اس پر قریب سے گولی چلائی گورنر کو معمولی زخم آئے لیکن ایک پولیس انسپکٹر چنن سنگھ گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا اور کئی دیگر افراد زخمی ہوئی ہری کرشن کو گرفتار کر کے جیل میں اسی بیرک میں رکھا گیا جس کے ساتھ والی کوٹھری میں بھگت سنگھ قید تھا۔ ہری کرشن نے جیل حکام سے مطالبہ کیا کہ اسے بھگت سنگھ سے ملنے دیا جائے۔ حکام نے انکار کیا تو اس نے بھوک ہڑتال کردی۔ نو روز بعد جیل حکام بھگت سنگھ کو لے کر ہری کرشن کی کوٹھری میں آئے اور دونوں میں ملاقات کروادی۔ ہری کرشن کو سزائے موت ہوئی اور 26 جون 1931ء کو اسے پھانسی دے دی گئی۔ پھانسی سے ایک روز قبل اس نے جیل حکام سے کہا کہ اس کی چتا کو اسی جگہ آگ لگائی جائے جہاں بھگت سنگھ، سکھ دیو اور راج گرو کی چتائیں جلائی گئیں۔ اس طرح کی بے شمار اور مثالیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ بھگت سنگھ نے نوجوان نسل کے دلوں میں اپنا گھر بنا لیا تھا۔ وہ

لوگ خاص طور پر جیل کے اندر اور باہر اس کی بہادری سے بہت متاثر تھے حتیٰ کہ مہاتما گاندھی بھی کہہ اٹھے "حالیہ تاریخ میں ایسا کوئی آدمی نہیں گزرا جو معاشرے میں ایک رومانوی کردار بن گیا ہو یہ اعزاز صرف بھگت سنگھ کے حصے میں آیا" گورنر پنجاب نے وائسرائے لارڈ اروِن کے نام ایک خط میں، جو 14 مارچ 1931ء کو لکھا گیا اعتراف کیا "ہم یہاں پر بہت مشکل وقت گزار رہے ہیں۔ نوجوان لوگوں کی تنظیموں نے انتہائی شدت سے یہ تحریک شروع کر رکھی ہے کہ بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں اور ہری کرشن کو سزائے موت نہ دی جائے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم سیاسی افراتفری کے اس موڑ پر آ پہنچے ہیں جو 1919ء کی یاد تازہ کر رہا ہے" پنجاب کے حکام اس قدر خوف زدہ تھے کہ انہوں نے پھانسی کا دن لوگوں سے چھپایا اور ان بہادروں کو خاموشی کے ساتھ سولی پر لٹکا دیا گیا۔ ان بہادر لوگوں کو 23 مارچ 1931ء کو صبح 7:15 بجے لاہور سینٹرل جیل میں پھانسی دی گئی اور 9:30 بجے ان کی لاشوں کو پچھلی دیوار توڑ کر باہر نکالا گیا اور انہیں 11:30 بجے تک دریائے ستلج کے کنارے پہنچایا گیا جہاں ان پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی بھگت سنگھ نے موت سے پہلے گورنر کو ایک خط لکھا جس میں اس نے کہا "یہ جنگ اب ایک نئی شان و شوکت کے ساتھ لڑی جائے گی جس میں بہادری اور جرأت کے نئے باب رقم ہوں گے اور یہ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہندوستان میں ایک سوشلسٹ جمہوری نظام قائم نہیں ہو جاتا......اب سرمایہ داری اور سامراجی استحصال کے دن پورے ہو چکے ہیں یہ جنگ ہم نے شروع کی نہ ہم نے اس کو ختم کیا۔ یہ جنگ ظالم اور مظلوم کے درمیان صدیوں پہلے شروع ہوئی اور ہم نے اس کو تیز کرنے میں اپنا معمولی سا حصہ ڈالا۔ ہماری معمولی سی قربانی شاید ایک بہت بڑی دیوار میں ایک اینٹ کی مانند ہے۔" بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی موت کی خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ہندوستان بھر میں اس کے احتجاج میں مظاہرے بھی ہوئے لوگوں نے اپنے رنج و الم کا اظہار بھی کیا۔

لوگوں کے جذبات کی ترجمانی جواہر لعل نہرو نے ان الفاظ میں کی "ہم سب مل کر بھی اسے نہیں بچا سکے اس شخص کو جو ہمیں بے حد عزیز تھا اور جس کی بے مثال بہادری اور قربانی نے ہندوستان کے نوجوانوں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے" پنجاب میں آل انڈیا بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کی یاد میں ایک کمیٹی بھی قائم ہوئی جس کے ارکان میں ڈاکٹر ایم اے انصاری، سبھاش چندر بوس، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر شیر پال، کے سنتانام اور کے ایم منشی بھی شامل تھے۔ البتہ مہاتما گاندھی نے اس کمیٹی میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ مہاتما گاندھی نے یادگاری (میموریل) کمیٹی کے سیکرٹری انند کشور کو 20 جون 1931ء کو ایک خط میں جو بعد ازاں پولیس کے ہاتھ لگ گیا، کمیٹی میں شامل نہ ہونے کی یہ وجوہات بیان کیں "کسی یادگار کے ساتھ ہم آہنگی وہی لوگ کرتے ہیں جو نظریاتی طور پر بھی اس سے ہم

آہنگ ہوں۔ یہ ایک نظریاتی مسئلہ ہے اور اس کا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں اس نظریے سے متفق ہوں۔ میں ان لوگوں کے نظریات کا ساتھ نہیں دے سکتا جن کی یاد میں یہ میموریل کمیٹی قائم کی گئی ہے لہٰذا میں اس تنظیم میں شرکت سے معذرت کرتا ہوں" اس خط کے پولیس کے ہاتھ لگنے کے بعد حکومت نے اس یادگاری کمیٹی کو منظم ہونے سے قبل ہی کچلنے کی کوششیں تیز کر دیں چونکہ مہاتما گاندھی نے بھی اس میں شمولیت سے معذرت کر لی تھی اس لیے کمیٹی کے قیام کی کوششوں پر پانی پھر گیا اور ان اولین واقعات کے بعد اس کمیٹی کے بارے مزید کوئی معلومات موجود نہیں۔

نوجوان سبھا کو 1929ء کی کانفرنس کے بعد سیاسی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن بعد میں اس کی سرگرمیاں دوبارہ شروع کرنے کی کوشش کی گئی۔ سوہن سنگھ جوش' کیدار ناتھ سہگل اور عبدالمجید کی میرٹھ سازش کیس میں گرفتاری کے بعد نوان سبھا نے پنجاب کی دوسری سیاسی جماعتوں بشمول کانگریس کے ساتھ تعاون کا فیصلہ کیا تا کہ بھگت سنگھ اور اس کے دوسرے ساتھیوں کا دفاع کیا جا سکے۔ اس سے کانگریس کو پنجاب کے دیہی علاقوں تک تنظیمیں قائم کرنے کا موقع ملا لیکن نوجوان سبھا کے لیے یہ بات قابلِ قبول نہ تھی کیونکہ اس کا مقصد پر تشدد انقلاب برپا کرنا تھا اسے پنجاب کے شہری علاقوں میں پاؤں جمانے کا موقع ملا جس کے لیے اس نے کیرتی کسان پارٹی کی مدد سے صوبے کے کسانوں کے ساتھ رابطہ بڑھایا۔ حکومتی سطح پر تشدد میں یقین رکھنے والے انقلابیوں اور عدم تشدد کے پیروکار کانگریسی تنظیموں کے مابین رابطہ خطرے کی گھنٹی محسوس ہوا چنانچہ ہوم ڈپارٹمنٹ کے ایک نوٹیفکیشن کے تحت 23 جون 1930ء کو نوجوان سبھا کو غیر قانونی تنظیم قرار دے دیا اور ساتھ ہی اس کی ساتھی دیگر تنظیموں پر بھی پابندی لگا دی۔ یہ پابندی بھگت سنگھ اور اس کے ساتھیوں کی موت کے بعد اٹھا لی گئی لیکن ساتھ ہی نوجوان سبھا کی کارکنوں کی اندھا دھند گرفتاریوں اور ان پر تشدد کے نتیجے میں نوجوان سبھا اس کے بعد تنظیمی طور پر پھر کبھی سنبھل نہ پائی۔

جہاں تک کیرتی کسان پارٹی کا تعلق ہے وہ پنجاب کے غریب کسانوں مزدوروں اور دوسرے نچلے طبقات کی نمائندگی کرتی تھی اس کا مقصد ہر ممکن طریقے سے برطانوی سامراج سے آزادی حاصل کرنا تھا وہ گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی اور چرخہ کو بھی تسلیم نہیں کرتے تھے اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ ہندوستان کے عوام کو بھی آزادی کے لیے وہی قیمت ادا کرنی پڑے گی جو تاریخ میں دوسری قوموں نے اس جدوجہد کی راہ میں چکائی تھی۔ کیرتی کسان پارٹی امرتسر میں ایک کانفرنس کے دوران قائم کی گئی جو 1927ء میں منعقد ہوئی۔ یہ پارٹی بنگال اور بمبئی کی مزدوروں اور کسانوں کی تنظیموں کے خطوط پر قائم کی گئی تھی اور اسے کمیونسٹ انٹرنیشنل کی حمایت حاصل تھی۔ ان دنوں پنجاب میں بے چینی کی لہر پھیلی

ہوئی تھی کیونکہ ستیہ گرہ کی تحریک کے فروری 1922ء میں خاتمے کے بعد پولیس کے مظالم نے خصوصی طور پر کسانوں کو بہت نقصان پہنچایا تھا اور گوردوارہ سدھار کی ایجی ٹیشن اور ببر اکالی لہر نے پنجاب کے عوام میں سیاسی شعور تیز کیا اور ساتھ ہی غدر پارٹی کے اکثر رہنما رہائی کے بعد اپنے دیہات میں واپس پہنچ چکے تھے بھائی سنتو کھ سنگھ جو 1923 میں ماسکو میں عسکری تربیت حاصل کر چکے تھے قید کی سزا کاٹ کر 1926 میں رہا ہو چکے تھے۔ اسی طرح عبدالمجید بھی 1924ء میں رہائی کے بعد ریلوے ٹیکسٹائل ملوں کے مزدوروں میں کام شروع کر چکے تھے۔ انہوں نے "اردو زبان کا ایک ہفت روزہ "محنت کش" جاری کیا جبکہ بھائی سنتو کھ سنگھ نے پنجابی زبان میں ماہنامہ "کیرتی" کا اجرا کیا جس کے سرورق پر درانتی اور ہتھوڑے کا نشان بھی ثبت کیا گیا تھا۔

ان انقلابی رہنماؤں کو اب احساس ہو چکا تھا کہ نچلی سطح پر عوام پر رابطہ قائم کیے بغیر کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اسی احساس کے تحت انہوں نے مزدوروں اور کسانوں اور دیگر محروم طبقات میں کام شروع کیا جن کو سیاسی اقتصادی اور سماجی طور پر نظر انداز کیا جاتا رہا اور جو تعلیم کے ثمرات سے بھی بے بہرہ تھے ان کا خیال تھا کہ نچلی سطح پر عوام کسی بھی تحریک کے لیے ضروری ہیں لیکن کوئی بھی سیاسی تنظیم ان کی طرف توجہ نہیں دے رہی۔ یہ انقلابی خاص طور پر انڈین نیشنل کانگریس پر الزام عائد کرتے تھے کہ وہ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفادات کی خاطر غریب عوام کے مفادات کو نظر انداز کر رہی ہے۔

1927ء میں امرتسر میں ہونے والی کانفرنس میں کیرتی کسان پارٹی کا قیام عمل میں لایا گیا سوہن سنگھ جوش کو پارٹی کا سیکرٹری اور عبدالمجید کو جوائنٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ ماہنامہ کیرتی کو پارٹی کا ترجمان بنایا گیا اور امرتسر میں اس کا ہیڈ آفس قائم کیا گیا۔ نذرانوں کا خاتمہ، زرعی زمین کے کرایوں میں کمی اور سود کی شرح یکساں طور پر مقرر کرنا اس پارٹی کے اولین مطالبات تھے۔ نوجوان سبھا کی مدد سے پارٹی نے ریلوے اور چھاپہ خانوں کی ٹریڈ یونینوں کو بھی ساتھ ملانا چاہا لیکن اس میں پارٹی کو خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی۔ کیرتی میں شائع مضامین میں مزدوروں اور کسانوں کو یہ شعور دیا جاتا کہ وہ قسمت اور ایمان جیسے نعروں سے بچیں کیونکہ یہ استحصالی طاقتوں نے اپنے مقصد کی برارہ کے لیے گھڑ رکھے ہیں اور ان سے منظم جدوجہد کو نقصان پہنچتا ہے ان مضامین میں کسانوں اور مزدوروں کے ساتھ ساتھ نچلے اور متوسط طبقات پر زور دیا جاتا کہ وہ ملک کو برطانوی چنگل سے آزادی دلانے کے لیے اپنی جدوجہد تیز تر کر دیں۔ اس پارٹی نے 1928ء میں لائل پور (فیصل آباد) میں پہلی سالانہ کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں برطانوی کمیونسٹ رہنماؤں سپریٹ اور بریڈلا کے علاوہ ایس اے ڈانگے۔ کیدار ناتھ سہگل، جھنیل داس اور دیگر ہندوستانی کمیونسٹ رہنماؤں نے شرکت کی۔ ریسیپشن کمیٹی کے چیئرمین رام چندر تھے جنہوں نے

اپنی تقریر میں کہا کہ پارٹی دولت کو قومی تحویل میں لینے' سماجی انقلاب برپا کرنے اور سرمایہ دار اور جاگیردار سے استحصال کے خلاف مزدوروں اور کسانوں کو منظم جدوجہد کے لیے تیار کرنے کے لیے کام کرے۔ انہوں نے انکم ٹیکس کے اصول پر زرعی آمدن پر ٹیکس عائد کرنے اور ہندوستانی فوج میں برطانوی فوجیوں کی جگہ ہندوستانیوں کو بھرتی کرنے کی تجاویز پیش کیں اس وقت تک کیرتی کسان پارٹی کا اثر و نفوذ امرتسر' لاہور اور لائلپور تک محدود تھا یہی وجہ تھی کہ پارٹی کے سیکرٹری نے ستمبر 1931ء میں ایک خط کے ذریعے صوبہ سرحد اور دہلی کے مزدور اور کسان تنظیموں کو کیرتی کسان پارٹی کے ساتھ الحاق کی تجویز پیش کی تا کہ وہ اس سال 16 نومبر کو ہونے والی کانفرنس میں اپنے مندوب بھیج سکیں پنجاب کے مختلف اضلاع میں مزدوروں اور کسانوں کی سبھاؤں نے بہت کام کیا تھا خصوصی طور پر دیہی ٹیکسوں میں کمی کے لیے ان کی جدوجہد قابل تعریف تھی۔

الحاق کی اس تجویز نے حکومت کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ پنجاب حکومت کی طرف سے سی سی گاربٹ نے سیکرٹری آف اسٹیٹ لارڈ ایچ ڈبلیو ایمرسن کو 9 نومبر 1931ء کو ایک خط میں لکھا "اگر ان کی یہ تنظیمیں مکمل اور مربوط ہو گئیں تو ہمیں ان سے نمٹنے میں زیادہ مشکل پیش آئے گی۔" چنانچہ حکومت نے کریمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کو کیرتی کسان پارٹی کے خلاف استعمال کرنے کے امکان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اقتصادی کساد بازاری اور زرعی اجناس کی کم قیمت پر فروخت کے باعث پنجاب کا کسان مفلوک الحال تھا حتیٰ کہ کسان ملکہ وکٹوریہ کے دور کے سکے لگان کی صورت میں ادا کرتے حالانکہ یہ سکے ایک عرصہ سے متروک ہو چکے تھے۔ اس حالت میں پنجاب کے کاشتکاروں نے لگان میں کمی کے لیے بہت جدوجہد کی اور ان کی تمام تر سیاسی تحریک کا مقصد لگان میں کمی تھا۔ کیرتی کسان پارٹی کا خیال تھا کہ اپنی سیاسی تحریک سے وہ لگان کم کرانے میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن چونکہ اس تحریک کی حکمتِ عملی سیاسی سے زیادہ انقلابی تھی اس لیے حکومت ان کے مطالبات پر غور کرنے کی بجائے انہیں کچلنے کے اقدامات کرتی رہی وہ دیہات میں پارٹی کے اثر و رسوخ سے خوفزدہ تھی کیونکہ انہی علاقوں میں وہ فوج کے لیے بھرتی کیا کرتی تھی چنانچہ حکومت نے ان کے خلاف تشدد دانہ پالیسی کے ساتھ اب پراپیگنڈا بھی شروع کر دیا تھا جس سے وہ دیہات میں یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس پارٹی کی حکمتِ عملی دیہی عوام کے مفادات کے منافی ہے۔ یہ وہ حالات تھے جس کی بنا پر کیرتی کسان پارٹی نے اپنی خواہش اور نظریاتی جیت کے خلاف انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت حاصل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن حکومت کانگریس کے برعکس یونینسٹ پارٹی کے مقاصد کو آگے بڑھا رہی تھی۔ یہ جماعت 1923ء میں وجود میں آئی اور اس میں زمیندار اور حکومت کے حامی افراد بھاری اکثریت میں شامل تھے اور اس کا مقصد کسی بھی قسم کی سیاسی

تحریک کی مخالفت کرنا اور حکومت کے مقاصد کے حصول کے کام کرنا تھا۔ چنانچہ یونینسٹ پارٹی کے ایک خاص مقصد کے تحت پنجاب کے دیہات میں زمینداروں اور کسانوں کے مابین ایک خلیج پیدا کرنے کا کام ترجیحی بنیادوں پر شروع کر دیا اکثر یہ ہوتا کہ کیرتی کسان پارٹی کے جلسوں میں گڑبڑ کرانے کے لیے جہاں حکومتی کارندے پیش پیش ہوتے وہاں یونینسٹ پارٹی کے ایجنٹ بھی ان کی مدد کو آ جاتے اور یہ کام اس دور میں بہت زیادہ ہوا۔

برطانوی حکومت کیرتی پارٹی کو نوجوان سبھا سے زیادہ خطرناک سمجھتی تھی اس کا خیال تھا کہ نوجوان سبھا لاہور کے شہری علاقوں تک محدود ہے لیکن کیرتی کسان پارٹی کا اثر ورسوخ پنجاب کے دیہات تک پھیلا ہوا ہے۔ پارٹی کے ایک اہم رہنما گورچرن سنگھ سہانسرا نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "پارٹی (کیرتی) کی رکنیت محدود تھی لیکن اس کا پیغام بے حد ہردلعزیز تھا۔ سیاسی سطح پر تو وہ انقلاب کی بات کرتی ہی تھی لگان میں کمی کا مطالبہ کسانوں کے لیے بے حد اہم تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس نے اعلانیہ اور خفیہ سرگرمیوں کے ذریعے کسانوں کو قائل کر لیا۔

پنجاب انقلابی تحریکوں کے جس دور سے گزرا 1919ء سے 1931ء کا عرصہ تحریک آزادی کے حوالے سے سنہرا دور قرار دیا جا سکتا ہے یہی وہ عرصہ ہے جب انگریزی حکومت کو دو عظیم جنگوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے اندر انقلابی قوتوں کے خلاف محاذ کھولنا پڑا اسی عرصہ میں حکومت کے جبر وتشدد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ جلیانوالہ باغ کا خونی واقعہ اور مارشل لا کے نفاذ کے بعد حکومتی دہشت گردی اسی دور میں وقوع پذیر ہوئی یہی وہ واقعات ہیں جنھوں نے گاندھی جی جیسے حکومتی مددگار کو عدم تعاون کی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ کانگریس کی ستیہ گرہ اور عدم تعاون اور عدم تشدد کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ یہ دور تحریکِ خلافت، گوردوارہ سدھار کی جدوجہد، ببر اکالی لہر اور نوجوان سبھا اور کیرتی کسان پارٹی کی جدوجہد آزادی کے لیے یادگار رہے گا۔ اسی دوران لالہ لاجپت رائے کی موت واقع ہوئی۔ لاہور سازش کیس چلا۔ بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کو پھانسی پر لٹکایا گیا اور پنجاب کے کسانوں میں سیاسی شعور اجاگر ہوا پنجاب ہی کی باغیانہ روش تھی جس کی بنیاد پر پنڈت جواہر لعل نہرو نے 31 دسمبر 1929ء کو دریائے راوی کے کنارے سوراج (مکمل آزادی) کا نعرہ بلند کیا جو بعد میں کانگریس کی سیاسی پالیسی کا مرکزی نکتہ ثابت ہوا۔ ان تحریکوں نے ثابت کیا کہ ہندوستان کے عوام غیر ملکی سامراجی قوت کی غیر انسانی اور متشددانہ پالیسیوں کے ساتھ کس قدر نفرت کرتے ہیں اور کس طرح انھوں نے جبر واستبداد کے قوانین اور آرڈی ننسوں کی بنا پر قائم انگریزی حکومت کے خلاف تاریخی جدوجہد کی۔ لیکن تاریخی بدقسمتی یہ تھی کہ ان تحریکوں کا مرکز صرف پنجاب بنا۔ یہ درحقیقت سکھوں کے معاشرے کا پرتو تھا جو اپنے کردار میں غیر فرقہ وارانہ رہا

اور کسی مذہبی تقسیم کے بغیر کامیابی کی طرح چلا اس کے برعکس ان تحریکوں کا مشرقی اور مرکزی ہندوستان کے کسانوں پر اثر نہ ہونے کے برابر تھا کیونکہ وہاں معاشرے کی ہندو مسلمان کے نام پر تقسیم زیادہ گہری تھی۔ یہی وہ روش تھی جسے بعدازاں یونینسٹ پارٹی نے انگریز کے حق میں استعمال کیا اور پنجاب کے دیہات میں اپنا اثر ورسوخ قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ یہی وہ فرقہ وارانہ معاشرتی تقسیم تھی جسے بعدازاں انگریز حکمرانوں نے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کیا اور جس میں اسے کانگریس، مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی اعانت حاصل رہی۔

+

دوسرا حصہ

باب:5

جلیانوالہ باغ کا سانحہ اور پنجاب میں عدم تعاون اورتحریکِ خلافت

لالہ لاجپت رائے نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ایجی ٹیشن جمہوریت کی روح ہے۔ ہر بڑے آدمی کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت زندگی میں ایک مرتبہ ایجی ٹیشن کے دور سے گزرنا پڑتا ہے۔ پنجاب میں بھی بیسویں صدی کے اوائل میں مختلف تحریکیں چلیں خواہ وہ پر امن ہوں یا تشدد آمیز اور انقلابی دور۔ لیکن یہ امر واضح رہے کہ پنجاب میں بیسویں صدی کے آغاز میں جو انقلابی تحریکیں چلیں اور جن کے نتیجے میں تشدد آمیز کارروائیوں نے صوبے کے بعض حصوں کو اپنی لپیٹ میں لیا اس کے اثرات خاصے گہرے تھے ان اثرات کے زائل ہونے اور عدم تشدد کے رجحانات پنپنے میں خاصا وقت لگا یہی وجہ ہے کہ سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں کے اس خیال میں بہت وزن تھا کہ پنجاب میں سیاسی تحریک کی جڑیں دیر سے پھیلیں گی۔ 1936ء اور بعد میں جب صوبے میں فضا پر امن تھی تو بھی عوام کو سیاسی سرگرمیوں کے دائرے میں لانے میں وقت لگا۔ اگرچہ عوام کی اکثریت قتل و غارت جیسی سرگرمیوں کو دل سے پسند نہیں کرتی تھی لوگ انقلابیوں کی بہادری اور قومی مقصد کے لیے جان کی پرواہ نہ کرنے کی ادا کو سراہتے تھے یہ لوگ لوک داستانوں کے ہیرو بن گئے تھے چنانچہ تشدد آمیز اور پر امن سرگرمیوں کے درمیان ایک لکیر موجود تھی جسے پار کرنے میں خاصا وقت صرف ہوا۔ حکومتی سطح پر بھی اس کا ادراک زیادہ نہ تھا اور وہ بھی پر امن سرگرمیوں اور مطالبات کو بھی دہشت گردوں کی کارروائیوں سے الگ کرنے کو تیار نہ تھی حتیٰ کہ وقتی سیاسی ابھار کو بھی اسی طرح دبایا جاتا جس طرح انقلابی تحریکوں کو کچلنے کے لیے اقدامات کئے جاتے غدر پارٹی کے رہنماؤں کو جن ظلم و ستم کا

نشانہ بنانا پڑا اس کے اثرات ابھی تک زائل نہیں ہوئے تھے۔ اسی دوران جنگِ عظیم اوّل کے لیے بھرتی کا سلسلہ شروع ہوا تو پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر نے تمام حکومتی مشینری اور ماتحت عدلیہ کو بھرتی کے لیے وسائل مہیا کرنے کے لیے جھونک دیا۔ 1916ء تک پنجاب سے ایک لاکھ دس ہزار افراد کو فوج میں بھرتی کیا گیا جبکہ پورے ہندوستان سے بھرتی کیے جانے والے افراد کی تعداد ایک لاکھ بانوے ہزار تھی یعنی ان کی اکثریت پنجاب سے تھی۔ پختون علاقوں سے بھرتی ہونے والے افراد کی تعداد 14 ہزار تھی۔ پنجاب نے نہ صرف اس بھرتی کے لیے سب سے زیادہ افرادی قوت فراہم کی بلکہ مالی وسائل مہیا کرنے میں بھی باقی تمام علاقوں پر سبقت حاصل کی۔ اڈوائر کے لیے یہ صورتحال صوبے کی حکومت کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری کی مظہر تھی اور جو بڑے خاندان اس غیر متزلزل وفاداری کے معیار پر پورے اترے ان پر نوازشات کی بارش ہوگئی ان کے بڑوں کو راجہ' نواب' رائے صاحب اور خان صاحب جیسے خطاب سے نوازا گیا ان کو جاگیریں عطا کی گئیں ان کو ٹیکسوں کی ادائیگی میں رعایت حاصل ہوئی۔ وہ اعزازی سندوں اور نقد انعامات کے حقدار قرار پائے اور یہ سب کچھ ان بڑے خاندانوں کی فوجی خدمات کا اعتراف تھا۔ اس کے برعکس برطانوی حکومت عام لوگوں کو ان کے جائز حقوق دینے کے لیے تیار تھی نہ ہی ان کے مطالبات کو درخورِ اعتنا سمجھتی تھی۔ 19-1918ء کے دوران ملک اقتصادی کساد بازاری کا شکار ہوا اور ہر برس اس میں اضافہ ہوتا رہا اور عوام کے مسائل میں مصائب بھی اسی شرح سے بڑھتے رہے۔ ساتھ ہی قحط' طاعون اور انفلوانزا جیسی قدرتی آفات نے بھی حالات کی سنگینی میں اضافہ کیا۔ جولائی 1917ء اور جون 1918ء کے درمیانی عرصہ میں لگ بھگ آٹھ لاکھ لوگ طاعون سے ہلاک ہوئے۔ اس دوران اشیائے صرف کی قیمتوں میں ہوشربا اضافہ ہوا اور چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے باعث ملکی معیشت تقریباً تباہ ہوگئی۔ اشیاء صرف کی گرانی اور کمیابی کے باعث سیاسی سرگرمیاں ایک نیا رخ اختیار کر گئیں۔ صنعتی کارکنوں کی ہڑتالیں روزمرہ کا معمول بن گئیں اور ملک کے کئی حصوں سے لوٹ مار کی خبریں بھی آئیں۔

I

پنجاب کے عوام پر اس اقتصادی دباؤ کا اثر کچھ زیادہ ہی گہرا ہوا کیونکہ اس صوبے پر جنگ عظیم اول کے اثرات بھی پڑے نتیجتاً بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔ صوبے کی انتظامیہ نے جس کا سربراہ سر مائیکل اڈوائر تھا ان حالات کی سنگینی میں یوں اضافہ کیا کہ جاگیرداروں اور متوسط شہری طبقہ کے درمیان خلیج پیدا کر دی اس سے عوامی سطح پر بے چینی میں اضافہ ہوا۔ سرکاری ملازمتوں کے حوالے سے آئلنگٹن کمیشن رپورٹ اور آئینی اصلاحات کے حوالے چیمسفورڈ مونٹگو کی رپورٹ کی اشاعت سے حالات مزید

دگرگوں ہو گئے۔ جنگ عظیم کے دوران حکومت ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ہتھیار سے ملک میں انقلابی سرگرمیاں بری طرح سے کچلیں اور پنجاب اور بنگال میں اس قانون کے تحت انقلابیوں کو کڑی سزائیں دیں۔ سیاسی قیدیوں کو جیل میں اذیتیں دی گئیں ان کو قید تنہائی میں رکھا گیا اور دیگر غیر انسانی سزائیں دی گئیں جس سے شدید ردعمل ہوا۔ حالات معمول پر آنے کے باوجود یہ ہنگامی اختیارات واپس نہیں لیے گئے کیونکہ حکومت ایسا نہیں کرنا چاہتی تھی تا کہ کسی بھی وقت ان قوانین کو استعمال کیا جا سکے۔ 1917ء میں برطانوی جج سرسڈنی رولٹ کی سربراہی میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جس کا مقصد ہندوستان میں باغیانہ سرگرمیوں کا جائزہ لے کر یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ کن حالات میں وقوع پذیر ہوئیں لیکن کمیٹی نے صورت حال کی اصلاح کی بجائے حکومت کو مشورہ دیا کہ انتظامی مشینری کو موثر طریقے سے استعمال کر کے اس سرگرمیوں کو کچلا جا سکتا ہے۔ کمیٹی نے 30 اپریل 1918ء کو اپنی رپورٹ پیش کی جو ان شہادتوں کی بنا پر مرتب کی گئی تھی جو خفیہ سماعت کے دوران حاصل کی گئی تھیں اس کمیٹی نے حکومت کو کڑے انتظامات اختیار کرنے کے لیے کہا۔ کمیٹی کی بنیادی سفارش یہ تھی کہ باغیوں کا مقدمہ ان عدالتوں میں چلایا جائے جہاں جیوری کے ارکان نہ ہوں۔ شبہ کی بنیاد پر انقلابیوں کو جیل میں ڈال دیا جائے یا انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ قانون کے تحت حاصل بنیادی حقوق بہت حد تک سلب کر لیے جائیں اور پریس پر سنسر نافذ کر دیا جائے۔ اس کمیٹی نے گورنر جنرل کو ایسے غیر معمولی اختیارات بھی تفویض کیے جس کی بنا پر وہ بھی سرگرمی کو باغیانہ قرار دیتے ہوئے کچل سکتا تھا اور سب سے بڑھ کر صوبائی حکومتوں کو یہ اختیار دیا کہ وہ شبہ کی بنا پر وارنٹ کے بغیر کسی بھی گھر یا تنظیم کے دفتر میں گھس کر تلاشی لے سکتی تھیں یہ وہ اقدامات نہیں تھے جس کا برطانوی حکومت بازوئے شمشیر زن خیال بھی کر سکتا تھا۔ جنگ کے دوران اتحادی لیڈروں نے انہیں ہندوستان میں شہری آزادیوں کے خواب دکھائے تھے اور جنگ کے بعد وہ اقدامات کیے گئے جو ان کی توقعات کے بالکل برعکس تھے۔

ہندوستان میں اس قانون کو توہین آمیز اور ظالمانہ قرار دیا گیا۔ لیجسلیٹو کونسل کے ہندوستانی ارکان نے اس کی پرزور مخالفت کی تا کہ بل پاس نہ ہو سکے۔ محمد علی جناح نے اس کے خلاف کونسل سے استعفیٰ دے دیا۔ ہندوستانی اخبارات نے بھی اس کی شدید مخالفت کی لیکن تمام تر عوامی جذبات کے برعکس 21 مارچ 1919ء کو یہ قانون پاس ہو کر ایکٹ کی شکل اختیار کر گیا۔ ہندوستانی رہنماؤں نے اس کو ایسا کالا قانون کہا جس کا مقصد شخصی آزادی کی مقبول عام تحریکوں کو کچلنا اور قومی زندگی کو نقصان پہنچانا تھا۔ اس وقت یہ نعرہ بہت عام ہوا کہ قانون کے تحت 'نہ اپیل' 'نہ دلیل نہ وکیل' کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ جنگ عظیم اول اور چمسفورڈ قانونی اصلاحات کے بعد یہ قانون نے سامراجی طاقتوں کے اصل

عزائم کا مظہر تھا۔ مہاتما گاندھی نے کہا حکمرانی کے جسم میں جو مرض پھیلا ہوا ہے یہ قانون اس کی ایک واضح مثال ہے۔ اس کے ساتھ ہی جنگ کے خاتمے پر ترکی کے مستقبل کے بارے میں بے یقینی کی جو فضا پھیلی ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کا بہت اثر لیا اس پر اس قانون کے نفاذ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور تحریکِ خلافت نے جنم لیا مسلمان فوجی سپاہیوں پر تو گویا بجلی گر گئی انہوں نے برطانیہ کی طرف سے جنگ میں حصہ لیا تھا اور اتحادی فوجوں کی فتح میں ایک واضح کردار ادا کیا تھا کیونکہ انہیں جنگ سے پہلے یقین دلایا گیا تھا کہ جنگ کے بعد ترکی کی جغرافیائی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی لیکن جنگ کے بعد اتحادی قوتیں اپنے وعدے سے پھر گئیں اور یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر کے غیر مسلم قوتوں کی تحویل میں دے دیا جائے گا۔ یہ کچھ مسلمانوں کا پیمانہ صبر لبریز کرنے کے لیے کافی تھی چنانچہ ترکی میں خلافت کی بحالی کی تحریک نے جنم لیا اور ہندوستان کے مسلمان اس میں پیش پیش تھے۔ بگڑتی ہوئی اقتصادی صورتحال' سیاسی ابتری' خلافت کی تحریک اور رولٹ ایکٹ نے ہندوستان میں ایسی فضا قائم کر دی تھی جس کو صرف دھماکہ خیز کہا جاسکتا ہے ان حالات میں مہاتما گاندھی نے 25 فروری 1919ء کو ہندوستان بھر میں ستیہ گرہ کی کال دے دی۔

پنجاب میں عوام نے مہاتما گاندھی کی اس اپیل پر بے حد گرمجوشی کا مظاہرہ کیا کیونکہ یہ ان کے لیے مائیکل اڈوائر کی حکومت کے خلاف احتجاج کا ایک موثر طریقہ تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی پنجاب شاخ کے رہنماؤں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیپال نے امرتسر میں اس تحریک کی کامیابی کے لیے کمیٹیاں قائم کیں اور انہیں خطاب کیا۔ کانگرسی رہنماؤں نے اس تحریک کے لیے ایک جذباتی فضا پیدا کر دی تھی اور لوگ جوق در جوق اس میں شامل ہو رہے تھے۔ 30 مارچ کو انہوں نے جو جلسہ کیا اس میں لگ بھگ 30 ہزار افراد شریک ہوئے۔ اس عوامی لہر نے صوبائی حکومت کو پریشان کر دیا۔ امرتسر کے ڈپٹی کمشنر ارونگ نے ڈاکٹر کچلو کو خبردار کیا کہ وہ اس تحریک میں حصہ نہ لے انہوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ 30 مارچ کو اور بعد کے دنوں میں صوبے کے مختلف شہروں اور قصبوں میں اس مسئلے پر ہڑتال ہوئی۔ دہلی میں پولیس نے اس وقت فائرنگ شروع کر دی جب ایک پر امن مظاہرے کے شرکاء ایک ریلوے بکنگ آفس بند کرانے کی کوششیں کر رہے تھے۔ فائرنگ کے نتیجے میں آٹھ افراد ہلاک ہوئے۔ اس واقعے نے پورے شہر اور پنجاب کے دور دراز علاقوں تک فضا کشیدہ کر دی۔ اور کانگریس نے 6 اپریل کو صوبے بھر میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اس روز پورے پنجاب میں مکمل یا جزوی ہڑتال کی اطلاعات موصول ہوئیں۔ پینتالیس قصبوں میں ہڑتال مکمل تھی اور لوگوں نے جلوس نکالے۔ 8 اپریل کو رپواڑی میں ہندو مسلم اتحاد کانفرنس نے جلسہ منعقد کیا جسے برطانوی حکام نے سب سے مزموم سازش قرار دیا۔ اورنگ نے لاہور کے

کمشنر اے جے ڈبلیو کچن کو کہا کہ وہ دہلی میں فوج بھیجے تا کہ حالات پر قابو پایا جا سکے۔ برطانیہ کے خلاف یہ سیاسی تحریک اس قدر ابھری کہ مائیکل اڈوائر نے ان جلسے جلوسوں کو برطانوی حکومتوں کے خلاف سازش اور تاج برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ قرار دے دیا۔ مہاتما گاندھی اس تحریک کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے 8 اپریل کو بمبئی سے دہلی آئے۔ وہاں انہیں سرکاری حکم نامہ ملا جس کے تحت ان کے پنجاب میں داخلے پر پابندی عائد کردی گئی تھی گاندھی نے اس حکم کی خلاف ورزی کا فیصلہ کیا اور امرتسر کی طرف روانہ ہو گئے راستے میں پلوال کے نزدیک انہیں گرفتار کرلیا گیا اور واپس بمبئی بھجوادیا گیا۔ گاندھی کے خلاف اس اقدام کے نتیجے میں پنجاب سمیت ملک کے دوسرے علاقوں میں شدید ردعمل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر حکومت نے پنجاب کی چھاؤنیوں میں مزید فوجی کمک پہنچادی اور 9 اپریل کو ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیپال کو امرتسر سے ہٹانے کا فیصلہ کیا۔ اتفاق سے اس روز ہندوؤں نے اپنے مذہبی تہوار رام نومی کے موقع پر ایک جلوس نکالا ہوا تھا جس میں بڑی تعداد میں مسلمان بھی شریک ہو رہے تھے۔ ڈپٹی کمشنر دہلی کا خیال تھا کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کا اس طرح اکٹھے ہو جانا ایک نئی سیاسی اہمیت اختیار کرگیا ہے۔ حکمران یقیناً اضطرابی کیفیت سے دوچار تھے اور اسی حالت میں انہوں نے ایک ایسا اقدام کیا جس سے ان کے خیال میں مصیبت ٹل سکتی تھی۔ اروِنگ نے ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیپال کو 10 اپریل کو صبح 10 بجے اپنے بنگلے پر بلوایا اور انہیں ضلع بدری کا حکم سنایا اس نے دونوں کو عقبی دروازے سے باہر نکالا اور ایک گاڑی میں بٹھا کر دور لے جایا گیا۔ انگریز افسر کا خیال تھا کہ ان رہنماؤں کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد صورت حال بہتر ہو جائے گی۔ لیکن جب کانگریس کے کارکن جو اپنے رہنماؤں کے ہمراہ اروِنگ کے بنگلے پر آئے تھے احتجاج کیا تو انہیں نظر بند کردیا گیا۔ لیکن یہ خبر چھپی نہ رہ سکی بلکہ جنگل کی آگ کی طرح پورے امرتسر میں پھیل گئی۔ اس کے فوراً بعد تمام بازار بند ہو گئے اور لوگ جوق در جوق ہال گیٹ کے پاس جمع ہونا شروع ہو گئے۔ ان کی منزل ڈپٹی کمشنر کا بنگلہ تھی تا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو رہا کروا سکیں۔ ڈپٹی کمشنر پہلے ہی شہر کے اہم ناکوں پر فوج تعینات کر چکا تھا۔ جس نے اس جلوس کو ریلوے پھاٹک کے پاس روک لیا۔ جب جلوس کے شرکاء نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو فوج اور پولیس نے گولی چلادی جس سے بعض لوگ موقع پر ہلاک ہو گئے اور متعدد زخمی ہوئے۔ جب لوگوں نے اپنے ساتھیوں کی لاشیں دیکھیں تو وہ اور مشتعل ہو گئے اور ڈنڈے اور لاٹھیاں لے کر موقع پر پہنچ گئے۔ اس دوران دو وکیل مسٹر سلہریا اور مسٹر مقبول محمود نے مشتعل ہجوم کے جذبات ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور اس میں انہیں کامیابی بھی ہو رہی تھی کہ مجمع میں سے کسی نے فوج پر پتھر پھینکنا شروع کر دیئے۔ فوج نے پھر گولی چلادی جس کے نتیجے میں بیس افراد ہلاک اور بے شمار زخمی ہو گئے۔ اس دوران قریبی ہسپتالوں میں

سے زخمیوں کو لانے کے لیے سٹریچر بھیجے گئے لیکن حکام نے بے حد سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زخمیوں کو وہاں سے ہٹانے کا کام روک دیا۔ اس کے بعد ہجوم کا اشتعال اس حد تک بڑھا کہ اس نے پورے شہر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب ہجوم پرامن نہیں رہا تھا۔ اس نے سرکاری عمارتوں، بنکوں جس میں نیشنل اور الائنس بنک، ٹاؤن ہال، مرکزی ڈاک خانہ، مشن ہال اور بھاکتاں والا ریلوے اسٹیشن کو آگ لگا دی اور چھ برطانوی افراد کو قتل کر دیا۔ ان میں ایک مشنری سکول کی مس شیروڈ بھی شامل تھیں جسے قتل کر کے امرتسر کی ایک گلی میں پھینک دیا گیا۔

مشتعل ہجوم نے نیشنل بنک کے گوداموں کو بھی آگ لگادی اور دکانوں کو بھی لوٹ لیا۔ قتل و غارت کا یہ سلسلہ شام 5 بجے تک جاری رہا اس دوران تار اور ٹیلیفون کا نظام بھی منقطع ہو گیا۔ یہ آگ امرتسر کے دیہات میں بھی پھیلی اور یورپی خاندانوں کو مجبوراً مقامی قلعے اور دیگر محفوظ مقامات پر پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

بعد ازاں انکوائری ٹربیونل کے روبرو بیان میں مسٹر مقبول نے کہا کہ ہجوم اپنے رہنماؤں کی امرتسر بدری سے پہلے ہی مشتعل تھا اس کے باوجود وہ حکام سے معاملہ چاہتے تھے لیکن جواب میں انہیں جارحانہ احکام سننا پڑے ساتھ ہی ان پر گولی چلادی گئی اگر حکام صورتحال کا اندازہ لگاتے ہوئے قدرے تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کرتے تو اشتعال پر قابو پایا جا سکتا تھا۔ حکام نے وہ زبان استعمال کی جس کی لوگ توقع نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی وہ ایسا کچھ سننے کے موڈ میں تھے۔ "ڈپٹی کمشنر خود وہاں تھا جب فائرنگ کھولی گئی ابتداء میں ہجوم نے پیچھے ہٹنا شروع کیا ان کا خیال تھا کہ گولی چلانا بند کر دی جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا بلکہ بھاگتے ہوئے لوگوں پر گولی چلانے کا سلسلہ جاری رہا۔ بہت سے لوگوں کو پیٹھ پر گولیاں لگیں اکثر مرنے والوں کے جسم پر کمر کے پیچھے گولیوں کے نشان ملے۔ زیادہ تر زخمی افراد کو سروں اور چہروں پر گولیاں لگیں۔" اگرچہ یورپی افراد خصوصاً خواتین کے خلاف تشدد اور بنکوں اور دیگر سرکاری عمارتوں کو لوٹنے اور انہیں نذر آتش کرنے کے واقعات ہر لحاظ سے قابلِ مذمت تھے اور ہر ذمہ دار فرد نے ان پر کڑے لفظوں میں نکتہ چینی کی لیکن حکام نے ہجوم کے ساتھ جو سلوک کیا اور جس طرح فوج نے انہیں گولیوں کا نشانہ بنایا وہ بھی اسی طرح مذمت کے قابل تھے۔

جب گورنر اڈوائر کو لاہور میں یہ خبریں موصول ہوئیں تو اس نے ڈپٹی کمشنر کچن کو فوراً امرتسر روانہ کر دیا جہاں کا ڈپٹی کمشنر اروِنگ پہلے ہی شہر کو فوج کی تحویل میں دے چکا تھا۔ جب جنرل ڈائر نے جو فوج کی سربراہی کر رہا تھا شہر کا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا تو کچن نے اڈوائر کو مکمل رپورٹ پیش کر دی جس پر اس نے اطمینان کا اظہار کیا۔ امرتسر کے حالات کا علم جب دوسرے شہروں میں ہوا تو وہاں کے لوگوں نے بھی غم و غصہ کا اظہار کیا۔ 12 اپریل کو قصور میں مکمل ہڑتال ہو گئی اور وہاں مشتعل عوام نے

ریلوے سٹیشن کو آگ لگانے کی کوشش کی اور یورپی خاندانوں کے گھروں پر حملہ کر دیا۔ بعض جگہ یورپی مسافروں کو تشدد کا نشانہ بھی بنایا گیا لیکن وہ قریبی پولیس سٹیشنوں اور دیگر سرکاری عمارات میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم پولیس نے فوج کی مدد سے جلد ہی قصور میں حالات پر قابو پالیا۔ ترن تارن سے بھی اسی قسم کی خبریں موصول ہوئیں۔ لاہور میں بھی صورتحال بگڑتی جا رہی تھی لیکن فوج تعینات ہونے کے بعد حالات بگڑنے سے بچ گئے۔

پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اڈوائر نے 12 اپریل کو شملہ میں حکومت ہند کو بذریعہ فون پنجاب کے حالات سے آگاہ کیا وہاں سے جواب میں یہ کہا گیا کہ صورتحال قابو میں کرنے کے لیے اگر فوج کو گولی بھی چلانا پڑی تو گریز نہ کیا جائے "لوگوں کے لیے ایک مثال کردی جائے کہ باغیانہ سرگرمیوں کا انجام کیا ہوتا ہے" اڈوائر نے جنرل ڈائر کو یہ بات بتا دی لیکن بعدازاں اس نے اس بات کی تردید کی کہ اس نے مرکز سے ملنے والی اطلاع ڈائر کو دی تھی لیکن اس تردید کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی جبکہ 24 گھنٹے بعد ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں اس کا ثبوت فراہم کر دیا تھا۔ 10 اپریل کو قتل و غارت اور آتش زنی کے بعد امرتسر میں خاموشی کا عالم تھا حتیٰ کہ معمولی جرائم تک نہیں ہوئے تھے۔ حکام نے بھی کافی لیت و لعل کے بعد لوگوں کو اپنے مردے دفن کرنے اور ان کی چتاؤں کو آگ لگانے کی اجازت دے دی تھی لیکن انہیں یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ وہ دو بجے تک اپنی آخری رسوم سے فارغ ہو کر گھر پہنچ جائیں لیکن سزا کے طور پر بجلی اور پانی کی فراہمی معطل تھی حتیٰ کہ ہندوستانیوں سے یہ کہہ کر بجلی کے پنکھے بھی لے لیے تھے کہ انہیں یورپی خاندانوں تک پہنچانا ہے۔ اس پرسکون ماحول میں بھی مائیکل اڈوائر یہ رپورٹ حکام بالا تک پہنچا رہا تھا کہ "امرتسر میں حالات تشویشناک حد تک خراب ہیں مشتعل باغیوں نے شہر اپنے قبضے میں لے رکھا ہے اور حالات مزید خراب کرنے کے درپے ہیں۔ پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی اسی طرح کا اشتعال پھیلا ہوا ہے اور کسی وقت بھی صورتحال قابو سے باہر ہو سکتی ہے۔" تاہم کانگریس کی اپنی انکوائری کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی اس سے اڈوائر کی "تشویش" کی نفی ہوتی تھی اس کمیٹی کا کہنا تھا کہ سرکاری رپورٹوں میں حد درجہ مبالغہ آرائی کی گئی ہے۔

مائیکل اڈوائر نے 12 اپریل کو ایک سرکاری اعلان کے تحت ہر قسم کے اجتماعات اور جلسے جلوسوں کی ممانعت کر دی گئی لیکن یہ اعلان عوام تک پہنچانے کا اہتمام نہیں کیا گیا اور اس امر کا اعتراف ہنٹر کمیشن نے بھی کیا کمیشن کے ایک رکن کولون کا کہنا تھا اگر یہ اعلان موثر طریقے سے عوام تک پہنچایا جاتا تو ہو سکتا ہے کہ جلیانوالہ باغ میں جلسہ عام کا اعلان نہ کیا جاتا۔ جلیانوالہ باغ میں جو ہجوم تھا وہ کسی طور باغیوں کا اجتماع نہ تھا۔ اس بات کا اعتراف خود جنرل ڈائر نے بھی ہنٹر کمیشن کے روبرو کیا۔ وہ 13 اپریل کا دن تھا

اس روز بیساکھی کا تہوار تھا اور دور و نزدیک سے لوگ امرتسر میں اس لیے جمع تھے کہ وہاں ہر سال بیساکھی کا میلہ جوش و خروش سے منایا جاتا تھا۔ اس روز جلیانوالہ باغ میں ہزاروں لوگ جمع تھے وہاں ایک میلے کا سماں تھا اور لوگ ہنسی خوشی کھیل کود میں مصروف تھے۔ ایک انگریز صحافی سونسن نے اپنی رپورٹ میں لکھا ''سینکڑوں لوگ باغ کی گھاس پر سوئے ہوئے تھے' کچھ لوگ تاش کھیل رہے تھے اور بہت سے ایسے لوگ بھی تھے جو اپنے بچوں کے ہمراہ آئے ہوئے تھے اور ان بچوں کی عمریں تین سے بارہ برس کی تھیں۔ شاید اس وقت بیس ہزار کے لگ بھگ لوگ باغ میں موجود ہوں گے جس کے ارد گرد اونچے اونچے مکان تھے لیکن جس کی بلند دیوار میں داخلے کے صرف چار تنگ دروازے تھے۔ جنرل ڈائر اپنی فوج کے ہمراہ باغ میں داخل ہوا اور بکتر بند گاڑیاں باہر اس لیے چھوڑ دیں کہ وہ ان تنگ دروازوں سے اندر داخل نہیں ہو سکتی تھیں۔ جونہی فوج اندر داخل ہوئی اس نے اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں۔ فوجیوں نے مشین گنوں میں فوراً گولیاں بھر لیں اور صرف تیس سیکنڈ کے اندر فائرنگ شروع کر دی جو کہ دس سے پندرہ منٹ تک جاری رہی اس دوران کم از کم سولہ سو پچاس راؤنڈ فائر کیے گئے۔ جنرل نے فائرنگ بند کرنے کا حکم صرف اس وقت دیا جب فوجیوں کے پاس اسلحہ ختم ہو گیا۔ ہجوم بوکھلاہٹ کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہا تھا اور جب لوگ باہر جانے کے لیے تنگ دروازوں کا رخ کرتے تو انہیں وہاں گولیوں کی بوچھاڑ کا سامنا کرنا پڑتا۔ یہ ایک عجیب ہولناک منظر تھا کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی ہر کوئی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ لوگ گر رہے تھے' سنبھل رہے تھے اور پھر ایک دوسرے سے ٹکرا کر گر رہے تھے۔ باغ میں کئی جگہ پر مرنے اور زخمی ہونے والوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ لوگ گولیاں کھا کر زخمی ہو کر گرتے تو پھر سر اٹھانے کی کوشش کرتے لیکن اسی اثناء میں وہ درجنوں دوسرے زخمیوں کے نیچے دب کر رہ جاتے فائرنگ جاری تھی سینکڑوں ایسے لوگوں نے جو دروازوں کے راستے باہر نکلنے میں مایوس ہو چکے تھے دیواریں پھلانگنے کی کوشش کی۔ یہ دیواریں بعض جگہ پانچ فٹ بعض جگہ سات فٹ اور بعض جگہ دس فٹ بلند تھیں۔ وہ چھلانگ لگا کر اوپر پہنچنے کی کوشش کرتے کئی ایسے بھی تھے جو ان کے ساتھ چمٹنے میں کامیاب ہو چکے تھے اب ان دیواروں کے ساتھ جگہ حاصل کرنے کے لیے تگ و دو ہو رہی تھی اور لوگ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے ہوئے تھے لیکن ان کو بھی نہیں بخشا گیا فوجیوں نے ان کو گولیوں کا نشانہ بنایا بلکہ گورکھا فوجی اس کشمکش میں نظر آئے کہ وہ کس طرح ہر پوزیشن میں لوگوں کو گولیوں کی بوچھاڑ پر رکھ سکتے ہیں۔''

نہتے لوگوں پر اندھا دھند فائرنگ کے نتیجے میں 337 لوگ ہلاک ہوئے اور 1500 سے زائد زخمی ہوئے اور یہ اعداد و شمار سرکاری رپورٹوں سے حاصل کیے گئے ہیں جن میں یہ بھی لکھا ہے کہ لڑنے والے میں 41 نو عمر لڑکے اور ایک سات سالہ بچہ بھی شامل تھا۔ غیر سرکاری طور پر جمع کیے گئے اعداد و شمار

میں بتایا گیا ہے کہ ہلاک ہونے والوں کی تعداد پانچ سے چھ سو کے درمیان رہی ہوگی لیکن افسوسناک امر یہ ہے کہ 20 اگست تک ہلاک اور زخمی ہونے والے افراد کے بارے میں اعداد و شمار جمع کرنے کا کام سرکاری سطح پر شروع نہیں کیا گیا۔

سامراجی قوتیں محکوم قوموں پر کس قدر ظلم و ستم کر سکتی ہیں انگریز کی حکومت نے جلیانوالہ باغ کے قتل عام سے ایک نئی داستان کو جنم دیا لیکن جنرل ڈائر نے اس خون آشام واقعہ سے شائد اذیت پسندی کی مثال قائم کر دی اس نے ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی مدد کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا کیونکہ بقول اس کے یہ اس کا کام نہیں تھا۔ چنانچہ بے گور و کفن لاشوں کو اٹھانے اور زخمیوں کو طبی امداد بہم پہنچانے کے لیے سرکاری سطح پر کوئی انتظام نہیں کیا گیا صرف سماجی تنظیم سیوا استی نے تھوڑا بہت کام کیا جب جنرل ڈائر سے اس بارے میں استفسار کیا گیا تو اس نے کہا کہ "وہ (زخمی) ہسپتال جا سکتے ہیں۔" ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ مرے ہوئے بچے مری ہوئی ماؤں کے سینوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ عورتیں' بچے' بوڑھے اور جوان اپنے ہی خون میں لت پت پڑے تھے۔ اپریل کا سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اور زخمیوں کے لیے ایک بوند پانی نہیں تھا وہ زخموں سے چور اور پیاسے لبوں پر جمی ہوئی پپڑیوں سمیت زمین پر پڑے تھے۔ قتل عام کی رات اس قدر بھیانک تھی کہ ہر طرف باغ میں لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ایک خوفناک خاموشی طاری تھی اور جنگلی جانور دیواروں پر اس تاک میں بیٹھے تھے کہ کب ان کو تر نوالہ بناتے ہیں۔ رتن دیوی نامی ایک عورت ہاتھ میں بانس کا ڈنڈا لئے اپنے شوہر کی لاش کے گرد رات بھر پہرہ دیتی رہی تاکہ لاش کو گیدڑوں اور بھیڑیوں کی چیر پھاڑ سے محفوظ رکھ سکے۔ رتن دیوی بتاتی ہے "وہاں تین آدمی اور بارہ برس کا ایک لڑکا زخموں سے چور پڑے کراہ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی ڈھارس بندھی۔ انہوں نے مجھ سے التجا کی کہ میں وہ جگہ چھوڑ کر نہ جاؤں وہ خوفزدہ لگ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنے شوہر کی لاش چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ ان میں سے ایک نے مجھ سے پینے کے لیے پانی مانگا لیکن پانی کہاں تھا۔ اس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے جب ایک شخص نے جس کی وضع قطع جاٹوں جیسی تھی مجھے دیوار پر سے آواز دی اس نے کہا میں اسے اوپر اٹھا کر دیوار کی اوپری سطح پر احتیاط سے رکھ دوں وہ اینٹوں میں الجھا ہوا تھا اور کوشش کے باوجود خود کو اوپر نہیں اٹھا پا رہا تھا۔ میں اس کے پاس گئی اور اسے اس کے کپڑوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا تو میرے ہاتھ اس کے خون سے لت پت ہو گئے۔ میں نے وہ ساری رات وہاں گزاری اور بیان نہیں کر سکتی کہ وہاں کیا سماں تھا۔ لاشوں کے ڈھیر جگہ جگہ لگے ہوئے تھے ان میں چھوٹے چھوٹے معصوم بچے بھی تھے...... انہیں سینکڑوں لاشوں کے درمیان میں نے ساری رات وہاں گزاری۔"

امرتسر میں کرفیو نافذ کر دیا گیا تھا اور رات کے آٹھ بجے کے بعد کسی کو باہر نکلنے کی اجازت نہ

تھی حتیٰ کہ مرنے والوں کے رشتہ دار بھی اپنے مقتولین کو نہیں اٹھا سکتے تھے۔ نہ ہی سیوا سمتی کو اس وقت کے بعد مرنے اور زخمی ہونے والوں کو ان کی منزل تک پہنچانے کی اجازت تھی۔ مارشل لاء 9 جون تک جاری رہا اور اس دوران انتظامیہ نے یکے بعد دیگرے اس قدر حکم نامے جاری کئے کہ شہریوں کی زندگی اجیرن ہو گئی۔ کانگریس کی انکوائری کمیٹی نے درج ذیل اقدامات کا ذکر کیا:

1۔ جس گلی میں مس شیروڈ کا قتل ہوا اسے لوگوں کو کوڑے لگانے کے لیے مختص کر دیا گیا اس کے علاوہ وہاں سے گزرنے والے ہر ہندوستانی کے لیے لازم تھا کہ وہ پیٹ کے بل رینگ کر گلی عبور کرے۔

2۔ شہریوں کو ذلیل کرنے کے لیے یہ حکم جاری کیا گیا کہ وہ جب بھی کسی انگریز کو دیکھیں اسے جھک کر سلام کریں۔

3۔ لوگوں کو سرعام کوڑے مارے گئے۔ اس سزا کے لیے کوئی بڑا قصور کرنا ضروری نہ تھا۔

4۔ امرتسر کے ہر وکیل کو خصوصی کانسٹیبل بنا دیا گیا اور ان میں سے کئی وکیلوں کو معمولی قلیوں کے کام پر لگا دیا گیا۔

5۔ شہر میں اندھا دھند گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں اس سلسلے میں یہ نہیں دیکھا گیا کہ کس کا کیا رتبہ ہے اور وہ کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ گرفتاری کے بعد بے شمار لوگوں کو نظر بندی میں رکھا گیا اور اس دوران ان پر تشدد کیا گیا اور انہیں ذلیل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا گیا۔ انگریز انتظامیہ ہر ایک سے کہتی کہ وہ فلاں فلاں جرم قبول کرلے۔

6۔ ایک خصوصی ٹریبونل مقرر کیا گیا جس میں انصاف کے نام پر بے حد ناانصافی روا رکھی گئی۔ اس ٹریبونل کی جانب سے دی گئی سزا کی کوئی اپیل نہ تھی۔

جس گلی سے رینگ کر گزرنے کا حکم جاری ہوا اس کے دونوں طرف دو دو منزلہ مکان تھے گلی بے حد تنگ، گندی اور گنجان آباد تھی اس لیے یہ وہاں کے رہائش رکھنے والے افراد کے لیے ذلت کے علاوہ بھی دشواریوں کا باعث بنی وہ بازار سے اشیائے صرف نہیں لا سکتے تھے اور گھروں کی صفائی کا بندوبست بھی نہیں کر سکتے تھے یہ سزا پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بنی۔ حتیٰ کہ مائیکل اڈوائر کو بھی جنرل ڈائر کو ٹوکنا پڑا کیونکہ اس سے دنیا بھر میں برطانوی حکومت کی بدنامی ہوئی۔ اس گلی میں انتظامیہ نے پولیس تعینات کر رکھی تھی تا کہ کوئی بھی رینگ کر گزرنے کی سزا سے نہ بچ سکے۔ گلی ہی میں ایک جگہ کوڑے لگانے کے لیے ایک جگہ مخصوص کی گئی تھی اور جو تھوڑا سا بھی سر اوپر اٹھاتا اس کے لیے کوڑوں کی سزا سنا دی جاتی اسے ایک مخصوص جگہ پر پہنچ کر کوڑے کھانا اور اپنی سزا پوری کرنا پڑتی۔ کوڑے اس قدر سفاکی سے لگائے جاتے کہ اکثر لوگوں کے جسم زخمی ہو جاتے جوان عمر لڑکوں کو بھی یہ سزا جھیلنا پڑی ان میں سے ایک نوجوان یوگندر

سنگھ کو 30 کوڑوں کی سزا سنائی گئی مگر وہ چوتھے ہی کوڑے پر بے ہوش ہو گیا اس کو پانی پلا کر ہوش میں لایا گیا لیکن اسے بہر حال باقی 26 کوڑے بھی کھانا پڑے۔ جب اس کی سزا پوری ہو گئی تو اس کے جسم سے خون رس رہا تھا اور وہ بے ہوش تھا اسے اس حالت میں اٹھا کر لیجایا گیا۔

امرتسر میں خون کی جو ہولی کھیلی گئی اس کا ردعمل پنجاب کے دوسرے شہروں میں ہوا لیکن انگریز کا ظلم بھی اسی قدر شدید تھا۔ صوبے کے پانچ اضلاع میں جن میں لاہور بھی شامل تھا مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ امرتسر کے بعد اگر کسی اور شہر میں لوگوں کی کمبختی آئی تو وہ لاہور تھا جہاں متعدد افراد کو سرِ عام کوڑے لگائے گئے۔ مارشل لاء 15 سے 24 اپریل تک نافذ رہا اور اس دوران کرنل جونسٹن نے جو مارشل لاء کے دوران لاہور کا نگران اعلیٰ تھا 15 اپریل سے 29 مئی 1919ء تک خود سرسری مقدمات کی سماعت کی اس نے 277 افراد پر فرد جرم عائد کی اور 201 کو سزائیں سنائیں۔ زیادہ سے زیادہ سزا دو برس قید 30 کوڑے اور ایک ہزار روپے جرمانہ تھا۔ ان میں کئی ایسے مجرم بھی تھے جنھوں نے شہر میں چسپاں بعض مقامات سے نوٹس پھاڑے تھے۔ اس دوران لاہور میں 500 طلبا اور اساتذہ گرفتار کیے گئے اور ان کو پیدل شاہی قلع تک سزا کے طور پر لیجایا گیا۔ ہر دلعزیز سیاسی رہنماؤں جن میں پنڈت رام بھاج دت، ہری کرشن لال اور دونی چند شامل تھے کو ضلع بدری کی سزا ملی۔ اسی دوران قصور میں 11 اپریل کو ہڑتال ہو گئی لوگ مشتعل تھے اور ایک جگہ جمع ہو رہے تھے اس نے ہجوم کی شکل اختیار کر لی جس کے شرکاء نے یورپی لوگوں کو قتل کر دیا۔ ریلوے سٹیشن اور دیگر سرکاری عمارتوں کو نذر آتش کرنے کی کوشش کی اور تار اور ٹیلیفون کا نظام درہم برہم کر دیا ایک مرتبہ پھر فوج کو بلایا گیا جس نے مشتعل ہجوم کے گرد گھیرا تنگ کرنے کی کوشش کی لیکن لوگ فوج کو آتے دیکھ کر بھاگ نکلے۔ لیکن انگریز انتظامیہ کے اہلکار ایک سکول سے ہائی کلاس کے چھ لڑکوں کو اٹھا کر ایک جگہ لے آئے اور انہیں کوڑے مارے۔ لائلپور کے ایک سکول کے تمام طلباء کو اٹھا کر میجر سمتھ کے دفتر کے باہر ایک میدان میں لا کھڑا کیا گیا ان میں سے اکثر کے ہاتھ پیچھے باندھے گئے۔ انہیں سر جھکا کر میجر کے سامنے سے ایک قطار پر گزرنے اور یونین جیک کے سامنے تعظیم بجالانے کو کہا گیا اور انہیں یہ حکم ماننا پڑا۔

گوجرانوالہ میں لوگوں کو ایک صبح ایک عجیب منظر دیکھنے کو ملا۔ ریلوے سٹیشن کے ایک طرف کٹے سر والا بچھڑا بندھا تھا تو دوسری طرف ایک مرا ہوا سور ٹنگا ہوا تھا یہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتعال پھیلانے کے لیے کیا گیا تھا اور اس میں کسی کو کوئی شک نہیں تھا کہ انتظامیہ کی کارروائی ہے۔ چنانچہ مشتعل ہجوم نے جس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے ریلوے اسٹیشن کو آگ لگا دی۔ ریل کی پٹڑی اکھاڑ دی اور مواصلات کا نظام تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس پر انگریز انتظامیہ نے فضائیہ کی خدمات طلب کر لیں

چنانچہ ائرفورس کے طیاروں نے گوجرانوالہ اور نواحی دیہات میں بمباری کی ایک فوجی دستہ بھی طلب کیا گیا جس نے گوجرانوالہ ریلوے سٹیشن کے اندر اور باہر لوگوں کو منتشر کرنے کے لیے مشین گنوں سے فائرنگ کی۔ ایک نزدیکی گاؤں پر بھی فضائیہ کے طیاروں نے بمباری کی لیفٹیننٹ ڈوڈ کنز نے ایک کشادہ مکان کو جہاں لوگ جمع تھے بھی بموں کا نشانہ بنایا۔

پنجاب انگریز کے روح فرسا مظالم تلے سسک رہا تھا لیکن مارشل لاء کے نفاذ اور اخبارات پر سنسر شپ کے باعث ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں صحیح خبریں نہیں پہنچ رہی تھیں جب کچھ عرصہ بعد لوگوں کو حقیقتِ حال کا علم ہوا تو پورا ہندوستان سراپا احتجاج بن گیا۔ ملک بھر میں سیاسی اجتماعات منعقد ہوئے جن میں پنجاب میں ہونے والے مظالم کی شدید مذمت کی گئی کانگریس نے کہا "جس طرح ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عورتوں اور بچوں اور دیگر معصوم عوام کو قتل عام کیا گیا اور جو مظالم نہتے عوام پر توڑے گئے حالیہ تاریخ میں اس سفاکی کی مثال نہیں ملتی" پنجاب میں بھی سیاسی اجتماعات میں انگریز کے ظلم و بربریت کی کڑے الفاظ میں مذمت کی گئی اور قراردادیں منظور کی گئیں جن میں مطالبہ کیا گیا کہ مارشل لاء کے دوران اور بعد میں ہونے والے ان واقعات کے ذمہ دار افراد کے خلاف کارروائی کی جائے۔ لیکن انگریز حکومت کی سفاکی ملاحظہ ہو کہ ان ہولناک واقعات کے بعد بھی لارڈ چیمسفورڈ اور مائیکل اڈوائر نے امرتسر کا دورہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں 13 اپریل اجتماع کے بعد برطانوی حکومت نے ایوان بالا کے رکن لارڈ ہنٹر کی سربراہی میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا جس کا دائرہ کار مارشل لاء کے دوران پنجاب میں حکومتی مظالم کی جانچ پڑتال کرنا تھی۔ ساتھ ہی کانگریس کے موتی لعل نہرو کی سربراہی میں اپنا تحقیقاتی کمیشن مقرر کر دیا۔ ہنٹر کمیشن نے جو رپورٹ مرتب کی اس کا لب لباب یہ تھا کہ پنجاب میں مارشل لاء کے نفاذ کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور اگر مارشل لا نافذ کر بھی دیا گیا تھا تو اسے اس قدر طول نہیں دینا چاہیے تھا۔ کمیشن نے یہ بھی کہا کہ مارشل لاء کے دوران انگریز انتظامیہ نے ضرورت سے زیادہ کڑی سزائیں سنائی ہیں تاہم کمیشن نے مائیکل اڈوائر کی اس بات سے اتفاق کیا کہ پنجاب میں ایک منظم بغاوت کی صورت حال پیدا ہوئی تھی اور ان حالات میں معمولی سے زیادہ سزائیں بغاوت کو کچلنے کے لیے ضروری تھیں لیکن لارڈ مونٹگو نے اس دلیل سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے اس امر کا اعتراف کیا کہ جنرل ڈائر کو جلیانوالہ باغ میں جمع پرامن اور نہتے عوام کو اس قدر سزا دینے کا اختیار نہ تھا۔ اس نے لندن میں بادشاہ کو خط لکھا کہ لندن کی حکومت کو پنجاب حکومت کے بلا جواز اقدامات اور جنرل ڈائر کی مبالغہ آمیز حد تک زیادتی اور سزا کی کڑے الفاظ میں مذمت کرنا چاہیے اور ملک کے اندر احتجاج کی جو لہر تھی اس کا حقیقی اظہار ہندوستان کے عظیم شاعر رابندرناتھ ٹیگور نے کیا۔ اپنے مشہور خط میں جو انہوں

نے اپنے سر کے خطاب کی واپسی کے لیے حکومت برطانیہ کو لکھا ٹیگور نے کہا ''اب وقت آ گیا ہے کہ میں کہہ اٹھوں کہ آپ نے جو تمغے میرے جسم پر سجائے تھے ان کی چمک میرے اور میرے ہم وطنوں کے لیے شرمندگی اور اذیت ناک ذلت کا باعث بن گئی ہے۔ میں ان خطابات کو واپس کر کے اپنے اندر یہ ہمت پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اب اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ان کی دل جوئی کیلئے کھڑا ہو سکوں کیونکہ ان کے ساتھ جو روح فرسا سلوک ہوا ہے اور انہیں جس ذلت کا نشانہ بنایا گیا ہے وہ کسی بھی طور نوع انسانی کے لیے لائق نہیں یہی وہ وجہ ہے کہ اب میں ہز میجسٹی کی حکومت سے اپنے شدید قلبی ہیجان کی بات کر سکوں اور اس سے کہہ دوں کہ آپ کے تمام تر احترام کے باوجود میں خود کو ان خطابات کی قید سے آزاد کرتا ہوں۔''

برطانوی سامراج کی دو عملی اس بات سے بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب ہندوستان بھر کے لوگ پنجاب انتظامیہ کی بربریت کے بعد سکتے کے عالم میں تھے اس سفاکانہ ڈرامے کے مرکزی کردار جنرل ڈائر کا لندن میں ایک ہیرو کی طرح خیر مقدم کیا گیا اور اسے ہندوستان کے نجات دہندہ کے خطاب سے نوازا گیا۔ لندن کے اخبار مورننگ پوسٹ کے ایڈیٹر نے برطانیہ کے لوگوں سے 30 ہزار پونڈ کا چندہ اس لیے اکٹھا کیا تا کہ جنرل ڈائر کو سلطنت برطانیہ کی خدمات کے صلے میں انعام دیا جائے۔ برطانیہ کی کنزرویٹو ٹوری پارٹی کے اکثر ارکان اور ہاؤس آف لارڈز کے متعدد ممبروں نے جنرل ڈائر کا دفاع کرنے کے لیے ایک تنظیم قائم کی تا کہ ڈائر کو حکومت کی کسی ممکنہ سزا سے بچانے کا اہتمام کیا جائے۔ ان ارکان نے حکومت کی جانب سے جنرل ڈائر کو سرزنش کرنے کی کارروائی کی بھی مخالفت کی۔ برطانیہ کی آرمی کونسل جس نے جنرل ڈائر کے کیس کا دفاع کرنے کا ذمہ اٹھایا تھا۔ سفارش کی کہ اس خونی جرنیل کو صرف یہ سزا دی جائے کہ اسے ریٹائرمنٹ کے بعد نصف پنشن دی جائے۔ آرمی کونسل نے یہ بھی کہا کہ جلیانوالہ باغ میں جنرل ڈائر سے صرف اندازے کی غلطی ہوئی تھی۔ برطانیہ کی کورٹ آف جسٹس نے ڈائر کو بعد ازاں اس الزام سے بھی بری کر دیا۔ اس دوران پنجاب کے عوام نے جلیانوالہ باغ میں قتل ہونے والے افراد کے اہل خانہ کے ساتھ ہمدردی کے اظہار کے ساتھ ساتھ ان کی مالی مدد کا بھی فیصلہ کیا پورے صوبے میں عورتوں اور مردوں نے دل کھول کے اس فنڈ میں چندہ دیا جو کہ شہدائے جلیانوالہ باغ کے نام سے قائم کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر ستپال نے جب ایک نو سالہ مقتول بچے کے لیے فنڈ ز اکٹھا کرنے کی مہم شروع کی تو سب سے پہلے اس کی خالہ نے سونے کی چوڑیاں اور کپڑے دیئے۔ فنڈ ز اکٹھا کرنے کے دوران بعض جذباتی واقعات بھی پیش آئے جس سے اہل پنجاب کے دکھی دلوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دوران حکومتِ پنجاب نے بھی مقتولین کے لیے معاوضہ کا اعلان کر دیا لیکن اس میں بھی اس نے

کالے گورے کی تمیز روا رکھی یورپی مقتولین اور زخمیوں کے لیے یہ معاوضہ متاثرہ ہندوستانی خاندانوں سے کہیں زیادہ تھا۔ اس کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ پنجاب حکومت نے صرف امرتسر میں زخمی ہونے والے یورپی لوگوں کو 43,250 روپے کا معاوضہ ادا کیا جبکہ ہلاک ہونے والے یورپی افراد کے اہل خانہ کو 4 لاکھ تین سو اکیس روپے اور 26 پائی کی رقم ادا کی گئی اس کے مقابلے میں جلیانوالہ باغ میں ہلاک ہونے والوں کے خاندانوں کے لیے معاوضے کی کل رقم صرف 13840 روپے تھی۔ سب سے زیادہ معاوضہ مقتولہ سٹیورٹ کے اہل خاندان کو ادا کیا گیا یہ رقم 20 ہزار پونڈ کے لگ بھگ تھی اس مقابلے میں ہلاک ہونے والے ایک ہندوستانی کے ورثا کو صرف 500 روپے ادا کیئے گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ امرتسر اور پنجاب میں دیگر مقامات پر قتل ہونے والے یورپی افراد کی کل تعداد صرف چھ تھی جبکہ صرف جلیانوالہ باغ میں تقریباً 500 ہندوستانیوں کو گولی سے اڑا دیا گیا۔

II

جلیانوالہ باغ میں قتل عام کا سانحہ ابھی پرانا نہیں ہوا تھا اور ہندوستانی عوام رنج و غم سے چور تھے کہ خلافت کا مسئلہ کھڑا ہو گیا جنگ عظیم اول ختم ہو چکی تھی اور ترکی کے حصے بخرے کرنے اور اسے غیر مسلم قوتوں کے زیر نگین کرنے کی سازش ہو رہی تھی اس دوران مونٹگو چیمسفورڈ اصلاحات کا بھرم بھی کھل چکا تھا اور سیاسی تنظیموں نے ان پر عدم اطمینان کا اظہار کر دیا تھا کیونکہ ان اصلاحات کے نتیجے میں ایک ہندوستانی حکومت کا وہ مقصد پورا نہیں ہوتا جس کا وعدہ برطانیہ نے جنگ کے آغاز میں کیا تھا۔ کانگریس نے دسمبر 1919ء کے اواخر میں امرتسر میں سالانہ اجلاس منعقد کیا جس میں جلیانوالہ باغ میں ظلم و بربریت کی کڑی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاحات کو بھی مایوس کن قرار دیا تھا۔ ایک قرارداد میں کانگریس نے ان اصلاحات کو "ناکافی، غیر تسلی بخش اور مایوس کن" قرار دیا تھا پنجاب کی صورتحال ہر طور پر دھماکہ خیز تھی ان حالات میں مہاتما گاندھی نے 8 جون 1919ء کو وائسرائے کے نام ایک خط میں لکھا "پچھلے اڑھائی ماہ کی صورتحال کسی ڈراؤنے خواب سے کم نہیں رہی۔ ان حالات میں ہندوستان میں بالشویک طرح کے انقلاب سے بچنے کا واحد طریقہ میرے نزدیک ستیہ گرہ ہے اور سول نافرمانی اس جدوجہد کا ایک لازمی جزو ہے" انہوں نے اس خط میں یہ عندیہ دیا کہ وہ بہت جلد سول نافرمانی کی ایک مہم شروع کرنے والے ہیں تاہم انہوں نے حکام کو یہ یقین دہانی ضرور کرائی کہ اس کا مقصد ممکنہ حد تک محدود ہوگا۔ تاہم حکومت نے گاندھی کو ایسی کسی بھی مہم سے باز رہنے کو کہا لیکن جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے بعد کانگریس کے لیے مزید کسی سمجھوتے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ پنجاب میں انسانیت کی جس طرح تذلیل کی گئی وہ کسی بھی سیاسی جماعت کے لیے ایک چیلنج تھا

چنانچہ مہاتما گاندھی نے عدم تعاون کی مہم شروع کرنے کی تجویز پیش کی اور ستمبر 1920ء میں کانگریس نے اس کی منظوری دے دی اس مہم کے چیدہ نکات یہ تھے کہ سرکاری خطابات اور عہدے چھوڑ دیے جائیں اور سکولوں' کالجوں اور عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ لیجسلیٹو کونسل کے ارکان سے کونسل کا بائیکاٹ کرنے کو کہا گیا تھا۔ لیکن اس مہم کا سب سے نمایاں پہلو برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ (بدیشی) اور ملکی مصنوعات کا فروغ (سودیشی) تھا۔ گاندھی جی نے سودیشی مہم کے فروغ کے لیے چرخہ پر سوت کاتنے اور کھدر کا کپڑا تیار کر کے پہننے کی تلقین کی اور خود بھی اس پر عمل کیا۔ برطانوی قوانین کے تحت قائم عدالتوں کی جگہ مقامی سطح پر مصالحتی عدالتیں قائم کرنا بھی اس مہم کا ایک اہم پہلو تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے اور ہندوؤں کو اچھوت طبقات ختم کرنے کی تلقین بھی کی گئی۔ ستیہ گرہ کی اس تحریک نے مسلمانوں میں بھی وہی جوش و خروش پیدا کیا جو دوسرے فرقوں میں پایا جاتا تھا بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ علی برادران کی خلافت کمیٹی نے کانگریس سے بھی بائیکاٹ اور اس قسم کے کئی دوسرے اقدامات کا اعلان کیا تھا۔ کانگریس کے جلسوں میں ہندو مسلم اتحاد کے حوالے سے نظمیں پڑھی جاتیں۔ پنجاب تحریکِ خلافت کے رہنماؤں نے جن میں سیف الدین کچلو' نیاز حسین اور مولوی داؤد شامل تھے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ صرف سودیشی اشیاء استعمال کریں اور انگریز سرکار کے کسی اعلان کا یقین نہ کریں۔ 19 جون کو فیروز پور میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے نیاز حسین نے کہا "ہندوں اور مسلمانوں نے جنگ میں انگریز کی مدد کی جواب میں انہیں رولٹ ایکٹ کا انعام ملا۔ جب لوگوں نے یہ تحفے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس کا جواب گولی کی زبان میں دیا گیا۔ مسلمانوں کے لیے انگریز نے ایک خاص تحفہ یہ دیا کہ انہیں ان کے مقدس مقامات سے محروم کر دیا گیا" یعنی سامراجی اب ترکی کی خلافت کو بھی کچلنے کے درپے ہیں۔ تحریکِ خلافت کے دوران ایسے بھی موڑ آئے جب مسلمانوں نے اپنے ہم مذہبوں کو ہجرت کرنے کو کہا اور عدم تعاون اور عدم تشدد کی جگہ اعلانیہ طور پر جہاد کا اعلان کیا گیا۔ بعض مذہبی رہنماؤں نے مسلمانوں سے یہ تک کہا کہ وہ دیکھتے ہی یورپی لوگوں کو قتل کر دیں۔ خلافت کمیٹیوں کو دیہی علاقوں تک پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر ستیپال اور لالہ لاجپت رائے نے اپنی تقریروں میں ہمیشہ عدم تعاون اور تحریک خلافت کو کامیاب کرنے اور اپنی صفوں میں اتحاد برقرار رکھنے کی بات کی۔

صنعتی کارکنوں نے بھی اس مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ اس دوران متعدد ملوں میں ہڑتال ہوئی۔ اس دوران صرف ریلوے ہی میں ہڑتال کے دوران ریلوے کارکنوں نے لاہور میں 15 ہزار کا جلوس نکالا۔ سکھ بھی اس مہم میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ سکھ نوجوان کھلے بندوں کانگریس اور خلافت کے کارکنوں سے مل کر کام کرتے۔ ان تینوں فرقوں کے اتحاد نے پنجاب انتظامیہ کو ایک مرتبہ پھر بوکھلاہٹ کا شکار کر دیا اور ایک مرحلے پر تو ضلع لاہور میں سیاسی جلسوں کو سازش قرار دینے کا قانون بھی نافذ کرنے کی بات کی گئی لیکن دہلی کی انگریز

حکومت نے اس مرتبہ پنجاب کی بات نہیں مانی۔ اس دوران لاہور کے طلبہ نے 1921ء میں ایک تنظیم قائم کی جس کا نام قومی مہاودیال رکھا گیا اس میں لاہور کے کئی کالجوں کے طلبہ شامل تھے جن کا مقصد یہ تھا کہ قومی مقاصد کے فروغ کے لیے قومی تعلیم شروع کی جانا چاہیے۔ اس تحریک کے نتیجے میں ایک نیشنل کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ جس کا نام پنجاب قومی ودیا پیٹھ رکھا گیا اس کالج میں پڑھائی جنوری 1923ء میں شروع ہوئی اور کچھ ہی عرصہ میں سرکاری کالجوں کے بہت سے طلبہ نے اس میں داخلہ لے لیا۔ اس ادارے کا مقصد مقامی اور علاقائی زبانوں میں اعلیٰ تعلیم کا حصول تھا تاکہ فارغ التحصیل ہونے والے افراد سر سے پاؤں تک ہندوستانی ہوں۔ اور ایسے بنکوں، انشورنس کمپنیوں، ملوں، اور دیگر دفاتر میں فوری طور پر کام کرنے کو تیار ہوں۔ جن کی سربراہی قوم پرست ہندوستانی رہنماؤں کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کالج باقاعدہ ایک تحریک تھی۔ اس کا مقصد بہت اعلیٰ تھا وہ ایک ہندوستانی ذہنیت، رہن سہن اور ثقافت سے متصادم ہے اور اس کا مقصد قوم کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے علاوہ کچھ نہیں۔ تاہم یہ بات بے حد افسوس کے ساتھ کہی جائے گی کہ وسائل نہ ہونے کی بنا پر یہ ادارہ [illegible]ء میں بند ہو گیا تاہم اس ادارے نے کئی ایسے رہنما پیدا کیے جو سیاست اور جدوجہد کے میدان میں پیش پیش رہے۔ ان میں بھگت سنگھ، یشپال، تحصیل داس، گوپال سنگھ قومی، موہن لال، جے چند ودیا لنکار اور بہت سے دوسرے نوجوان شامل تھے۔

گاندھی جی کی عدم تعاون کی مہم اور علی برادران کی تحریکِ خلافت پورے دو برس ملک بھر میں اس زور شور سے چلیں کہ حکومت ہل کر رہ گئی۔ ان تحریکوں نے سیاسی شعور اور عوامی سیاسی رابطوں میں ایک قابلِ ذکر ابھار پیدا کیا اور ساتھ ہندو مسلم اتحاد۔ ہندوستانی قومیت اور قوم پرستی کے رجحانات کو تقویت ملی۔ عوام کی اس اجتماعی جدوجہد نے اس قدر کامیابی حاصل کی کہ ماضی میں پنجاب کی دہشت گردی اور مہم جوئی کی اکادکا کوششوں کی ناکامی کی وجوہات منظرِ عام پر آنے لگیں اور لوگوں نے محسوس کر لیا کہ کیوں ماضی کی ایسی تحریکیں ناکامی پر منتج ہوئیں اور کیوں ایسی مہموں نے ایک منظم حکومت کی بنیادیں ہلا کر نہیں رکھ دیں۔ چنانچہ عوام پوری طرح قائل ہو گئے کہ پرامن سیاسی تحریکوں ہی کی بدولت آزادی کی منزل کا حصول ممکن ہے لہٰذا ہندوستان بھر کے لوگ اس سے ہتھیار سے خوگر ہو گئے ادھر کانگریس نے بھی بخوبی محسوس کر لیا کہ جدوجہد کے حوالے سے بھی معاشرے کا طبقاتی کردار ہوتا ہے ایک طرف تو دولت مند لوگ ہیں جو معاملات پرامن رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف غریب عوام کی اکثریت ہے جو فوری اقدام اور کاری ضرب چاہتی ہے تاہم کانگریس کو اس امر کا اطمینان تھا کہ دونوں ہی طبقات نے اس کی مہم کا ساتھ دیا ہے۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ سکھوں کی اکثریت انتہا پسندی کی حامی تھی اور اس رجحان کو بعض مسلمان طبقوں کی بھی حمایت حاصل تھی البتہ ہندوؤں کی کثیر تعداد پرامن اقدامات کے حق میں تھی۔ کانگریس کی تحریک جاری تھی کہ چورا چوری کا ناخوشگوار واقع پیش آیا۔ چورا

چوری چورا یوپی کا ایک دیہی قصبہ تھا وہاں ایک ہجوم نے جس کے جذبات کانگریس کے رضا کاروں نے مشتعل کر دیئے تھے ایک پولیس تھانے کو آگ لگا دی جس میں پولیس کے 22 جوان جل کر مر گئے گاندھی جی اس حادثہ کے بعد سکتے میں رہ گئے اور پریشانی اور پشیمانی کے عالم میں انہوں نے تحریک معطل کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس واقع کے بعد گاندھی جی سمیت کانگریس کی تقریباً تمام قیادت کو گرفتار کر لیا گیا۔ کانگریس کے بعض رہنما گاندھی جی کے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے ان کے خیال کے مطابق تحریک چلتی رہتی تو منزل قریب آ جاتی لیکن گاندھی جی نے اس وقت تحریک ختم کر دی جس وقت وہ اپنے عروج پر تھی لالہ لاجپت رائے نے جیل سے گاندھی جی کے نام ستر صفحات پر مشتمل ایک خط لکھا جس میں انہوں نے تحریک کے خاتمے کے فیصلے پر کڑی نکتہ چینی کی۔ تحریک کے خاتمے کے بعد حکومت کو کھل کھیلنے کا موقع ملا بڑی تعداد میں سیاسی کارکن گرفتار کیے گئے اور انہیں قید اور جرمانہ کی سزائیں دی گئیں۔ تحریک کے خاتمے کا سب سے بڑا نقصان ہندو مسلم اتحاد کو ہوا مسلمانوں نے کانگریس کو جنہیں وہ ہندوؤں کی جماعت سمجھتے تھے سیاسی کارکنوں کے خلاف حکومتی تشدد کا ذمہ دار ٹھہرایا آہستہ آہستہ ہندو مسلم فسادات بھی شروع ہونے لگے اور پہلی مرتبہ گائے ذبح کرنے اور مساجد کے قریب گانے بجانے پر مسلمانوں اور ہندوؤں میں تصادم کا سلسلہ شروع ہوا۔ پنجاب میں کانگریس کی مقبولیت گویا بھک سے اڑ گئی اور کانگریس کے بعض انتہا پسند رہنماؤں نے جن میں لالہ لاجپت رائے بھائی پرمانند اور لالہ اچی رام ساہنی شامل تھے پارٹی کی سرگرمیوں سے لاتعلق ہو کر آریا سماج اور دیگر فرقہ وارانہ تنظیموں کی طرف مائل ہو گئے۔ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ عدم تعاون کی تحریک کے خاتمے نے فرقہ واریت کو جنم دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نفرت کا بیج بویا۔ تحریک کے خاتمے کے بعد چونکہ کوئی قومی تحریک باقی نہیں رہی تھی اور لوگ سیاسی دھارے سے الگ ہو گئے تھے اس لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ قومی تشخص کی بات ہونے لگی اور یوں کانگریس کی اس پالیسی نے گویا ملک کی تقسیم کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جب 1927-31ء کے دوران دہشت گردی کی کارروائیاں دوبارہ شروع ہوئیں تو پنجاب میں ایک بار پھر برطانیہ مخالف سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا اسی دوران کانگریس نے دوبارہ سول نافرمانی شروع کر دی اور ساتھ ہی لیجسلیٹو کونسلوں سے بائیکاٹ کی اپیل جاری کر دی۔ جواہر لعل نہرو نے 31 دسمبر 1929ء کو دریائے راوی کے کنارے کانگریس کے ایک اجتماع میں مکمل آزادی (پورن سوراج) کا نعرہ بلند کیا تو ہندوستان کے دوسرے شہروں میں بھی لوگوں نے اسی قسم کے عہد اجتماعات میں کیے۔ مارچ 1930ء میں گاندھی جی نے مشہور ڈنڈی مارچ شروع کیا جس کا مقصد نمک پر ٹیکس کے خلاف احتجاج کرنا تھا۔ 1930ء میں ملک بھر میں سول نافرمانی کی مہم زور شور سے جاری تھی۔ پرامن مظاہرین پر لاٹھی چارج اور گولی چلانا گویا معمول کا کام بن کر رہ گیا تھا۔ اس دوران حکومت نے اخبارات پر سنسر شپ عائد کر کے سیاسی سرگرمیوں کی خبروں کی تشہیر

روکنے کے لیے کئی کوشش کی جیل میں بھی سیاسی کارکن تشدد سے محفوظ نہیں رہے تھے۔ 1930ء میں ایک اور اہم واقعہ یہ پیش آیا کہ عالمی منڈیوں میں اجناس کی قیمتوں میں اچانک کمی کے باعث ہندوستان کے کسان کی معاشی حالت دگرگوں ہوگئی اور وہ مالیہ اور لگان ادا کرنے کے قابل نہ رہا۔ اس مرحلے پر کرتی کسان پارٹی اور نوجوان سبھا نے اپنی سرگرمیاں دوبارہ شروع کردیں اس کی بنیادی وجہ ان تنظیموں کی کسانوں کے ساتھ یک جہتی تھی اور یوں کسانوں کا مطالبہ ان انتہاپسند تنظیموں کو کم از کم ایک مرتبہ سیاست کے قومی دھارے میں لے آیا۔ جب آزادی کی جدوجہد جاری تھی اور حکومتی تشدد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ 30 مئی 1930 کو سائمن کمیشن کی رپورٹ منظر عام پر آ گئی۔ اس رپورٹ کی اشاعت سے سیاسی سطح پر مزاحمت تیز تر ہوگئی کیونکہ اس نے عوام کی خواہشات کو نظر انداز کر دیا تھا اور اس سیاسی تبدیلی کو بھی پیش نظر نہیں رکھا تھا۔ جو انتہا پسندانہ سرگرمیوں اور سیاسی پیش رفت کے بعد واضح طور پر دیکھنے میں آ رہی تھی اس رپورٹ نے صوبوں کو کافی حد تک خودمختاری دی تھی لیکن مرکز میں حکومت کے آمرانہ ہتھکنڈوں پر کوئی خاص قدغن نہیں لگائی تھی چنانچہ سیاسی سطح پر اس رپورٹ پر عمومی طور پر سرد مہری کا رویہ دوا رکھا گیا۔

اسی دوران لندن میں گول میز کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا کانگریس نے صرف دوسری کانفرنس میں شرکت کی اور گاندھی جی سروجنی نائیڈو کے ہمراہ لندن گئے مگر انہیں مایوسی کے علاوہ وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ اسی کانفرنس میں پہلی مرتبہ پنجاب مسلم اکثریت کا ذکر ہوا اور اس کے مفادات کے تحفظ کی بات کی گئی۔ اس قسم کی تجویز سر جعفری کاربٹ نے پیش کی اور جواب میں ایس اجل سنگھ نے پنجاب کے سکھوں کے حقوق کی بات کی۔ انہیں میں سے ایک کانفرنس میں پہلی مرتبہ پاکستان کا نام سننے میں آیا یہ نام اس پمفلٹ میں لیا گیا جو کیمبرج کے طالبعلم چودھری رحمت علی نے کانفرنس کے شرکاء میں تقسیم کیا تاہم اس موقع پر پاکستان کی تجویز کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ گول میز کانفرنسوں کا سلسلہ 19 جنوری 1931ء کو ختم ہوا۔ چونکہ اس میں کانفرنس نے نمائندگی نہیں کی تھی اس لیے ہندوستان میں اس بارے میں ایک کوشش شروع ہوئی سر تیج بہادر سپرو اور ڈاکٹر جے کار کی کاوشوں سے کانگریس کے رہنماؤں کو جیل سے رہائی ملی اور بعد ازاں گاندھی جی اور وائسرائے لارڈ ارون کے مابین بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا گاندھی جی نے کانگریس کے واحد نمائندہ کے طور پر لارڈ ارون کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جسے ارون پیکٹ کا نام دیا گیا۔ اس معاہدے کی رو سے سول نافرمانی کی مہم کے دوران گرفتاری تمام کانگریسی رہنماؤں اور کارکنوں کو رہا کر دیا گیا۔ نمک کی تیاری پر ٹیکس واپس لے لیا گیا اور ایمرجنسی کے دوران نافذ قواعد کے تحت حکومت کے خصوصی اختیارات ختم کر دیے گئے جواب میں گاندھی جی نے سول نافرمانی ختم کر دی۔ تاہم حکومت نے گاندھی جی کا یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا کہ بھگت سنگھ اور اس کے دو دوسرے ساتھیوں کی سزا معاف کر دی جائے۔ چنانچہ گاندھی ارون پیکٹ کڑی

تنقید کا نشانہ بنا۔ پنجاب کے نوجوانوں نے خصوصی طور پر اس معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ جواہر لعل نہرو اور سبھاش چندر بوس نے بھی معاہدے کی بعض شقوں کی مخالفت کی پنجاب میں عمومی طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس معاہدے کی رو سے کانگریس نے ان کے مفادات کا سودا کر لیا ہے۔ گاندھی ارون پیکٹ کی کانگریس کے اس اجلاس میں توثیق کی گئی جو کراچی میں منعقد ہوا اور جس سے ایک ہفتہ قبل بھگت سنگھ کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ اس ایک ہفتے کے دوران پنجاب کے چیدہ چیدہ رہنماؤں نے گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ ارون کے ساتھ معاہدے سے دست بردار ہو جائیں۔ کانگریس کے اجلاس میں یہ بات ہوئی اور نہرو نے کہا "جب ہم اس معاہدے پر غور کر رہے ہیں درمیان میں بھگت سنگھ کی لاش پڑی ہے" لیکن گاندھی جی کی سوچ یہ نہیں تھی۔ انہوں نے اس قسم کے دلائل پیش کئے کہ اجلاس نے چون چرا کئے بغیر اس معاہدے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کانگریس کے اس اجلاس کے بعد بعض ایسی باتیں بھی ہوئیں گویا گاندھی جی نے معاہدے پر دستخط ہی اس لیے کئے کہ انہیں بھگت سنگھ کی پھانسی کا یقین دلا دیا گیا تھا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ یہ معاہدہ تبدیل شدہ حالات کے تقاضے پورے کرنے میں ناکام رہا۔ انگلستان میں لیبر پارٹی کی جگہ دائیں بازو کی پارٹی کی حکومت بن چکی تھی اور گاندھی جی دوسر گول میز کانفرنس سے بقول ان کے "خالی ہاتھ" واپس آئے تھے۔ ہندوستان پہنچتے ہی انہوں نے ایک مرتبہ پھر سول نافرمانی کی مہم کا آغاز کر دیا۔ تبدیل شدہ حالات کے تحت حکومت نے پہلے سے کہیں زیادہ ردعمل کا اظہار کیا اور اس مہم کو پہلے سے کہیں زیادہ سختی سے کچلنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کانگریس اور حلیف جماعتوں کی متعدد کمیٹیوں کو غیر قانونی قرار دے کر ان پر پابندی لگا دی گئی۔ برطانوی مصنوعات کا بائیکاٹ ایک مرتبہ اس مہم کا اہم پہلو تھا لیکن اس مرتبہ کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ ہر اس دوکان کے سامنے احتجاجی مظاہرہ کا سلسلہ شروع کیا جائے جو بدیشی مال کی خرید و فروخت کرتی ہیں۔ تاہم آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حفظ ماتقدم کے طور پر دکاندار کو پہلے مطلع کرنے کی اپیل کی کمیٹی نے برطانوی مال کی خرید و فروخت کے خلاف پراپیگنڈا کا دائرہ دیہات تک پھیلانے کی بھی تلقین کی۔ بائیکاٹ مہم کے دوران کانگریسی کارکن جلسے جلوس کرتے۔ نعرے لگاتے' پمفلٹ تقسیم کرتے دیواروں پر بائیکاٹ کے اشتہارات چسپاں کرتے اور لوگوں سے باتیں کرتے اس مقصد کے لیے وہ دیہات کے میلوں کا انتخاب کرتے' پنجاب کے حکمران لارڈ ولنگڈن کی ہدایت کے تحت مہم کو سختی سے کچلنے کا ایک مکمل منصوبہ تیار کیا گیا اس سلسلے میں جو قانون نافذ کیا گیا اس سے پولیس کی متشددانہ کارروائیوں کے ساتھ عوام کی سماجی زندگی بھی متاثر ہوتی تھی تاہم حکومت جدوجہد کرنے والے کارکنوں کا جوش و خروش ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی بلکہ سختیوں نے ان کے عزم کو اور پختہ کر دیا اور پنجاب میں جدوجہد پورے عزم اور ہمت کے ساتھ جاری رہی۔ صوبے میں کانگریس کے کارکنوں نے غیر ملکی سامان کی تجارت کرنے والے دکانداروں کے خلاف مظاہرے

کرتے۔ان تاجروں کا سماجی مقاطعہ کرتے جو ان کی بات کو نظر انداز کرتے اکثر اوقات یہ ہوتا کہ وہ معاہدے کی خلاف ورزی کرنے والے تاجروں کی دکانداروں کی دکانوں کے سامنے سینہ کوبی کرتے اور ان کے خلاف نعرے لگاتے۔اس مہم کے دوران گلیوں بازاروں میں غیر ملکی سامان نظر آتش کرنے کا منظر عام تھا کانگریسی جلتے ہوئے سامان کے پاس کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتے کہ انہوں نے بدیشی مال کی چتا جلادی اس کے ساتھ ساتھ ملکی مصنوعات کے حق میں پمفلٹ لکھے اور تقسیم کیے جاتے اور اس کا اہتمام جلسے جلوسوں میں کیا جاتا۔ پنجاب میں اس مہم کو کوئی قابل قدر کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیونکہ مسلمانوں اور سکھوں کو اس بات کا دکھ تھا کہ کانگریس نے اس کے حقوق پر سودہ بازی کرلی ہے۔سکھ لیگ نے البتہ کانگریس کو اس مہم میں مشروط حمایت کا یقین دلایا۔اس تنظیم کی شرط یہ تھی کہ آئندہ کسی بھی آئینی معاملات میں ان کو نمائندگی کا اہتمام کیا جائے اور چونکہ وہ صوبے میں ایک بڑی اقلیت ہیں اس لیے ان کے مفادات کا فیصلہ کرتے وقت ان کی پوزیشن کو مدنظر رکھا جائے پنجاب کے بعض حلقوں نے کانگریس پر یہ الزام بھی لگایا کہ اس نے اس مہم کے دوران ان کے تجارتی مفادات کو نظر انداز کر دیا ہے اور فساد بازاری اسی کی پولیسیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔یہی وجہ تھی کہ پنجاب میں کانگریس کی سول نافرمانی کی مہم اس قدر کامیاب نہ ہوئی جتنی دوسرے صوبوں میں اس کی پذیرائی ہوئی تھی۔

اس مہم کے دوران پنجاب اور دوسرے صوبوں میں مختلف قوانین کے تحت جنوری 1932ء اور اپریل 1933ء کے مرحلے کے دوران جو سزائیں دی گئیں ان کے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پنجاب میں اس مہم کے لیے کسی خاص جوش و خروش کا مظاہرہ نہیں کیا گیا۔اس سلسلے میں درج ذیل اعداد و شمار اس امر کی باخوبی وضاحت کرتے ہیں۔

صوبہ	سزایافتہ افراد کی تعداد	مرد	عورتیں
بمبئی	14101	13162	939
بنگال	12791	12015	776
یوپی	14663	14004	669
بہار اور اوریسا	14903	14533	370
سرحد	6053	6052	1
پنجاب	1774	1653	121

اسی اثنا میں کانگرس نے ایک اور پلٹا کھایا۔ اب کانگرسی رہنماؤں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ برطانوی حکومت کی قائم شدہ لیجسلیٹو کونسلوں میں شمولیت سے حالات شاید بہتر ہو جائیں چنانچہ مئی 1934ء میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے پٹنا میں منعقدہ ایک اجلاس میں یہ فیصلہ کر دیا کہ سول نافرمانی کی تحریک ختم کی جاتی ہے اور کانگرسی رہنماؤں کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ ان لیجسلیٹو کونسلوں میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یوں اس مہم کو ختم کر دیا گیا جو پانچ برس چل رہی تھی اور جس کو عوامی سطح پر بڑی مقبولیت ملی تھی۔ اس عرصے میں یہ بات بھی واضح ہو گئی تھی کہ سول نافرمانی بتدریج برطانیہ کے انتظامی نظام کا پول کھلنے کے لیے ایک اخلاقی ہتھیار بھی بن چکا تھا لیکن چونکہ حکومت کی تشدد کی پالیسی اور مختلف تنظیموں پر پابندی لگانے، ان کے فنڈ ضبط کرنے پولیس تھانوں میں سیاسی قیدیوں پر تشدد دیہاتیوں پر زیادتیوں عورتوں اور بچوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک لوگوں کی جائیداد ضبط کرنے سرسری سماعت کے بعد قید کی سزائیں دینے وغیرہ ایسے اقدامات تھے جس سے عوام کی مشکلات بڑھ رہیں تھی اور معاشرتی تلخی میں اضافہ ہو رہا تھا ایک انگریز افسر سی ایف اینڈریوز نے 4 اپریل 1932ء کو ایک دوسرے افسر مسٹر ہیگ کو جو خط لکھا اس میں ہندوستانی عوام کے ان جذبات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے وہ لکھتا ہے "میرا خیال ہے برطانوی ہند کی تاریخ میں کبھی اتنی بڑی تعداد میں عورتوں کو قید میں نہیں ڈالا گیا جتنا اس مرتبہ عورتوں کو کئی موقعے پر ننگا بھی کیا گیا جو کہ پورے ہندوستانی معاشرے کے لیے ذلت کا باعث بنا جس حد تک میں ہندوستانی معاشرے کو جانتا ہوں مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ حکومت نے اس قسم کے اقدامات کر کے اپنے خلاف محض نفرت ہی بڑھائی ہے" تاہم ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت اپنے اس خیال پر قائم رہی کہ جبر و تشدد سے اس مہم کو کچلنے میں کامیاب ہو جائے گی پنجاب میں البتہ حکومت اپنے مقاصد پورے نہیں کر پائی بلکہ پرامن سیاسی سرگرمیوں کی جگہ دہشت گردی کے واقعات نے پھر جنم لے لیا۔ کیرتی کسان نوجوان بھارت سبھا اور اکالی پارٹی جیسی تحریکوں نے بعد میں حکام کے لیے بے حد پریشانیاں پیدا کیں اور سرکار کے خلاف قومی تحریک نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ کانگریس نے سول نافرمانی کی مہم ختم تو کر دی لیکن وہ اپنے طور پر کئی صوبوں میں جاری رہی اس مہم کو موثر طور پر ختم کرنے کے لیے گاندھی جی نے لوگوں کی توجہ ایک اور سماجی پہلو کی مبذول کروانے کی کوشش کی۔ انہوں نے لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ ہندوؤں کے سب سے نچلے طبقے اچھوتوں کے ساتھ روابط بڑھائیں تا کہ اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکے۔ اس وقت تک ہندو مسلم خلیج بڑھ چکی تھی اور حکومت 17 اگست 1932ء کو کیمونل ایوارڈ کا اعلان کر چکی تھی جس کے تحت مختلف فرقوں کے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے ایک باضابطہ سکیم کا اعلان کیا گیا تھا۔

اس پس منظر میں گاندھی جی نے اچھوتوں کے حوالے سے جو اپیل کی تھی پنجاب کے بعض حلقوں نے اس کی یوں توجیح پیش کی کہ گاندھی جی کا تخاطب صرف ہندو ہیں سول نافرمانی کی مہم کا یوں یک لخت خاتمہ

گویا عوامی جذبات کے منافی ایک اقدام گردانا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کانگریس اپنی سیاسی سوچ میں تسلسل قائم نہیں رکھ پا رہی تھی اس بات کا اندازہ اسی مہم سے لگایا جاسکتا ہے جو متعدد بار شروع کی گئی اور ہمیشہ اس کو ایک خاص بلندی پر لا کر زمین پر پٹخ دیا گیا۔ 1934ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کے لیے نئی آئینی اصلاحات کیلئے تجاویز کا اعلان کیا۔ اس اعلان سے تقریباً تمام سیاسی جماعتوں کی توجہ ان آئینی امور کی طرف مبذول ہوگئی۔ بعد ازاں 1935ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ اور اس کے تحت 1936ء میں ہونے والے انتخابات کے نتیجے میں ہندوستان کو جدوجہد کا ایک آئینی دور شروع ہوتا ہے۔ کانگریس نے جس نے ان انتخابات میں 11 میں سے آٹھ صوبوں میں اکثریت حاصل کی تھی اس ایکٹ کے تحت صوبائی خود مختاری کا تجربہ کرنے اور رضامندی ظاہر کرنے پر رضامندی ظاہر کردی البتہ پنجاب میں کانگریس یونینسٹ پارٹی کے مقابلے میں کوئی کارکردگی پیش نہ کرسکی۔ کانگریس کی عدم تعاون اور سول نافرمانی کی مہارت پنجاب کے مرکزی اضلاع تک محدود رہیں۔ مشرقی اور جنوبی پنجاب میں ان کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس صوبے میں کانگریس کے سیاسی اثر کا دائرہ نہیں پھیل سکا بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ اس میں مزید کمی آتی گئی۔

فرقہ وارانہ سیاست نے تو گویا اس صوبے سے کانگریس کا خاتمہ ہی کر دیا تھا۔

+

باب:6

اکالی لہر اور گوردوارہ سدھار مہم

بیسوی صدی کے آغاز ہی سے سکھ انقلابی جدو جہد اور پنجاب کی قومی مہم میں پیش پیش رہے۔ 1907ء اور 1909ء کے درمیانی عرصہ میں زرعی زمین کے بندوبست کے بارے میں جو قوانین انگریز حکومت نے وضع کیے ان کی مخالفت میں بھی سکھ ہراول دستے کا کردار ادا کرتے رہے۔ جو سکھ غیر ممالک میں بس گئے تھے انہوں نے وہاں بھی نسلی امتیاز کے خلاف تاریخی لڑائی لڑی اور 1915ء میں برطانوی راج کے خلاف ''دوسری جنگ آزادی'' میں بھی ان کا کردار سب سے نمایاں رہا۔

چنانچہ سکھ قوم ہر لحاظ سے جدوجہد کا اہم حصہ رہی لیکن تعلیمی طور پر پسماندہ رہنے کے باعث وہ ایسی کسی ایجی ٹیشن کا ذکر نہیں کر سکتے تھے جو خالصتان کی اپنی ہو۔ تاہم قومی اور مذہبی حوالے سے وہ وقتاً فوقتاً تنظیمیں قائم کرتے رہے اسی طرح کی تنظیمیں خالصہ دیوان اور سنگھ سبھا تھیں جو 1888ء میں سکھوں نے اس وقت قائم کیں جب آریہ سماج نے ان کے گردواروں پر حملہ کیا ان تنظیموں نے سکھ مذہب کو توہم پرستی کے چنگل سے نکالنے ہندو رسوم ترک کرنے اور سکھ مذہبی روایات کو مضبوط کرنے کے لیے بہت کوشش کی لیکن اس کے باوجود سکھ عملاً ہندو قوم کا ایک سماجی اور ثقافتی حصہ رہے اور سیاسی طور پر ان کا حلیف تھے۔

البتہ 1916ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان لکھنؤ پیکٹ مذہبی اور سیاسی حوالے سے ہندوستان بھر میں ایک نیا نکتہ آغاز ثابت ہوا اس عہد نامے کا مطلب یہ تھا کہ کانگریس نے باضابطہ طور پر مذہب کے حوالے سے سیاسی نمائندگی کا اصول قبول کر لیا اور عملاً قومی زندگی میں سیاست اور مذہب کو الگ رکھنے کے سیکولر تصور کی ناکامی کا اعتراف کر لیا۔ اس معاہدے سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ سماجی سطح پر کانگریس نے ایک مذہبی اقلیت کے الگ قوم کی حیثیت دیتے ہوئے ان کے علیحدہ سیاسی تشخص کو قبول کر

لیا۔ سکھوں نے اس امتیازی سلوک کو بری طرح محسوس کیا ان کا خیال تھا کہ کانگریس نے مسلمانوں کی الگ سماجی اور سیاسی حیثیت کو تو تسلیم کر لیا ہے لیکن سکھ قوم کو اس حوالے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی مایوسی کے عالم میں چیف خالصہ دیوان نے مونٹگو چیمسفورڈ مشن کو ایک یاداشت ارسال کی اور اس کے ایک وفد نے لندن میں برطانیہ کے سیکرٹری آف سٹیٹ اور ہندوستان میں وائسرائے سے ملاقات کی۔ انگریزوں کے ساتھ ان رابطوں میں سکھ نمائندوں نے حکومت کو پنجاب کی اقتصادی اور سیاسی زندگی میں اپنی اہمیت اور 1857ء میں ''غدر'' اور بعد ازاں جنگ عظیم اول میں سلطنت برطانیہ کے لیے اپنی خدمات گنوائیں اور صوبے کی سطح پر اس اصول کے تحت ایک تہائی سیاسی نمائندگی کا مطالبہ کیا جس کے تحت قومی سطح پر مسلمانوں کا حق تسلیم کیا گیا تھا۔ ان کا مطالبہ ایک اصول پر نہیں تھا اور انگریز کی پنجاب حکومت نے بھی اس کی حمایت کی اور جب مونٹگو چیمسفورڈ کمیٹی نے سکھوں کی علیحدہ نمائندگی کے مطالبہ کی حمایت کر دی تو سکھوں میں فرقہ وارانہ سیاست کے رجحان کو مزید تقویت ملی۔

اسی لیے خالصہ دیوان سنگھ سبھاؤں کو از سر نو منظم کیا گیا بعد میں ان تنظیموں نے مذہبی حوالے سے قابل قدر کام کیا اور سکھ قوم کو الگ سیاسی تشخص دلوانے کے لیے کام شروع کیا۔ دیوان نے 1892ء میں خالصہ کالج امرتسر کے قیام کے ساتھ ہی صوبے بھر میں مزید تعلیمی ادارے بھی قائم کیے اس کے علاوہ دیوان خالصہ نے سکھوں کے سیاسی مفادات کے لیے کام شروع کر دیا۔ تاہم بیسویں صدی کے آغاز میں دیوان خالصہ اندرونی چپقلش کی وجہ سے عدم استحکام کا شکار ہو گئی جس کے بعد چیف دیوان خالصہ کے نام سے ایک اور تنظیم امرتسر میں قائم کر دی گئی جو پہلے کی طرح سکھوں کے مذہبی اور سماجی مفادات کے ساتھ سیاسی سطح پر متحرک تھی لیکن دیوان کی حد درجہ متوازن پالیسی نے جو کہ بہت حد تک سرکاری حکمت عملی کے قریب تھی نوجوان نسل کو متاثر نہیں کیا جس کی اکثریت انتہا پسندانہ سوچ کی حامل تھی یہی حال گوردوارہ سدھار مہم کا ہوا کیونکہ اس کی اٹھان بھی اکثر سکھوں کی توقعات پر پوری نہیں اتری اور جو پوری سکھ قوم کی جدوجہد کی قیادت کے اہل ثابت نہیں ہوئی۔

مغلوں کے وقت سے سکھوں کے گوردواروں کی دیکھ بھال ادیسی کرتے کیونکہ گرنتھی یا دیگر مذہبی رہنماؤں کے لیے یہ کام دشوار تھا۔ ادیسی داڑھی مونچھ کے بغیر ہوتے اور خطرے کے وقت مذہب سے لاتعلقی کا اظہار بھی کر سکتے تھے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ کام مہنتوں نے سنبھال لیا۔ گوردوارے کی جائیداد انہیں کے نام ہوتی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں کئی مرتبہ گوردواروں کی انتظامیہ مقرر کرنے کا سوال اٹھا خصوصاً سنگھ سبھا نے اس کو متنازعہ بنا لیا تھا کیونکہ اسے امرتسر سے گولڈن ٹمپل میں ہندوؤں نے بت رکھ چھوڑے تھے اور اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ سکھ مذہبی طور پر بھی ہندوؤں کے زیر اثر

رہیں۔ 1905ء میں سکھ سبھا ان بتوں کو گوردواروں سے ہٹانے میں کامیاب ہوگئی اس بنا پر سبھا نے اعلان کردیا کہ آئندہ جب بھی گوردواروں کے منیجر مقرر کئے جائیں اس سے مشورہ لیا جائے لیکن سنگھ سبھا اس سلسلے میں حکومت کو درخواستیں بھیجنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ کرسکی۔

1912ء میں جب دہلی میں وائسرائے راج بنانے کا کام شروع ہوا تو انگریز نے گوردوارہ رکب گنج سے ملحقہ زمین حاصل کی تعمیر شروع ہوئی تو گوردواروں کی ایک دیوار گرادی گئی سکھ مشتعل ہو گئے اور وائسرائے لاج کی تعمیر روکنے کے لیے مورچہ بندی کرنے کا اعلان کردیا لیکن جنگ عظیم اول شروع ہونے کی وجہ سے یہ مورچہ قائم نہ ہوسکا۔ جنگ کے بعد پنجاب میں انگریز کے خلاف تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور جلیانوالہ باغ کے قتل عام نے اشتعال انگیزی کے بارود میں آگ لگادی جواب میں انگریزی سرکار نے جبر وتشدد کی انتہا کردی صورتحال خراب سے خراب تر ہوتی گئی اور تصادم کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ چیف خالصہ دیوان جیسی اعتدال پسند تنظیم اپنی افادیت کھو بیٹھی اس دوران جلیانوالہ باغ میں خون کی ہولی کھیلنے والے جنرل ڈائر کو اسی شہر کے گولڈن ٹمپل کا منیجر مقرر کردیا گیا تو انگریزوں کے ہاتھ ایک ایسا موقع لگ گیا جس کو وہ اپنے حق میں پراپیگنڈا کے لیے استعمال کرسکتے تھے۔ انہوں نے جنرل ڈائر کے سکھوں کی سب سے بڑی عبادت گاہ کا انتظام سنبھالنے کو سکھوں کی انگریز حکومت کے ساتھ غیر متزلزل وفاداری سے موسوم کیا بعض انگریز سیاستدانوں نے یہ تک کہہ دیا کہ سکھ قوم نے جنرل ڈائر کو اپنی برادری کا ایک فرد تسلیم کر کے انگریزی حکومت کے ساتھ وفاداری کو ایک اہم مذہبی رسم کے طور پر مان لیا ہے۔ اس قسم کے آتشیں پراپیگنڈا کا ردعمل یہ ہوا کہ 1919ء میں مرکزی سکھ لیگ قائم ہوگئی اور اس نے انڈین نیشنل کانگریس کے سیاسی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگی کا اعلان کردیا۔ اکتوبر 1920ء میں جب مہاتما گاندھی نے امرتسر کا دورہ کیا تو خالصہ کالج کے طلبا نے کانگریس کی اپیل پر ہڑتال کردی۔ گاندھی جی کی سول نافرمانی کی مہم کے سلسلے میں کئی سکھ اساتذہ نے جن میں کالجوں کے پروفیسر بھی شامل تھے استعفے دے دیے اور کالج کا انتظام سکھوں کے سپرد کرنے کی مانگ کردی۔ ساتھ ہی گولڈن ٹمپل امرتسر کی دیکھ بھال کے لیے ایک کمیٹی مقرر کردی گئی اگرچہ حکومت نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن سکھوں کا دباؤ کم نہ ہوا آخر حکومت کو سکھوں کی یہ بات ماننا پڑی کہ خالصہ کالج امرتسر کا انتظام سکھوں کی ایک کمیٹی کے سپرد کردیا رکب گنج گوردوارہ کی گری ہوئی دیوار تعمیر کرادی اور اس سے ملحقہ زمین جو وائسرائے لاج کے لیے لی گئی تھی گوردوارہ کو واگزار کردی۔ انگریز نے سکھوں کا یہ مطالبہ بھی تسلیم کرلیا کہ انہیں کرپان رکھنے کا حق ہوگا۔ جیل میں سکھ قیدیوں کو اپنا مذہبی نشان ساتھ رکھنے اور ٹوپی کے بجائے پگڑی پہننے کی اجازت بھی مل گئی۔ ان رعائتوں کے باوجود سکھ قوم کی تسلی نہیں ہوئی کیونکہ گوردواروں کے انتظام نبھانے کا اہم مسئلہ جوں کا توں

رہ گیا تھا۔ چنانچہ یہ معاملہ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو پیش کر دیا گیا جس نے مارچ 1921ء میں ایک اجلاس کے بعد حکومت کو خبردار کیا کہ اگر اس نے گوردواروں کا انتظام سکھوں کے سپرد نہیں کیا اور گوردواروں کے حوالے سے جدوجہد کے دوران گرفتار کیے گئے قیدیوں کو رہا نہیں کیا تو سکھ بھی عدم تعاون کی مہم شروع کر دیں گے۔ پربندھک کمیٹی کے بعض ایسے ارکان نے جو انتہا پسند نظریات رکھتے تھے اکالی دل کی تنظیم قائم کر دی اس تنظیم نے ایک اکالی فوج بنائی جس میں لگ بھگ 30 ہزار سکھ نوجوانوں نے شمولیت اختیار کر لی جو جنگی ہتھیار کا استعمال جانتے تھے اکالی دل اور اکالی فوج نے عہد کیا کہ وہ سکھ قوم کے مفاد کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ اکالی فوج میں فوجی نظم وضبط قائم کر دیا گیا اور رضا کاروں کی تربیت کے لیے کیمپ لگا دیے گئے۔ انہوں نے سکھوں سے چندہ بھی اکٹھا کیا اور اس کے لیے گھر گھر گئے بعد میں انگریز حکومت نے الزام لگایا کہ سکھوں نے اس رقم سے تلواریں' کلہاڑیاں' بندوقیں' ریوالور اور دوسرا اسلحہ خریدا اور فوج کے اندر بغاوت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حکومت پنجاب نے اکالی فوج کو خبردار کیا کہ وہ اپنی سرگرمیاں ختم کر دے۔ اسی دوران گوردواروں پربندھک کمیٹی کے انتہا پسند ارکان کے دباؤ پر کمیٹی نے ایک اجلاس میں کہا کہ الٹی میٹم کے باوجود گوردواروں کے معاملات سکھوں کے سپرد نہ کرنے کے بعد سکھ اب حکومت کے ساتھ کسی تعاون کے پابند نہیں رہے کمیٹی نے گاؤں گاؤں دیوان منعقد کیے اور 28 اگست 1922ء کو ایک قرارداد میں لیجسلیٹو کونسل کے سکھ ارکان سے کہا کہ مستعفی ہو جائیں۔ کمیٹی نے سکھ پنتھ سے کہا کہ وہ 50 ہزار رضا کار مہیا کرے تا کہ سکھوں کے مذہبی حقوق کے حصول کے لیے ایک ایسی فوج تیار کی جائے جس کا ہر فرد قربانی کے جذبے سے سرشار ہو ساتھ ہی کمیٹی نے سول نافرمانی کی مہم کی حمایت کر دی اور اپنی قوم سے کھدر استعمال کرنے اور غیر ملکی مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کر دی۔

اکالی دل نے اس سلسلے میں جو کامیابی حاصل کی اس کے بعد اس نے گوردواروں نے مہنتوں پر اپنا دباؤ بڑھا دیا کیونکہ اس کا مقصد تھا کہ گوردواروں کا انتظام اس کے ہاتھ میں آ جائے اور وہ ان کو جدوجہد کے لیے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکے لیکن حکومت نے اس مہم کو کانگریس کی سیاسی جدوجہد کے ساتھ جوڑ دیا اور فیصلہ کیا کہ وہ اس سلسلے میں براہ راست کانگریس سے بات کرے گی۔ ساتھ ہی اس نے مہنتوں کا حوصلہ بڑھایا کہ وہ اکالی دل کا دباؤ تسلیم نہ کریں۔ کمشنر لاہور ڈویژن مسٹر کنگ نے بعض مہنتوں سے خفیہ رابطے بھی رکھے۔ حکومت جو کوششیں کر رہی تھی اس کا پردہ اس وقت فاش ہوا جب ترن تارن میں اکالی دل کے رضا کاروں پر حملے ہوئے اور ننکانہ صاحب میں بھی حالات خراب ہوئے۔

گرونانک دیوجی کی جنم بھومی ہونے کی بنا پر ننکانہ صاحب کا گوردوارہ جنم استھان سکھوں کے

لیے بے حد متبرک مانا جاتا ہے۔اس وقت اس گوردوارے کا مہنت نارائن داس تھا۔بعض سکھوں نے اس پر الزام لگایا کہ اس نے گوردوارے کے اندر ایک داشتہ رکھ چھوڑی ہے اور اس کے ایک کمرے میں وہ اس کا ننگا رقص کراتا ہے۔اس پر مقامی سکھ بے حد مشتعل ہوئے اور اسے گوردوارہ چھوڑ دینے کی دھمکی دی۔ مہنت نے پولیس کی مدد مانگ لی اور ساتھ ہی چار سو کے لگ بھگ بدمعاشوں کی خدمات بھی حاصل کر لیں جن کو ہر وقت اپنی حفاظت کے لیے گوردوارہ میں موجود رہنے کا حکم ہوا۔ 20 فروری 1921ء کو مشتعل سکھوں کا ایک جتھہ گوردوارہ میں داخل ہو گیا۔ان کی قیادت لچھمن سنگھ دھاداوالیہ کر رہا تھا۔اس موقع پر مہنت کے بدمعاشوں نے جتھے پر تلواروں اور بندوقوں سے حملہ کر دیا جس نے کئی سکھ ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ان بدمعاشوں نے مرنے اور زخمی ہونے والے سکھوں کو بالوں سے گھسیٹتے ہوئے ایک بہت بڑی چتا میں پھینک دیا جو انہوں نے پہلے سے ہی جلا رکھی تھی۔اس سانحہ سے بہت کم لوگ بچ پائے اور انہوں نے پولیس اور مقامی لوگوں کو اس کی اطلاع دے دی۔لیکن پولیس کی آمد سے پہلے ایک سو تیس سکھ آگ کے ان شعلوں کی نظر ہو چکے تھے۔اس اندوہناک خبر نے پورے پنجاب میں سکھوں میں اشتعال پیدا کر دیا اور دور و نزدیک سے مسلح سکھوں کے جتھے ننکانہ صاحب پہنچنا شروع ہو گئے۔صورتحال انتہائی کشیدہ تھی۔ لوگوں کے جذبات مشتعل تھے اور وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ان حالات نے کمشنر لاہور مسٹر کنگ کو مجبور کر دیا کہ وہ گوردوارہ کی چابیاں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کر دے۔ننکانہ صاحب کے اس افسوسناک واقعہ نے پنجاب کے عوام کو ہلا کے رکھ دیا۔اخبارات نے حکومت پر کڑی تنقید کی اور سیاسی جماعتوں نے جلسے جلوسوں کے ذریعے اپنا احتجاج ظاہر کیا۔مہاتما گاندھی نے اس موقع پر کہا "یہ واقعہ ڈائر کی سفاکی کا دوسرا رخ ہے اور جلیانوالہ باغ سے بھی زیادہ دہشت اور بربریت کا مظہر ہے۔" یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب عدم تعاون اور تحریک خلافت کی وجہ سے ہندوستان بھر میں بے چینی عروج پر تھی۔حکومت پنجاب نے اپنا سارا غصہ اکالی دل پر نکالا جس کے بہت سے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور ان کی تنظیم کو کچلنے کی کوشش کی۔حکومت نے لاہور، امرتسر اور شیخوپورہ میں باغیانہ سرگرمیوں نے قانون کے تحت جلسہ وجلوسوں پر پابندی لگادی لیکن حکومت کے اس صبر وتشدد کے باوجود سکھوں کا رویہ اور سخت ہو گیا اور وہ احتجاج کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو اپیل پر پورے پنجاب میں سکھوں نے ننکانہ صاحب کے شہدا کا سوگ منایا اس روز انہوں نے سیاہ پگڑیاں پہنیں اور احتجاجی مظاہرے کیے۔کمیٹی کی اس اپیل پر پورے پنجاب کے سکھوں نے لبیک کہا اور گرونانک دیوجی کی برسی کے موقع پر تقریباً پچاس ہزار سکھ ننکانہ صاحب پہنچے جہاں ایک زبردست جلسہ میں سکھوں نے حکومت کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔اس جلسے میں بابا گوردت سنگھ اور ماسٹر موتا سنگھ نے خود کو

ڈرامائی انداز میں لوگوں کے سامنے پیش کر دیا ان دونوں رہنماؤں کے بارے میں عام طور پر یہ مشہور تھا کہ یا تو یہ مارے گئے ہیں یا روپوش ہو گئے ہیں۔ ان دونوں نے بے حد جذباتی تقاریب کیں جس کے بعد ہزاروں کے اس مجمعے نے قسم کھائی کہ وہ ننکانہ صاحب کے شہدا کا بدلہ لے کر رہیں گے۔

چابیوں کا جھگڑا: ان واقعات کے بعد جب سکھوں نے بھرپور جدوجہد شروع کرنے کا عندیہ دیا تو حکومت نے صورتحال کو بہتر حکمت عملی سے بچانے کی بجائے ایسے اقدامات کیئے کہ سکھ قوم کے جذبات مزید مشتعل ہو گئے۔ ہوا یوں کہ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی مجلس عاملہ نے 29 اکتوبر 1921ء کو ایک قرارداد پاس کی جس میں گولڈن ٹمپل امرتسر کے منیجر سندر سنگھ رام گڑھیہ سے کہا گیا تھا کہ وہ گوردوارے کی چابیاں کمیٹی کے نو منتخب صدر سردار کھڑک سنگھ کے حوالے کر دے۔ حکومت پنجاب کو کھڑک سنگھ کے بارے میں شبہات تھے اس لیے اس نے ڈپٹی کمشنر امرتسر سے کہا کہ وہ سندر سنگھ کو ہدایت کرے کہ گوردوارے کی چابیاں اور دیگر قیمتی مال و متاع سرکاری خزانے میں جمع کرا دے۔ چنانچہ اس نے 53 چابیوں کا ایک گچھ سرکاری خزانے میں جمع کرا دیا۔ حکومت نے یہ قدم اس لیے اٹھایا کہ انتہا پسند سکھ گوردوارے کی رقم کو اپنی ایجی ٹیشن کے لیے استعمال کریں گے۔

حکومت کے اس اقدام کو شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے بے حد برا بھلا کہا اور سیاسی سطح پر اور اخبارات میں بھی اس کی کڑی نکتہ چینی کی گئی۔ ساتھ ہی حکومت نے باغیانہ سرگرمیوں کے قانون کے تحت جلسے جلوسوں پر پابندی لگا دی اور کمیٹی کے سینکڑوں کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ کمیٹی نے اپنا مطالبہ پھر دوہرایا کہ گوردوارے کی چابیاں سردار کھڑک سنگھ کے حوالے کی جائیں اور گرفتار شدہ سکھ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے۔ گرو گوبند سنگھ کے یوم پیدائش کے موقع پر ڈپٹی کمشنر امرتسر نے یہ چابیاں عارضی طور پر کمیٹی کے سپرد کرنے کی پیشکش کی تا کہ وہ اس موقع کی مناسبت سے منعقد کی جانے والی رسومات ادا کرنے کے لیے اپنا مقدس ساز و سامان گوردوارے سے نکال لیں۔ لیکن کمیٹی نے اس عارضی پیشکش کو مسترد کر دیا۔ ان واقعات کے بعد کشیدگی میں مزید اضافہ ہوا اور شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی سکھوں کی واحد نمائندہ تنظیم کے طور پر ابھر کر سامنے آئی۔ صورتحال کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے حکومت نے 17 جنوری 1922ء کو گوردوارے کی چابیاں کمیٹی کے سپرد کرنے اور تمام سکھ قیدیوں کو غیر مشروط طور پر رہا کرنے کا اعلان کر دیا۔ سکھوں نے حکومت کے اس فیصلے کو اپنی فتح قرار دیتے ہوئے خوشی سے جشن منایا۔ اب ان کے حوصلے بھی بڑھ گئے تھے۔ اس لیے پھر سوچنے لگے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ تمام گوردواروں کا انتظام کمیٹی کے سپرد کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دینی چاہیے۔ چنانچہ آئندہ ایک مہینہ میں اکالیوں کے جتھے گردواروں میں داخل ہوئے اور سرکاری لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کر کے قبضہ کر لیتے۔ چنانچہ

23 فروری اور 27 مارچ 1922ء کے درمیانی عرصے میں اکالی جتھوں نے پنجاب کے مختلف علاقوں میں 15 گوردواروں کا انتظام اپنے قبضے میں کرلیا۔

اس دوران لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر ایڈورڈ میکلیگن نے گوردواروں کے سلسلے میں قانون سازی کا فیصلہ کرلیا۔ یونینسٹ پارٹی کے سربراہ اور صوبائی وزیر سر فضل حسین نے ایک بل لیجسلیٹو کونسل میں پیش کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ تمام گوردوارے سکھوں کی کسی نمائندہ تنظیم کے حوالے کردیے جائیں۔ اس قانون کے تحت صرف سکھوں پر مشتمل ایک بورڈ آف کمشنرز مقرر ہونا تھا تاکہ گوردواروں کا انتظام صرف سکھ نمائندے سنبھال لیں اور مہنتوں یا اودیسیوں کا اس میں کوئی عمل دخل نہ ہو در پردہ اس قانون کے تحت شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو سکھوں کے مذہبی مقامات کا انتظام سنبھالنے سے روکنا تھا۔ چنانچہ کمیٹی نے اس قانون کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور گوردواروں کو قبضہ میں لینے کے لیے اپنی کوشش جاری رکھی۔ اس دوران امرتسر سے 12 میل دور گورو کا باغ نامی سکھوں کی زیارت گاہ وجہ نزاع بنی۔

گورو کا باغ گوردوارہ کے مہنت نے 1921ء کے اوائل میں کمیٹی کا اختیار تسلیم کرتے ہوئے اس گوردوارے کا انتظام اس کے سپرد کرنے پر رضامندی ظاہر کردی تھی۔ اس گوردوارے کے سیوادار باورچی خانہ میں جلانے کے لیے لکڑی ایک قریبی جنگل سے لاتے تھے۔ اگست 1921ء میں کسی وجہ کے بغیر اس گوردوارے کے اودیسی مہنت نے حکام سے شکایت کردی کہ گوردوارہ کے سیوادار بغیر اجازت جنگل سے لکڑیاں کاٹتے ہیں پولیس نے مداخلت بیجا کے الزام میں کئی سکھ سیواداروں کو گرفتار کرلیا۔ سکھوں نے اس پر ستیہ گرہ شروع کردی انہوں نے قانونی پابندی کی مخالفت کرتے ہوئے جلسے منعقد کیے اور حکومت پر کڑی تنقید کی اس پر حکومت نے کمیٹی کے متعدد رہنماؤں کو گرفتار کرلیا۔ ان میں ماسٹر تارا سنگھ اور مہتاب سنگھ بھی شامل تھے۔ اس کے بعد کمیٹی ہر روز ایک ہزار سکھوں کا جتھہ گوردوارہ بھیجتی مگر جتھے کے شرکاء کو سختی سے تاکید کی جاتی کہ وہ پرامن رہیں اور عدم تشدد کے ہتھیار کے ذریعے اپنا احتجاج جاری رکھیں چنانچہ ہر روز جتھے کے بہت سے رضاکار گرفتار ہوتے مگر ان کے تسلسل میں کمی نہیں آئی اور روزانہ کے اس احتجاج کا سلسلہ جاری رہا پولیس ان پر ڈنڈے اور لاٹھیاں برساتی انہیں کیچڑ میں دھکیلتی اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ روزانہ زخمی ہوتے رہے۔ گوردوارہ گورو کا باغ کو جانے والی سڑکوں پر پولیس ہمہ وقت ناکہ بندی کیے رہتی اور وہاں عارضی چوکیاں قائم کردی گئیں۔ جگہ جگہ ان جتھوں کو روکا جاتا پولیس نے بکتر بند گاڑیوں کا بندوبست بھی کر رکھا تھا مگر پولیس کی کوئی سختی سکھ رضاکاروں کو احتجاج سے نہ روک سکی۔ حکومت کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ 8 اکتوبر 1922ء تک 819 سکھ رضاکاروں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ جیلوں میں ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ وہاں مزید قیدیوں کی گنجائش ختم ہوگئی اور حکومت کو ان کے لیے

مزید راشن کا بندوبست کرنا پڑا۔ سکھوں نے اس پرامن جدوجہد میں اس قدر ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا کہ پورے ملک میں ان کو سراہا گیا۔ لالہ لاجپت رائے نے کہا "عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سکھ آزادی کی جدوجہد میں پیچھے رہ گئے ہیں کچھ لوگوں کا یہ تصور بھی تھا کہ جنگجو قوم ہونے کی وجہ سے وہ عدم تشدد کی راہ پر نہیں چل سکتے۔ مگر سکھوں نے جو بے مثال جدوجہد کی ہے اس نے ان دونوں نظریات کو باطل کر دیا ہے۔ جہاں تک عدم تشدد کا سوال ہے انہوں نے 15 نومبر کو ننکانہ صاحب اور بعد میں امرتسر (گرو کا باغ) اور اجنالہ نے عظیم مثال قائم کی ہے۔ انہوں نے حکومتی اشتعال انگیزی اور تشدد کے باوجود پرامن رہنے اور قربانی دینے کی وہ داستان رقم کی ہے جو حالیہ تاریخ میں بے نظیر ہے۔" پادری سی ایف اینڈریو نے جو سکھوں کی جدوجہد کا ایک چشم دید گواہ تھا لکھا "سکھوں نے مصائب کی بھٹی میں جل کر بہادری کی نئی مثال قائم کی ہے اور دنیا کو اخلاقی جنگ کا ایک نیا درس دیا ہے" ایک فوجی پنشنر صوبیدار امر سنگھ نے امرتسر میں لالہ امرناتھ کی عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا کہ سکھوں نے برطانیہ کے لیے جنگیں لڑیں اس وقت انہیں سر پر بٹھایا گیا لیکن جب سے گوردواروں کی اصلاح کی جدوجہد شروع ہوئی ہے حکومت کا رویہ سخت ہو گیا ہے۔ "میں نے دیکھا میرے بھائی بندوں کو مارا پیٹا گیا۔ ان پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے انہیں غیر قانونی سختیوں میں مبتلا کیا گیا انہیں داڑھیوں اور بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا گیا۔ ہمارے گوردواروں کو ناپاک کیا گیا۔ سکھوں کو ناقابل بیان ابتلا سے گزرنا پڑا...... ہمارے صبر کا انتہائی سطح تک امتحان لیا گیا لیکن دنیا نے دیکھا کہ ہم ہر امتحان سے کامیاب ہو کر نکلے ہم نے ثابت کر دیا کہ ہم اپنے گروؤں کے سچے پیروکار ہیں۔"
مہنتوں کی حمایت میں حکومت نے سکھوں پر جو سختیاں کیں اس کے نتیجے میں ان میں اپنے مذہب کے ساتھ ایک نئی لگن دیکھنے میں آئی ساتھ ہی سیاسی سطح پر بھی سکھ ایک پختہ کار قومی ذہن کے ساتھ ابھرے۔

بھائی پھیرو گوردوارہ مورچہ: ضلع لاہور میں دیہی قصبہ بھائی پھیرو کا گوردوارہ اپنی وسیع زرعی زمین کی وجہ سے ایک اہم اور مالدار تھا اس سے ملحقہ زمین 5000 ایکڑ کے لگ بھگ تھی اس کے علاوہ اس کی پانچ ہزار مالیت کی ایک جاگیر بھی تھی۔ گوردوارے کا مہنت بوڑھا تھا جو مؤثر طور پر اس کا انتظام نہیں چلا سکتا تھا۔ اس کی اکثر زمین ادیسی مہنتوں کے زیر کاشت تھی جو زمین کا مالیہ ادا کرتے تھے اور نہ ہی اس کی فصل کا حصہ گوردوارہ کو ادا کرتے تھے۔ اس کا ایک مہنت پالا رام ننکانہ صاحب کے بدنام مہنت نرائن داس کا بھائی تھا۔ 1922ء کے اواخر میں بھائی پھیرو گوردوارہ کے مہنت نے شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کو یقین دلایا کہ وہ گوردوارہ اور اس کی زمین کمیٹی کے حوالے کر دے گا۔ کمیٹی نے کہا اس کے بدلے میں وہ مہنت کی معقول پنشن مقرر کر دے گی۔ اگست 1923ء تک مہنت اپنے معاہدے پر قائم رہا اس دوران ادیسی کاشتکاروں نے کمیٹی کی مخالفت شروع کر دی اور کمیٹی نے جواب میں ان کو زمین سے بے دخل کرانے

کی کوشش شروع کردی اس دوران مہنت نے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ادسی کاشکاروں کا ساتھ دیا۔4 دسمبر کو بعض سکھوں نے مبینہ طور پر گوردوارے میں داخل ہو کر ایک گودام کا تالہ توڑ دیا اور وہاں ذخیرہ شدہ غلہ لوٹ لیا۔ مہنت نے پولیس میں شکایت کردی جس نے 11 سکھوں کو گرفتار کرلیا حکومت نے صورتحال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے پولیس کا ایک خصوصی دستہ بھائی پھیرو روانہ کر دیا۔ اس سے حالات کشیدہ ہو گئے اور سکھوں نے یکم جنوری کو گوردوارہ کے کنویں اور پالا رام کی زمینوں پر قبضہ کرلیا۔ پولیس نے انہیں قبضہ چھوڑنے کو کہا اور جب انہوں نے انکار کر دیا تو سبھی کو گرفتار کرلیا۔ اس کے بعد 42 سکھوں کا ایک اور جتھہ وہاں پہنچا اور کنویں اور زمین پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ پولیس نے انہیں بھی گرفتار کرلیا اس کے بعد تو ایک کے بعد ایک جتھہ وہاں پہنچنا شروع ہو گیا۔ چند ہی روز میں تقریباً 230 سکھوں کو گرفتار کر لیا گیا ان میں سے 180 کو سزائیں سنائی گئیں۔ اس دوران جیتو کا مورچہ بھی شروع ہو گیا۔

جیتو مورچہ: یہ مورچہ نابھہ کے مہاراجہ رپودمن سنگھ کو ہٹا کر اس کی جگہ اس کے کمسن بچے کو راجہ مقرر کرنے کے خلاف شروع ہوا۔ مہاراجہ رپودمن سنگھ سکھوں کی تحریک کا در پردہ حامی اور مددگار تھا۔ اس کی اس مدد کے باعث انگریز کے حامی پٹیالہ کے مہاراجہ کے پہلے ہی سے نابھہ کی ریاست سے چپقلش چلی آرہی تھی ایک ایسا مرحلہ بھی آیا کہ انگریز سرکار نے رپودمن کو منصب چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور اس کی جگہ اس کے کمسن بیٹے کو مہاراجہ کا منصب سونپ دیا گیا کمسن راجہ کی اعانت کے لیے ایک انگریز افسر کو نگران مقرر کر دیا گیا۔ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے 9 ستمبر 1923ء کو یوم نابھہ منایا اس روز سکھوں نے جیتو کے گوردوارے میں صبح سے شام تک معزول راجہ کے حق میں گرنتھ کا پاٹھ کیا۔ ایک مرحلہ پر پولیس نے پاٹھ میں مداخلت کی اور اسے رکوا دیا۔ کمیٹی نے ایک کے بعد ایک جتھہ جیتو بھیجا تاکہ پاٹھ کا سلسلہ رکنے نہ پائے لیکن جو بھی گرنتھ کا پاٹھ شروع کرتا اسے گرفتار کرلیا جاتا اور کئی میل دور لیجا کر چھوڑ دیا جاتا لیکن ان میں سے کوئی بھی واپس نہ جاتا اور پیدل چل کر واپس گوردوارے پہنچتا اور پھر پاٹھ شروع کر دیتا یہ سلسلہ دن بھر چلتا رہا۔ اگلے روز حکومت نے شرومنی گوردوارہ پربندھک کو غیر قانونی قرار دے کر ریاست میں اس پر پابندی عائد کر دی کمیٹی کے 59 رہنماؤں کو گرفتار کرلیا ان پر بغاوت کے مقدمات قائم کیے گئے اور مقدمہ کے لیے انہیں لاہور کے شاہی قلعہ میں منتقل کر دیا گیا۔ اس ریاستی جبر کے باوجود سکھوں کی تحریک نہیں رکی اور ایک ایک کر کے سکھوں کے جتھے جیتو پہنچتے رہے اور ان کی گرفتاریاں بھی مسلسل ہوتی رہیں لیکن جب 500 سکھوں کا شہیدی جتھہ وہاں پہنچا تو حکومت نے تمام تر احتیاط بالائے طاق رکھتے ہوئے سکھوں کو سبق سکھانے کا فیصلہ کرلیا۔ جب شہیدی جتھہ جیتو میں داخل ہو رہا تھا تو ان پر فائرنگ کر دی گئی جس سے ایک سو سکھ موقع پر مارے گئے اور 200 سے زائد زخمی ہو گئے لیکن گولی کے باوجود سکھ غم و غصہ اور

مذہبی جوش کے بل پر آگے بڑھتے رہے انہیں پتہ تھا کہ وہ موت کے منہ میں جا رہے ہیں لیکن ان کے ارادے میں لغزش نہیں آئی وہ اپنے ساتھیوں کو بچانے اور شہیدی درجہ حاصل کرنے کے لیے بیتاب نظر آئے تھے جیسا کہ بعد میں ایک عینی شاہد نے عدالت کے روبرو بیان میں کیا۔ اگلے ہی روز ایک اور جتھہ جیتو میں داخل ہو رہا تھا اور یہ سکھوں کی مذہب اور مقصد کے ساتھ لگن کی انتہا تھی جتھوں کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا اور اس جدوجہد نے پورے ہندوستان کی ہمدردی حاصل کر لی۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اس تحریک کے ساتھ مکمل یک جہتی کا اظہار کیا پنڈت جواہر لعل نہرو کو خاص طور پر جیتو بھیجا گیا جہاں انہیں دوسرے ساتھیوں اے ٹی گڈوانی اور سنتانام کے ہمراہ گرفتار کر لیا گیا۔

سکھوں کا جوش و خروش رفتہ رفتہ پورے پنجاب میں پھیل گیا اور دور نزدیک سے وہ وفود کی صورت میں جیتو آتے رہے۔ شہیدی جتھہ کے شرکاء جہاں بھی جاتے ان کا قومی ہیرو کی طرح استقبال کیا جاتا۔ ہر گاؤں میں جلسہ برپا ہو جاتا جہاں مقامی لوگ تقریروں میں حکومت کی فائرنگ کی مذمت کرتے۔ اس دوران جیتو میں فائرنگ کی تحقیقات کا مطالبہ زور پکڑ گیا اور مجبوراً حکومت کو ایک ماتحت مجسٹریٹ کو تحقیقاتی افسر مقرر کرنا پڑا جو صوبائی سول سروس سے تعلق رکھتا تھا۔ لوگوں نے اسے انصاف کی تحقیر اور اپنی بے عزتی سمجھا۔ جب یہ تحریک جاری تھی تو نابھہ کے انگریز ایڈمنسٹریٹر ولسن جونسٹن کا پنجاب اور مرکز کی حکومتوں کے ساتھ مسلسل رابطہ رہا۔ سرکاری ریکارڈ ظاہر کرتا ہے کہ انتظامیہ کی ان تینوں سطحوں پر خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا۔ حکومت پنجاب اسی کوشش میں لگی کہ کسی طرح اکالی دل کو انتہا پسند تنظیم قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی جائے۔ صوبائی حکومت مرکزی حکومت کو متواتر یہ لکھتی رہی کہ اکالی دل درحقیقت غدر پارٹی کے بچے کھچے لوگوں کا ایک گروہ ہے جو مذہب کی آڑ میں صوبہ میں عوامی بے چینی پھیلا رہی ہے۔ ایک مراسلہ میں صوبائی حکومت نے لکھا "......(اکالی دل) کا حقیقی اور قطعی مقصد یہ ہے کہ ایجی ٹیشن کو اس سطح پر پہنچا دیا جائے جس سے پوری سکھ قوم باغی ہو کر حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتا کہ پنجاب کی وہ خود مختاری واپس حاصل کی جا سکے جو سکھ حکمرانی کے دنوں میں تھی اور جو انگریزی حکومت نے مہاراجہ دلیپ سنگھ سے لے لی تھی۔" چنانچہ حکومت نے اکالی دل کو بدنام کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کانگریس اور دوسری سیاسی تنظیموں کو بھی اکالیوں سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کے لیے انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا کہ اکالی دل جلد ہی دہشت گردی شروع کرنے والی ہے لیکن اکالی دل کو قومی سطح پر سیاسی اچھوت بنانے میں حکومت کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ دوسری طرف سکھ ہر قسم کے سرکاری حربے اور پراپیگنڈا سے بے نیاز ہو کر ستیہ گرہ کا ہتھیار استعمال کرتی رہی اور جیتو کا مورچہ قائم رہا اور حکومت بے بس ہو کر رہ گئی اور جب نہرو نے ان الفاظ میں اکالیوں کی جدوجہد کو سراہا کہ "انہوں نے تحمل اور جرأت کی مثال قائم کر دی ہے" اور ہر

طرح کی زیادتیوں کا جواب پرامن جدوجہد سے دیا ہے" تو حکومت نے اشتعال انگیزی اور تشدد کی نئی مثال قائم کردی۔ پولیس نے امرتسر میں اکال تخت پر ہلہ بول دیا اور شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کا دفتری ریکارڈ قبضے میں لے لیا۔ ادھر نابھہ جیل میں سکھ قیدیوں پر تشدد کا نیا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ ظلم اس حد تک بڑھا کہ نابھہ جیل سمیت بہت سی جیلوں میں کئی قیدیوں کی موت ہوگئی۔ حکام نے جیلوں کی صفائی کا کام بھی روک دیا جس سے قیدیوں پر بیماریوں کا حملہ ہوگیا ان بے بیمار قیدیوں کو طبی امداد بھی فراہم نہیں کی گئی۔ سرکاری اعداد وشمار کے مطابق صرف نابھہ جیل میں سیاسی قیدیوں کی تعداد 5183 ہوچکی تھی جن میں سکھ بھاری اکثریت میں تھے۔ حکومت نے ان اموات کی وجہ قیدیوں کا بڑھاپا قرار دیا اور کہا کہ ان کی عمریں 70 سے 80 برس تھی جو شدید گرمی میں طویل مسافت کرتے رہے۔ لندن میں ایک نائب وزیر نے الزام لگایا کہ اکالی تنظیموں نے ان بوڑھے اور اپاہج لوگوں کو عوامی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا چنانچہ انگریز نے حب الوطنی اور شدید مذہبی جذبات کو سستی سیاسی شہرت حاصل کرنے کا ذریعہ گردانا جو کہ ان کے سامراجی عزائم کا آئینہ دار تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس جدوجہد میں لوگوں میں جوش وخروش اس قدر زیادہ تھا کہ ان کے نزدیک طویل عمر اور مرد وزن کی کوئی تمیز نہیں رہی تھی۔ تاہم حکومت اور حکومت مخالف قوتوں کی الزام تراشیوں سے قطع نظر اعلیٰ سطح پر جیتو کے واقعات کی تحقیقات کا مطالبہ اس قدر زور پکڑ گیا کہ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ہیلے نے فیصلہ کیا کہ ایک غیر جانبدار مبصر کو نابھہ بھیجا جائے تاکہ وہ واقعات کا آزادانہ جائزہ لے کر حکومت کو حقیقت پر مبنی رپورٹ پیش کرسکے۔ مہاتما گاندھی نے اس سلسلے میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو کا نام تجویز کیا لیکن اسے نہیں مانا گیا حکومت نے جیل خانہ جات کے انسپکٹر جنرل کو تحقیقات کے لیے بھیجنے کا فیصلہ کیا اور نابھہ کے حکام نے اسے تسلیم کرلیا ادھر ریاستی حکام نے سکھ سدھار کمیٹی کے ایک جتھے کو جیتو کے گوردوارے میں داخل ہوکر اکھنڈ پاٹھ کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

ان حکومتی اقدامات کے باعث کشیدگی میں معمولی کمی آئی اور ساتھ ہی شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے اعتدال پسند رہنماؤں نے بھی اطمینان کا سانس لیا کیونکہ وہ حکومتی دباؤ اور جواب میں سکھوں کی بے مثال مزاحمت کے اس لیے پریشان تھے کہ دیہات میں انتہا پسندوں اور ببر اکالیوں کا اثر و نفوذ بڑھ رہا تھا ان کی خواہش تھی کہ کوئی نہ کوئی فوری حل نکالا جاسکے تاکہ معاملات اس کے قابو سے باہر نہ ہونے پائیں۔ کمیٹی نے جودھ سنگھ' ماسٹر تارا سنگھ' نرائن سنگھ' گوربخش سنگھ اور مہتاب سنگھ پر مشتمل ایک مذاکراتی ٹیم تشکیل دی جسے حکومت سے مذاکرات کرنا تھے یہ ٹیم 19 جولائی کو جیتو پہنچی اور نابھہ کے ایڈمنسٹریٹر کے ساتھ بات چیت کی شرائط طے کیں۔ بعد میں نابھہ میں اور پھر لاہور میں پنجاب حکومت کے ساتھ ان کے مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے گوردواروں کے

انتظامات کے حوالے سے ایک قانون کا مسودہ گورنر کو پیش کر دیا۔ اس کے علاوہ یہ باتیں بھی طے ہو گئیں کہ جیتو کے گوردوارہ میں گرنتھ کے مسلسل پاٹھ کے لیے ایک وقت میں کتنے لوگ موجود ہونا چاہئیں بھائی جودھ سنگھ نے عورتوں کی گوردوارہ میں موجودگی کی مخالفت کی کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ان کی موجودگی سے انتہا پسند قوتوں کو تقویت ملے گی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ دیہی علاقوں میں انتہا پسندوں کا اثر بڑھتا جا رہا تھا حالات کی نزاکت کے پیش نظر حکومت نے شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے ساتھ معاہدہ کر لیا جس کے تحت کمیٹی نے اعلان کیا کہ جیتو مورچہ قائم تو رہے گا لیکن نابھہ کے مہاراجہ پوردمن سنگھ کی بحالی کے لیے نہیں بلکہ سکھ قوم کے حقوق کی خاطر اس کا وجود رہے گا۔

گورنر ہیلے نے جو ایک چالاک آدمی تھا اس موقع کا خوب استعمال کیا اس نے نئے قانون کے استعمال میں امتیاز برتنے کا فیصلہ کیا وہ چاہتا تھا کہ اعتدال پسند سکھوں کو رہا کر دیا جائے اور انتہا پسندوں کو بدستور جیل میں رکھا جائے اس سے حکومتی دباؤ بھی قائم رہتا اور کمیٹی بھی خوش ہو جاتی چنانچہ اس نے نابھہ کے ایڈمنسٹریٹر کو لکھا کہ جیل سے صرف ان قیدیوں کو رہا کیا جائے جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ گڑبڑ نہیں کریں گے۔ لیجسلیٹو کونسل نے گوردواروں کے انتظام کے بارے میں سرکاری بل 1925ء میں منظور کر لیا جب اس پر مبنی قانون رائج ہو گیا تو حکومت نے بھی اعتدال پسند سکھوں کو رہا کر دیا اس کے برعکس ایک بھی انتہا پرست جیل سے باہر نہیں نکالا گیا شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی بھی شائد یہی چاہتی تھی کیونکہ اس قانون کے تحت اسے گوردواروں کا انتظام حاصل ہو گیا لیکن اس صورتحال کا قومی سطح پر گہرا نقصان ہوا حکومت نے معاشرہ میں تقسیم کو رواج دیا اور ہندوؤں اور سکھوں میں یہ احساس پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی کہ وہ الگ قوموں سے تعلق رکھتے ہیں اس کے علاوہ اعتدال پسند اور انتہا پسند کی سطح پر بھی سیاسی تقسیم واضح ہو گئی تھی اور اس کی بڑی وجہ خود شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی تھی جس کے سکھوں کی واحد نمائندہ تنظیم ہونے کے باعث انگریزی سرکار کو در پردہ یقین دلا دیا کہ ببر اکالی لوگوں کے خلاف کسی حکومتی اقدام کو وجہ نزاع نہیں بنایا جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر ایک قوم اور ایک مقصد کو دھوکا دیا گیا اور دغا کرنے والے کوئی غیر نہیں بلکہ اپنے ہی تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ہندوستان سیاسی طور پر دو دھڑوں میں بٹا ہوا ہے اور قومی دھارے کی سیاسی تنظیموں کا انتہا پسندوں اور اشتراکی نظریات رکھنے اور اس بنیاد پر ایک نظام قائم کرنے والوں کے درمیان ایک نظریاتی تصادم موجود تھا اور ان دونوں کی سیاسی حکمت عملی میں بھی بہت فرق تھا اکالیوں کی جدوجہد جو لگ بھگ چار برس جاری رہی اپنی عظیم قربانیوں' استقامت اور مقصد کے ساتھ لگن کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہے گی اس دوران 30 ہزار افراد گرفتار ہوئے ہلاک ہونے کی تعداد 4000 اور زخمی ہونے والوں کی 2000 بتائی گئی اس تحریک

میں شامل افراد پر مجموعی طور پر 15 لاکھ روپے جرمانہ کیا گیا ڈاکٹر امید کر کے بقول اس کا ایک پہلو یہ تھا کہ انگریزوں کا سکھوں پر اعتماد کم ہوا۔ 1914 میں تقریباً 20 فیصد سکھ برطانوی فوج میں بھرتی کیئے گئے 1930ء میں یہ شرح کم ہو کر 13 فیصد رہ گئی ان کے مقابلے میں پنجابی مسلمانوں اور سرحد کے پٹھانوں کی شرح اسی عرصے میں 26 فیصد سے بڑھ کر 34 فیصد ہو گئی۔ اس میں شک نہیں کہ سکھوں کی یہ تحریک گوردواروں میں مہنتوں کی موجودگی اور ان کی غیر اخلاقی حرکتوں کی وجہ سے شروع ہوئی اور مہنتوں کی سرکاری سرپرستی کے باعث اس کو تقویت ملی لیکن شائد اصل وجہ ان گوردواروں کی وہ جاگیر اور مال و دولت تھی جس سے سالانہ لاکھوں روپے کی آمدن حاصل ہوتی تھی سکھ چاہتے تھے کہ یہ آمدن ان کے سیاسی مقاصد اور قوم کی تعلیمی اور معاشرتی بہبود کے کام آئے اور ان کی ثقافت ترقی کرے اس کا ایک اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے انتظام سنبھالنے کے ایک برس کے اندر ان گوردواروں کی سالانہ آمدنی 10 لاکھ سے تجاوز کر گئی جس سے وہ نہ صرف سیوا اداروں اور گرنتھیوں کو معاوضہ ادا کرتی تھی بلکہ اپنے سیاسی مقاصد اور سکھوں پر سماجی اجارہ داری قائم کرنے کے لیے استعمال بھی کرتی تھی۔ یہ کمیٹی ایک طرح سے حکومت کے اندر حکومت تھی جو سکھوں کی قومی اور سیاسی زندگی کا مرکزی نکتہ بنی رہی تا آنکہ دوسری تحریکوں نے اسے کمزور کر دیا۔ پنجاب میں اس تحریک کی تیزی سے مقبولیت کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے بعد پورے صوبے بلکہ ہندوستان بھر میں غم و غصہ پہلے ہی سے موجود تھا اور لوگوں کو اس کے اظہار کے کسی موقع کا انتظار تھا اسی موقع پر شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی ایک مہمیز ثابت ہوئی جس نے سکھوں کی تحریک کو ایک قومی جدوجہد بنا دیا اور ایک اہم پہلو یہ تھا کہ دیہات کے غریب عوام بھی اس میں شامل ہو گئے اور یہ اس وجہ سے ممکن ہوا کہ جس سکھ قوم کو ابتلا میں ڈالا گیا۔ اس کا کسانوں میں بہت رسوخ تھا اس تحریک میں کسانوں کا کردار مرکزی تھا اور اس نے آئندہ سیاسی جدوجہد کے لیے بڑی قوت فراہم کی لیکن شائد اس وجہ کا اہم ترین نکتہ یہ تھا کہ ایک ایسی قوم نے جس کے جنگجو اور غصیلے ہونے کا تاثر عام تھا بے حد استقامت کے ساتھ عدم تشدد کو ہتھیار بنایا اور کسی بھی مرحلے پر مشتعل نہیں ہوئی یہی اس خطے کی ایک نئی تصویر تھی۔

+

باب:7

پنجاب کی سیاست

1935 تا 1946

سول نافرمانی کی مہم کو 1934ء میں ختم کر دیا گیا بعدازاں انڈین نیشنل کانگریس نے لیجسلیٹو کونسلوں میں شرکت کا فیصلہ کر لیا۔1935ء میں جو ایکٹ منظور ہوا اس کے تحت 1937ء کے اوائل میں ہندوستان بھر میں صوبوں میں انتخابات ہوئے ان تمام واقعات نے ہندوستان کی آزادی کا ایک نیا راستہ متعین کیا کانگریس نے 11 میں سے 8 صوبوں میں انتخاب جیتا لیکن پنجاب میں قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ کر سکی اور جواہر لعل سمیت کانگریس کے متعدد رہنماؤں کا صوبے کا سیاسی اور انتخابی دورہ عوام پر کوئی خاص تاثر نہ چھوڑ سکا۔ یونینسٹ پارٹی پنجاب میں اکثریتی پارٹی بن کر ابھری اور سر سکندر حیات کی قیادت میں صوبے میں حکومت بنائی۔

صوبوں میں حکومتیں قائم کرنے کے بعد کانگریس نے جیلوں سے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا لیکن پنجاب میں وزیر اعظم سکندر حیات کی موجودگی میں اکثر قیدیوں کو رہائی نہیں ملی یونینسٹ پارٹی کا دعویٰ تھا کہ وہ غیر فرقہ وار تنظیم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مسلم لیگ کی فرقہ وارانہ سیاست کے تحت کام کر رہی تھی اور بتدریج صوبے میں مسلم لیگ کی بنیادیں مضبوط کر رہی تھی۔

اسی دوران 3 ستمبر 1939ء کو دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور برطانیہ نازی جرمنی کے خلاف میدان میں آ گیا ہندوستان میں بھی وائسرائے نے اہل ہندوستان کی طرف سے جنگ میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ انڈین نیشنل کانگریس فاشزم کے خلاف تھی اور جرمنی کی پولینڈ میں جارحیت کی مذمت کی لیکن جنگ میں حصہ لینے سے قبل اس نے حکومت سے مطالبہ کیا وہ اپنے جنگی عزائم کا اعلان کرے اور

اسے ہندوستان کی سیاسی صورت حال کے تابع بنائے کانگریس نے کہا برطانیہ جنگی حکمتِ عملی کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کا فیصلہ بھی کرے۔ برطانیہ کی حمایت اس شرط سے شروط کر دی گئی۔ 17 اکتوبر کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ برطانیہ کا ہندوستان چھوڑنے کا کوئی رادہ نہیں حکومت نے کانگریس کا یہ مطالبہ بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ مرکز میں تمام جماعتوں پر مشتمل ایک قومی حکومت قائم کی جائے چونکہ 8 صوبوں میں کانگریس کی حکومت تھی حکومت کے اس انکار نے اس کی سیاسی حیثیت کو داؤ پر لگا دیا چنانچہ چاروناچار کانگریس کو صوبوں میں حکومت چھوڑنا پڑیں مستعفی ہونے کے بعد کانگریس نے ایک بار پھر سول نافرمانی شروع کرنے کا اعلان کر دیا لیکن ساتھ ہی لوگوں سے کہا کہ حکومت کو جو ''زندگی اور موت کی جنگ میں الجھی ہوئی ہے'' پریشان نہ کیا جائے۔

کانگریس کی انفرادی ستیہ گرہ کی اپیل زیادہ مقبول عام نہ ہوسکی اور پنجاب میں تو اس کی قبولیت اور بھی کم تھی انفرادی ستیہ گرہ کی اپیل بھی ایسی تھی کہ اس میں تسلسل کا ہونا بہت مشکل تھا۔ مثال کے طور پر لوگوں سے یہ کہا گیا کہ وہ چرخہ کاتیں' کھدر بنائیں اور اعلان کریں کہ انہوں نے چھوت چھات کو مسترد کر دیا ہے اور اچھوت طبقوں سے روابط بڑھائے ہیں حتیٰ کہ نہرو اور سبھاش چندر بوس بھی اس نیم دلانہ اپیل سے متفق نہیں تھے نہرو تو بعد میں مان گئے لیکن بوس نے اس انوکھے احتجاج کی افادیت آخر دم تک تسلیم نہیں کی۔ پنجاب میں اس اپیل کی عدم مقبولیت کی ایک اضافی وجہ یہ بھی تھی کہ صوبائی حکومت جنگ میں برطانیہ کے ساتھ غیر مشروط یک جہتی کا اعلان کر چکی تھی۔

سکھ دو کشتیوں کے سوار تھے اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے ایک طرف تو چیف خالصہ دیوان نے جنگ میں برطانیہ کا ساتھ دینے کا اعلان کر رکھا تھا اور دوسری طرف اکالی پارٹی نے جو بدنظمی کا شکار تھی جنگ میں حکومت کے ساتھ تعاون کے لیے تیار نہ تھی لیکن وہ فوج میں سکھوں کی نمائندگی میں کمی بھی نہیں چاہتی تھی دوسری طرف پنجاب کے عوام جو کہ حکومت کے خلاف جدوجہد میں بہت آگے بڑھ چکے تھے اور جنہیں برطانوی فوج سے برگشتہ کر دیا گیا تھا اب فوج کے ساتھ تعاون کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ خاندان بھی جو فوج میں خدمات انجام دے چکے تھے۔ اب اس میں شمولیت کے لیے ہچکچا رہے تھے حتیٰ کہ فوج کے سنٹرل انڈین کیولری نے لڑائی کے لیے بیرونِ ملک جانے سے انکار کر دیا۔ 31 ویں پنجاب رجمنٹ کے بعض سکھ جوانوں نے فوج سے علیحدگی اختیار کر لی اور افریقہ میں رائل انڈین آرمی کی سپلائی کور نے اسلحہ اور دیگر سامان جہاز پر یہ کہہ کر لادنے سے انکار کر دیا کہ وہ قلیوں کی طرح کام کرنے کو تیار نہیں۔ سکھوں نے فوج کی طرف اس قسم کا رویہ اختیار کیوں کیا اور ان کی کیا شکایات ہیں اس کی تحقیقات کرانے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی چونکہ برطانوی حکومت پہلی جنگِ عظیم میں سکھوں کی گراں قدر خدمات کے پیش نظر جنگِ عظیم دوم میں ان کی حمایت سے ہاتھ نہیں دھونا چاہتی تھی تحقیقات کے نتیجے میں سکھوں کی جو شکایات سامنے آئیں انہیں دور کرنے کے لیے اقدامات بھی کیے گئے ساتھ ہی خالصہ ڈیفنس آف انڈیا لیگ کے

نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی جس نے جنگی خدمات کے لیے سکھوں کی بھرتی کا کام شروع کر دیا اس سے قبل فوج میں بھرتی کے لیے سکھوں پر عائد پابندی کا خاتمہ کر دیا گیا۔

اگر چہ سرکاری سطح پر سکھوں کی بھرتی کے لیے بہت جتن کیے گئے۔ صوبے میں عمومی طور پر حکومت پر بداعتمادی کی فضا تھی اس کے علاوہ کانگریس، مسلم لیگ، کیمونسٹ پارٹی اور اکالی پارٹی بھی فوج میں بھرتی کی حامی نہیں تھی اور چونکہ صوبے کے مرکزی اضلاع میں ان سیاسی جماعتوں کا خاصا اثر ورسوخ تھا اس لیے یونینسٹ پارٹی کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھرتی کے معاملے میں بددلی دور نہ ہوئی۔ اس دوران 13 مارچ 1940ء کو لندن کے کیکسٹن ہال میں ایک سکھ طالب علم اودھم سنگھ نے پنجاب کے سابق لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اڈوائر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ 30 جون 1941ء کو اودھم سنگھ کو ایک عدالت نے سزائے موت سنائی اور 31 جولائی کو اسے پھانسی دے دی گئی موت کے تختے پر وہ مسکراتا ہوا آیا اور پھانسی کا پھندا چوم کے اپنے گلے میں ڈالا اس موقع پر بھی اور مقدمے کے دوران بھی اسی سکھ نوجوان نے کہا کہ وہ ایک بہادر کی طرح جان دے رہا ہے اسے خوشی ہے کہ 20 برس قبل اس نے جو عہد کیا تھا اسے اڈوائر کو قتل کر کے پورا کر دیا ہے۔ ان سالوں میں واقعات بہت تیزی سے رونما ہوئے اور پوری دنیا تبدیلی کی لپیٹ میں آ گئی۔ سبھاش چندر بوس جسے اس لیے کانگریس سے دھتکار کر نکال دیا گیا تھا کہ وہ آزادی کی جدوجہد میں عدم تشدد کی بجائے انقلابی اقدامات میں یقین رکھتا ہے ہندوستان سے فرار ہو کر افغانستان کے راستے جرمنی پہنچ گیا اس نے ایک قومی فوج (انڈین نیشنل آرمی) بنائی اور جرمنی کی مدد سے وطن کی آزادی کے لیے سرگرداں ہو گیا۔ جون 1941ء میں ہٹلر کے سوویت یونین پر حملے اور اس برس دسمبر میں جاپان کی جنگ میں شمولیت نے عالمی تصادم کو ایک نیا موڑ عطا کیا۔ ہندوستان میں سوویت یونین پر حملے کے باوجود جنگ کے بارے میں قومی رائے پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا حتیٰ کہ کیمونسٹ پارٹی نے بھی جو برطانوی راج سے آزادی کے لیے ایک قومی تحریک کے حق میں راہ ہموار کر رہی تھی کہا کہ سوویت یونین کی مدد بھی جبھی کی جا سکتی ہے اگر آزادی کی جدوجہد کو تیز کر دیا جائے جس قدر جلد ہندوستان آزاد ہو گا اسی قدر جلد سوویت یونین کو بھی مدد دی جا سکتی ہے۔ لیکن کانگریس کے خیال میں صورتحال اس قدر آسان نہ تھی اس کی قیادت کی سوچ یہ تھی کہ انگلستان کی شکست سے آزادی کی منزل صرف دور ہو سکتی ہے اس لیے وہ اس جنگ کے دوران نیم دروں نیم بیروں کی کیفیت سے دوچار رہی اس دوران کرپس مشن کو ناکامی ہوئی تو کانگریس کا رویہ تبدیل ہو گیا اب قیادت یہ سوچ رہی تھی کہ جنگ کو آئینی تبدیلیوں اور اپنے لیے زیادہ سیاسی سہولتیں حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

جنگ کے باعث ہندوستانی معیشت بدحالی کا شکار ہو گئی اور اشیائے صرف کی قیمتوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کساد بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے باعث اقتصادی صورت حال مزید خراب ہو گئی تھی اس دوران یورپ اور مشرق بعید میں اتحادی فوجوں کو شکست ہوئی اور ملایا اور برما سے پناہ گزینوں کی آمد

سے حالات مزید بگڑ گئے ہندوستان کی اکثر سیاسی قوتوں نے اس موقع پر یہ سوچا کہ آزادی کی جدوجہد تیز کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ہوسکتا چنانچہ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد اس جدوجہد میں تیزی آ گئی اب عمومی سیاسی سوچ یہ تھی کہ جنگ میں برطانیہ کی شکست ہندوستان کی آزادی کی نوید لے کر آئے گی۔ اس دوران چین اور سوویت یونین نے جس مزاحمت کا ثبوت دیا اور جاپان کی فوجوں نے جس طرح پیش قدمی کی اس سے برطانیہ کا ایک بڑی طاقت ہونے کا طلسم ٹوٹ گیا تھا اور اہلِ ہند کو بھی اس سے ایک نیا حوصلہ ملا۔ جواہر لعل نہرو نے یکم جولائی 1942ء کو گورکھپور میں خطاب کرتے ہوئے کہا ''انقلاب ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے اب وقت آ گیا ہے کہ اس پرانی اور بے وقعت حکومت کو ہٹا کر اس کی جگہ حکومت تشکیل دی جائے۔'' ایک اور تقریر میں انہوں نے کہا ''ہمیں برطانوی توپوں اور جاپان سے جنگی طیاروں سے لڑنا ہے آپ کو کیا اہم احتیاطی تدابیر اختیار کرنا ہیں آپ بخوبی جانتے ہیں۔''

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے 8 اگست 1942ء کو بمبئی کے اجلاس میں جو تاریخی قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا ''برطانوی حکمرانی کے تسلسل کے باعث ہندوستان سیاسی طور پر کمزور ہوا ہے اور اسی میں اپنا دفاع کرنے اور ایک آزاد دنیا کے استحکام کی خاطر کام کرنے کی صلاحیتوں میں بتدریج کمی واقع ہوئی ہے ایک آزاد ہندوستان کہیں بہتر طور پر نازی ازم' آمریت اور استعمار کے خلاف جدوجہد اور جمہوریت کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے اس کے لیے صرف وعدوں اور مستقبل کے لیے ضمانتوں کی بنیاد پر وہ مضبوط عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی جو ایک مستحکم اور جمہوری ہندوستان کے لیے ضروری ہے اور نہ ہی اس کے وہ نفسیاتی اثر پیدا ہو سکتا ہے جو عوام کے اعتماد کے لیے ضروری ہے۔ اس منزل کے حصول کے لیے لوگوں میں جو جوش و جذبہ اور آنکھوں میں جو چمک پیدا کرنا لازم ہے وہ صرف آزادی کی روشن شمع ہی پیدا کر سکتی ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اس بات کا عزم کرتی ہے کہ عدم تشدد کی بنیاد پر ایک وسیع عوامی مہم شروع کی جائے تاکہ ہندوستان کی آزادی کی منزل بنیادی حق کی طرح حاصل ہو سکے۔'' کانگریس کے دیگر رہنماؤں کو حراست میں لے لیا۔ گرفتاریوں کے باوجود جدوجہد کی ایک واضح حکمت عملی لوگوں تک پہنچ گئی جس کا بنیادی نکتہ ''آزادی یا موت'' تھا لوگوں سے کہا گیا تھا کہ برطانوی حکومت کے خاتمے کے لیے ریاستی اداروں کو نشانہ بنایا جائے اس سلسلے میں پولیس تھانوں اور تحصیل میں واقع دفاتر کا خصوصی ذکر کیا گیا تھا حکمتِ عملی کا ایک اور پہلو پولیس اور دوسرے ہندوستانی حکام کو اس بات پر قائل کرنا تھا کہ یا تو وہ عوام کی حاکمیت تسلیم کر لیں یا پھر عوامی غیض و غضب کا نشانہ بننے کے لیے تیار ہو جائیں انہیں خبردار کیا گیا تھا کہ عوام کا ساتھ نہ دینے پر انہیں ہتھیاروں اور سرکاری مرتبہ دونوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ ایک طرف عوام کو تلقین کی گئی تھی کہ وہ پر امن رہیں عدم تشدد کو کسی بھی طور ہاتھ سے نہ جانے دیں اور نظم و ضبط کا مثالی مظاہرہ کریں۔ دوسری طرف ہندوستانی پولیس کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پر امن سیاسی اجتماعات پر لاٹھیاں

اورآنسو گیس استعمال نہ کریں اور نہ ان پر گولی چلائیں اور اس بارے میں سرکاری احکامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ کانگریس نے ہر شعبہ زندگی کے لوگوں جن میں مزدور' طلبا' وکلا' عمار' صنعتکار اور ماتحت سرکاری عملہ شامل تھا سے اپیل کی کہ وہ اس تحریک کا ساتھ دیں۔ ان ہدایات کو عوام تک پہنچانے کے لیے کانگریس نے جو خبرنامہ جاری کیا اس میں طلبا سے کالج اور یونیورسٹیاں چھوڑنے اور سرکاری اہلکاروں کو ملازمتوں سے استعفیٰ دینے کی ہدایت بھی کی گئی تھی۔ اس خبرنامہ میں یہ کہا گیا تھا کہ مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد ہر مرد اور عورت ان کا جانشین ہے یہ مہم بے حد کامیاب ہوئی۔ پورے ملک میں جلسے جلوسوں اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا حتیٰ کہ یہ سلسلہ دیہی علاقوں تک پھیل گیا لوگوں نے شہروں' قصبوں اور دیہات میں مورچے لگا لیے اور پولیس تھانوں پر حملہ کیا۔ تار اور ٹیلیفون کا نظام درہم برہم کر دیا ریلوے کی پٹڑیاں اکھاڑ دیں۔ ریلوے اسٹیشن گودام' ڈاکخانوں کو لوٹ لیا گیا اور ہوائی اڈوں اور پلوں کو شدید نقصان پہنچایا اور طلبا نے انتہائی جوش و خروش کا مظاہرہ کیا۔ حکومت کا ردعمل بھی اتنا ہی شدید تھا۔ مظاہرین پر وہ تشدد کیا گیا جس کی ماضی میں کوئی مثال نہ تھی۔ جلوسوں پر لاٹھی چارج اور گولی چلانا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا لوگوں کو معمولی باتوں پر گرفتار کر لیا جاتا اور پولیس تھانوں اور جیلوں میں ان پر تشدد کیا جاتا۔ ان پر کوڑے برسائے جاتے اور انہیں بیڑیاں پہنا کر قید تنہائی میں رکھا جاتا۔ اہم قومی رہنماؤں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ جے پرکاش نارائن' رام منوہر لوہیا' سردل سنگھ' کیشر اور نرنجن سنگھ تالب کو لاہور کے شاہی قلعہ میں قید تنہائی میں رکھ کر تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ حکومت نے اخبارات پر بھی کڑا سنسر شپ عائد کر رکھا تھا۔ حکومت صرف وہی خبریں شائع کرنے کی اجازت دیتی جو اس کے حق میں ہوتی۔ بعض قومی اخبارات نے جب حقیقت پر مبنی خبریں شائع کیں تو ان کو نوٹسوں' تلاشیوں' چھاپوں اور گرفتاریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس دوران ہندوستان بھر میں 96 اخبارات بند ہوئے اور جب پابندیاں ختم ہوئیں تو ان میں سے صرف 26 اخبار اپنی اشاعت بحال کر سکے۔ اس انقلابی تحریک نے جہاں پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لیا۔ وہاں پنجاب بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکا پورے صوبے میں جلسے جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کانگریس کے کارکنوں نے خاص طور پر جنگی سامان تیار کرنے والی صنعتوں کو نشانہ بنایا اور فوج کی نقل و حرکت میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے مواصلات کے نظام کو نقصان پہنچایا پنجاب میں بھی اندھا دھند گرفتاریاں ہوئیں۔ گرفتار شدگان میں گیانی گرمکھ سنگھ مسافر' الیشر سنگھ مجھیل' گوپی چند بھرگھو اور بھیم سین سچر سمیت سینکڑوں لوگ شامل تھے۔ پنجاب میں کانگریس کے لیے صورت حال اس لیے بھی اطمینان بخش تھی کہ کانگریس اکیلی ہی اس تحریک کو آگے بڑھا رہی تھی اور مخالفت میں برطانیہ نواز یونینسٹ پارٹی کی حکومت مسلم لیگ اور ہندو مہا سبھا کے علاوہ کمیونسٹ پارٹی رائکسٹ گروپ اور ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی تھیں اور ان کا نوجوانوں پر اثر و رسوخ بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب میں اس مہم کی عمر زیادہ لمبی نہ تھی لیکن جتنی دیر بھی یہ تحریک رہی اس نے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ برپا کیے رکھا جس کے جواب میں

حکومت نے جبر و تشدد کا بازار اسی طرح گرم کیے رکھا۔

1942 کی تحریک جدوجہد آزادی کا ایک سنہرا باب ہے اس نے عدم تشدد کی لوح پر ایک نئی داستان رقم کی۔ تاہم عدم تشدد کی تلقین کے باوجود اس تحریک میں تشدد کا عنصر آ گیا کیونکہ ہزاروں لاکھوں لوگ ایک طرح کا ظلم و ضبط قبول نہیں کر سکتے اگرچہ گاندھی جی نے ایسا نہیں چاہا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس تحریک سے لاتعلقی کا اظہار نہیں کر سکتے تھے۔ 1942ء کے خاتمے تک پورے ملک میں 60220 افراد گرفتار کیے گئے۔ 18000 لوگوں کو ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نظر بند کیا گیا۔ 940 لوگ مارے گئے اور 1630 زخمی ہوئے۔ ایسے وقت میں جب ملک بھر میں جمہوری تحریک پورے زور و شور سے جاری تھی ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے جدوجہد کو بری طرح متاثر کیا۔ سبھاش چندر بوس نے جو ہندوستان سے فرار ہو کر جرمنی جا پہنچے تھے ہندوستانی فوجیوں کی مدد سے انڈین نیشنل آرمی قائم کی ساتھ ہی لاہور سازش کیس کے ایک کردار رش بہاری بوس نے جو جاپان میں جا بسے تھے وہاں ایسی ہی ایک فوج کا قیام عمل میں لائے اس کے لیے انہیں پہلی اور چودھویں پنجاب رجمنٹ کے افسروں خصوصاً کیپٹن موہن سنگھ نے بہت مدد دی جو سنگاپور سے جاپان پہنچے۔ سبھاش چندر کو جرمنی میں ہندوستان کے جنگی قیدیوں کی خدمات حاصل ہوئیں انہوں نے ان ہندوستان کے سپاہیوں کو ملک کی آزادی اور سچائی کے نام پر ایک اور جنگ کے لیے تیار کیا انڈین نیشنل آرمی جسے آزاد ہند فوج بھی کہا جاتا تھا بے حد مقبول ہوئی اور سینکڑوں لوگ اس میں بھرتی ہو گئے۔ بھگت سنگھ کا بھائی اجیت سنگھ بھی جو لالہ لاجپت رائے کا ایک سیاسی رفیق اور جواہر لال کی نیپلز یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں کا ایک پروفیسر تھا آزاد ہند فوج کی تشکیل میں سبھاش چندر بوس کی مدد کے لیے جرمنی پہنچ گیا۔ یہ آزاد ہند فوج ہی تھی جس نے سب سے پہلے "جے ہند" کا نعرہ بلند کیا یہ نعرہ بوس نے دوستوں کی مدد سے خاص طور پر اس فوج کے لیے مختص کیا لیکن جرمنی میں ہندوستان کے جنگی قیدیوں کی تعداد ابھی زیادہ نہ تھی کہ آزاد ہند فوج کی تشکیل مکمل ہو سکتی۔ ادھر جنوب مشرقی ایشیا میں جاپان کی فوجیں ایک کے بعد دوسرے ملک کو روندتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ تاہم جاپانیوں کو اسی امر کا شدید احساس تھا کہ ہندوستان کی برطانیہ کے چنگل سے آزاد ہوئے بغیر ان کی مشرق بعید میں فتوحات دیرپا نہیں ہوں گی آزاد ہند فوج کے ایک یونٹ کمانڈر زجن سنگھ گل نے اپنی کتاب "فریڈم یونٹ" میں لکھا ہے کہ جاپانی قیادت یہ سمجھتی تھی کہ اس کی مشرقی ایشیا کی جنگ میں کامیابی کی بنیاد ایک آزاد ہندوستان پر استوار ہو سکتی ہے اور اس کے لیے وہ ہر ممکن مدد دینے کو تیار تھی اس مقصد کے حصول کے لیے جو حکمتِ عملی تیار کی گئی اس کے تحت ہندوستانی فوجیوں کو جاپان کی فوج سے الگ کر دیا گیا۔ ہندوستانی فوج کیپٹن موہن سنگھ کی تحویل میں تھی موہن سنگھ نے رش بہاری بوس سے رابطہ قائم کیا تاکہ اس کی فوج کو آزاد ہند فوج میں شامل کیا جا سکے اپریل 1942ء میں ٹوکیو میں ان سب کا ایک اجلاس ہوا جس میں کیپٹن موہن سنگھ، کیپٹن محمد اکرم، کرنل زجن سنگھ اور رش بہاری بوس نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں جو حکمت عملی طے کی گئی اس کے تحت

بوس نے ملایا' تھائی لینڈ' ہانگ کانگ' انڈونیشیا اور منچوریا کا دورہ کیا اور وہاں موجود ہندوستانی فوجیوں اور دوسرے رضا کاروں سے انڈین نیشنل آرمی میں شرکت کی اپیل کی آخر میں جون جولائی 1942ء میں ان سب ملکوں سے چیدہ چیدہ فوجی افسروں اور جاپان میں اس کام کا آغاز کرنے والوں کا ایک وسیع تر اجلاس بنکاک میں ہوا جس میں باضابطہ طور پر انڈین نیشنل آرمی کی تشکیل کی گئی کیپٹن موہن سنگھ کو جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر اس کا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا جبکہ رش بہاری بوس اس کے سیاسی سربراہ تھے۔ بوس نے بعد ازاں ریڈیو بنکاک سے متعدد تقاریر کر کے آئی این اے کی تشکیل اور مقاصد کا اعلان کیا۔ 16 اگست 1942ء کو ایک تقریر میں انہوں نے کہا کہ آئی این اے کا اولین اور آخری مقصد ہندوستان کی آزادی ہے جس کے لیے برطانیہ کو وطن سے نکال باہر کرنا ہوگا" آپ کو ان (برطانیہ) سے ہندوستان کے شہدا کا بدلہ لینا۔ آپ اپنی تلواریں سونت لو اپنی بندوقیں سیدھی کر لو اینگلو امریکن دشمن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے وطن کو اس مشترکہ دشمن سے آزاد کرا لو ان کو ہندوستان سے باہر دھکیل دو۔" اس سے اگلے ماہ سنگاپور میں ایک جلسہ میں اندازاً 45000 جنگی قیدیوں نے شرکت کی ان میں سے 20 ہزار لوگوں نے انڈین نیشنل آرمی میں شمولیت کا اعلان کیا ان میں سے اکثریت کا تعلق پنجاب سے تھا۔ توجہ طلب بات یہ ہے کہ ایسے افراد جو تنخواہ اور دیگر مراعات کے برطانوی فوج میں بھرتی ہوئے۔ اس قدر کم عرصے میں وطن کی محبت سے سرشار ہو کر آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے ان میں اکثر بہت کم پڑھے لکھے تھے اور انہیں حب الوطنی جیسے عظیم جذبے کا مکمل ادراک بھی نہیں تھا اس کے باوجود ان کی قلبی ماہیت کی تبدیلی اثر انگیز تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں بہت سے ایسے فوجی بھی تھے جن کو آزاد ہند فوج میں بھرتی کے باعث جاپان کی قید سے نجات مل رہی تھی اور شائد یہی ایک وجہ تھی کہ آئی این اے کو اتنے کم عرصے میں بڑی مقبولیت ملی۔ اس فوج نے انگریزی الفاظ کی جگہ ہندو الفاظ رائج کیے اور افسروں اور جوانوں کے لیے کھانا ایک ہی جگہ پکنے لگا۔ افسر عام سپاہیوں کے ساتھ مل کر کھاتے اور جلد ہی ان کے درمیان افسر اور ماتحت کا امتیاز ختم ہونے لگا یہی وجہ تھی کہ ان سپاہیوں میں وطن کی آزادی کے لیے جدوجہد کی لگن اب مزید بڑھ گئی تھی۔ نرنجن سنگھ لکھتا ہے کہ چند ماہ میں ایک ایسی فوج یلغار کے لیے تیار تھی جس میں ہر سطح پر مکمل نظم وضبط تھا اور جو وطن کی محبت سے سرشار تھی۔ اس تیاری کے بعد 20 ہزار گوریلا فوجیوں پر مشتمل ایک بٹالین تیار کی گئی جو آسام اور بنگال کے جنگلوں میں فوجی کارروائی کے لیے تیار تھے۔ فوج کے قائدین کو یقین تھا کہ براہ راست تصادم کی صورت میں وہ برطانوی فوج کو شکست دے سکتے ہیں۔ لیکن ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ برطانوی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر کے انڈین نیشنل آرمی میں شمولیت کی ترغیب دیں۔ رش بہاری بوس میں سنگاپور' کوالالمپور اور پنانگ میں بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کیا جس کے بعد انڈین انڈی پینڈنس لیگ کی رکنیت اور چندوں کی صورت میں مالی وسائل بہت بڑھے۔ ان ممالک میں رہنے والے ہندوستانی لوگوں میں ایک نیا جوش وخروش پیدا ہو گیا

تا اور پہلی مرتبہ یہ بات سامنے آئی کہ بیرون ہندوستان سے بھی انقلاب کے لیے جذبہ پیدا کیا جاسکتا ہے تاہم ہندوستانی لوگ اس بات سے خوش نہیں تھے کہ لیگ اور آزاد ہند فوج جاپانیوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنی رہے اور ان کے جنگی مفادات کو آگے بڑھائے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ بیرون ملک سے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا جائے اور ہندوستانی سپاہیوں کو جاپانی یونیفارم پہننے پر مجبور نہ کیا جائے۔ لیکن ان کے اس مطالبے کو نظرانداز کردیا گیا۔ جنرل موہن سنگھ اور نرنجن سنگھ نے بھی ان مطالبات کا ساتھ دیا جس پر ان دونوں کو جاپان کی خفیہ پولیس نے دسمبر 1942ء میں گرفتار کرلیا۔ رش بہاری بوس عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے اب اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ صورت حال پر قابو پاسکے۔ جنرل موہن سنگھ کی گرفتاری کے بعد انڈین نیشنل آرمی تقریباً ختم ہو کر رہ گئی۔ چنانچہ جب ہندوستانی فوج اپنے ملک کے لیے جنگ چھیڑنے کو تیار تھے تو انہیں اس لیے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کہ انہوں نے کٹھ پتلی بننے سے انکار کردیا تھا۔ جاپانیوں نے اس کے لیے انہیں معاف نہیں کیا اور انہیں ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا۔ جاپانیوں نے نرنجن سنگھ اور موہن سنگھ کو قید میں ڈال دیا اور انہیں خوفناک اذیتیں دیں۔ لیکن انہوں نے جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا اس پر جاپانیوں نے ان کے ساتھ مذاکرات کیے اور دونوں نے چند مطالبات پیش کیے ان میں سے ایک مطالبہ یہ تھا کہ سبھاش چندر بوس کو بلا کر انہیں جنوب مشرقی ایشیا میں انڈین نیشنل آرمی از سر نو منظم کرنے کی دعوت دی جائے۔ یہ مطالبہ تسلیم کرلیا گیا اور سبھاش چندر بوس نے 6 جولائی 1943ء کو آئی این اے کی کمان سنبھالی۔ انہوں نے اس کا نام انڈیا آرمی آف لبریشن رکھا اور خود اس کے "نیتا" (رہنما) بن گئے۔ اسی کے بعد سبھاش کو بعدازاں نیتاجی کے خطاب سے پکارا جانے لگا۔ ان کی قیادت میں آزاد ہند فوج کو ایک نیا حوصلہ، جذبہ اور مشن نصیب ہوا "دہلی کی طرف" اور "لال قلعہ کو" اس فوج کے نعرے تھے اور ان میں روز بروز تیزی آرہی تھی۔ اس دوران بڑی تعداد میں عورتیں بھی اس فوج میں شامل ہوگئیں سینکڑوں کی تعداد میں یہ تعلیم یافتہ عورتیں ملایا، سیام اور برما سے آئی تھیں اور ان پر مشتمل "رانی جھانسی رجمنٹ" قائم کردی گئی جس کی سربراہ ڈی ایس لکشمی تھی۔ کوالالمپور ریڈیو سے ایک تقریر میں سبھاش چندر بوس نے کہا "آپ کبھی یہ بات نہ بھولیں کہ سب سے بڑی لعنت غلامی کی زندگی ہے۔ آپ یہ بات کبھی نہ بھولیں کہ ظلم و زیادتی سے مفاہمت کرلینا سب سے بڑا انسانی جرم ہے۔ یاد رہے کہ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ یاد رہے کہ ظلم و زیادتی کے خلاف برسرپیکار ہونا انسانیت کی معراج ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ کہ اس فانی دنیا میں ہر شے ختم ہونے کے لیے بنی ہے انسان بھی اسی طرح کا فانی ہے ہر ایک کو مر جانا ہے لیکن اصول، امید اور خواب کبھی نہیں مرتے، اگر کوئی شخص اس قسم کا خواب دیکھتے ہوئے مر جائے تو اس کی موت ہزار زندگیوں پر بھاری ہے کیونکہ اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ قربانی بھی اسی قسم کا ایک جذبہ ہے اور حق کی راہ میں جس نے بھی قربانی دی اور جان سے ہاتھ دھوئے وہ کبھی نہیں مرتا" یہ وہ الفاظ تھے جس نے نہ صرف بیرون ملک بلکہ ہندوستان کی جلاوطن عبوری حکومت کا اعلان کیا اور خود کو اس کا سربراہ مملکت،

وزیراعظم، وزیر جنگ اور وزیر خارجہ مقرر کیا ان کے علاوہ مسز لکشمی، ایس اے آئر، گلزار سنگھ، احسان قادر، شاہنواز کو کابینہ کے وزیر مقرر کیا گیا۔ کانگریس کے جھنڈے کو قومی پرچم بنا کر لہرا دیا گیا اس کے علاوہ گاندھی جی کی ٹوپی اور ان کی پوشاک کو قومی لباس کا درجہ دیا گیا۔ جاپان، جرمنی، ملایا، چین، تھائی لینڈ اور منچوریا نے اس حکومت کو 23 اکتوبر کو اور اس کے لگ بھگ تسلیم کر لیا۔ نیتا جی کی ولولہ انگیز قیادت نے سیاسی اور فوجی سطح پر جو اقدامات کئے ان کو ہندوستان بھر میں کھلے دل سے تسلیم کر لیا گیا۔ ہندوستان سے مزدور، قلی، حجام، باورچی، بس ٹرک، ڈرائیور، ہنرمند، صنعتی کارکن اور دھوبی وغیرہ ہزاروں کی تعداد میں ملایا پہنچے اور نئی حکومت کی ملازمت اختیار کر لی۔ ایک اندازے کے مطابق آزاد ہند فوج کی تعداد 1943ء کے آخر تک 80 ہزار سے تجاوز کر چکی تھی۔ ان میں اکثریت ان سابق فوجیوں کی تھی جو ہانگ کانگ، برما، جاوا، انڈونیشیا اور ملایا میں مقیم تھے۔ یہ فوج کا تقریباً 70 فیصد تھے جبکہ باقی لوگ نئے رضا کار تھے اور انہیں خصوصی فوجی تربیت دی گئی تھی۔ اس دوران آزاد ہند فوج نے ہندوستان کی برطانوی حکومت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور جاپانی فوجوں کے ہمراہ ہندوستان کی طرف پیش قدمی کرنے لگے۔ یہ فوجیں ایک کے بعد دوسرا علاقہ فتح کرتی جا رہی تھیں اور ان کی فتوحات نے ہندوستان کے لوگوں کو ایک نیا ولولہ اور آزادی کی امید کی ایک نئی کرن روشن کر دی۔ ان فتوحات کے بعد سبھاش چندر بوس نے ملایا سے اپنی حکومت برما منتقل کر دی اور رنگون کو دارالحکومت کے طور پر ہیڈ کوارٹرز مقرر کیا۔ نیتا جی کی فوجوں نے 29 دسمبر 1943ء کو انڈیمان اور نکوبار کے جزائر کو فتح کر لیا اور وہاں اگلے روز آزاد ہند حکومت کا پرچم لہرا دیا۔ برطانوی حکومت کے قیام کے بعد اس قسم کا واقعہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ انڈیمان کا نام شہدائے ہند کے نام پر شہید رکھا اور نکوبار کا نام سوراج رکھا اس کے بعد چار ماہ تک آزاد ہند فوج نے برما اور ہندوستان کے درمیان اراکان کے پہاڑوں میں اپنی مہم جاری رکھی اور اپریل 1944ء تک ہندوستان کی سرحد تک آ پہنچے۔ 4 اپریل کو اس حکومت کی طرف سے ہندوستانی عوام کے نام اپیل جاری کی گئی کہ وہ آزاد ہند حکومت کا ساتھ دیں کہ اس کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ وہ ہندوستان پر قابض انگریز حکومت کا خاتمہ کر کے مستقل بنیادوں پر ایک قومی حکومت قائم کرے جو عوام کی تمناؤں کا مرکز ہو۔ لیکن بدقسمتی سے اس دوران مون سون بارشوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور آزاد ہند فوج کی پیش قدمی رک گئی۔ اب انگریز فوج کو نہ صرف پاؤں جمانے کا موقع مل گیا تھا بلکہ اس نے نیتا جی کی فوجوں پر یلغار بھی شروع کر دی۔ آزاد ہند فوج بنگال کی سرحد پر امپھال کے مقام پر بری طرح انگریز فوج کے نرغے میں آ گئی۔ جاپانی حکومت نے اس خبر کو دبانے کی بہت کوشش کی لیکن ناکام رہی کیونکہ امپھال کی جنگ سے بھاگ کر برما پہنچنے والے سپاہیوں نے حقیقت حال بیان کر دی کہ کس طرح آزاد ہند فوج کو اس مقام پر بری طرح شکست ہوئی۔ ایک چینی چم کی لون نے ان الفاظ میں امپھال کا نقشہ کھینچا "آئی این اے اور جاپانی فوجی بری طرح گھر گئے تھے ان پر سینکڑوں بار چھپ کر حملہ کیا گیا۔ جنگل کو آگ لگا دی گئی۔ جس سے سینکڑوں

فوجی جل کر مر گئے۔ ان پر دوسری جانب سے جدید توپوں اور مشین گنوں کی مدد سے آگ برستی رہی۔"
آزاد ہند فوج کے جوان بے جگری سے لڑے لیکن ان کے پاس اسلحہ کم تھا اور دیگر فوجی وسائل کی بھی کمی تھی۔ برطانوی فوج بہتر اسلحہ سے لیس تھی اور اس نے بڑی کامیابی کے ساتھ امپھال کے مقام پر جاپانیوں اور ہندوستانیوں کی اس فوج کا صفایا کر دیا۔ ان میں جو زندہ بچنے میں کامیاب ہو گئے انہیں بھوک اور پیاس کا سامنا تھا۔ ان میں سے اکثر راستہ بھول کر دشواریوں میں پڑ گئے اور کئی ایسے بھی تھے جنہوں نے خود کو برطانوی فوج کے حوالے کر دیا۔ مئی 1944ء کے وسط تک ہندوستان کو آزاد کرنے کی یہ بہادرانہ جدوجہد المناک انجام تک پہنچ چکی تھی۔

اس افسوسناک شکست کی کیا وجوہات تھیں ان کا اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آزاد ہند فوج نے کھوکھلی مہم جوئی کا مظاہرہ کیا اس کے جوان جدید اسلحہ سے محروم تھے۔ ان کے جسموں پر یونیفارم بھی نہ ہونے کے برابر تھی نوے فیصد جوانوں نے پھٹی ہوئی یونیفارم پہن رکھی تھی ان کے بوٹ اور پیٹیاں پرانی تھیں اور کئی کے سروں پر فوجی کیپ کی بجائے ٹوپیاں تھیں یہ گاندھی جی کی کھدر کی ٹوپیاں تھیں۔ ان کے مقابلے میں برطانوی فوج معیاری اسلحہ سے لیس تھی اور کہیں زیادہ منظم تھی۔ چم کی اون ہی کے بقول آزاد ہند فوج کے پاس خوراک کی بھی کمی تھی اور وہ اس نظم و ضبط سے بھی عاری تھی جو ایک مکمل جنگ کے لیے ضروری ہوتا ہے شکست کے بعد آزاد ہند فوج کے افسروں اور جوانوں کو قیدی بنا کر دلی کے لال قلعہ میں لایا گیا اس کے بعد ان قیدیوں پر اسی قلعے میں مقدمہ چلا۔ مقدمے کی تفصیلات عوام تک پہنچیں تو ان میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہوا۔ چوٹی کے وکیل جو سیاستدان بھی تھے آزاد ہند فوج کے قیدیوں کی طرف سے مقدمہ میں وکیل کے طور پر پیش ہوئے ان میں جواہر لعل نہرو، بھولا بھائی دیسائی، مسز سروجنی نائیڈو اور محمد علی جناح بھی شامل تھے۔ پنجاب کے عوام نظریات اور فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر ایک قوم کی طرح ان کے دفاع میں ایک ہو گئے انہوں نے تین فرقوں کے رہنماؤں کی پیروی کا فیصلہ کیا۔ اتفاق سے یہ بھی پنجاب سے تعلق رکھتے تھے پنجاب نے جن لوگوں کا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا ان میں پریم سہگل، گربخش ڈھلوں اور شاہنواز شامل تھے تاہم ان تینوں کو بہت سے دوسرے قیدیوں کے ساتھ طویل العمر قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ پنجاب میں ان کی رہائی کے لیے ایک دستخطی مہم چلی اور ہزاروں افراد نے ان کے معافی نامے پر دستخط کیے۔ یہ درخواست کمانڈر ان چیف سر کلاڈ اوکن لک کو بھیجی گئی ساتھ ہی ان تینوں کے حق میں سیاسی تحریک بھی شروع ہو گئی۔ چنانچہ کمانڈر ان چیف نے دباؤ میں آ کر ان تینوں کو 3 جنوری 1946ء کو رہا کر دیا۔ رہائی کے بعد ان کا جنگی ہیروؤں کی طرح استقبال کیا گیا۔ پنجاب کے لوگوں نے شکست کے باوجود آزاد ہند فوج کی بہادری اور جذبہ حب الوطنی کی بے حد تعریف کی۔ حتیٰ کہ کمانڈر ان چیف نے 26 نومبر 1945ء کو لکھا "مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ آزاد ہند فوج کے جوانوں کی اکثریت سبھاش چندر بوس کے جذبے کی سچائی پر یقین رکھتے تھے اور وہ خود بھی اس کی قیادت میں

لڑنے کو راہ حق سمجھتے تھے ہم نے بھی جو شہادتیں اکٹھا کی ہیں ان کی روشنی میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ سبھاش چندر بوس نے اپنی شخصیت اور اصول پرستی کی بناء پر اپنی فوج میں بے حد قابل تعظیم جگہ حاصل کی ہوئی تھی۔ آزاد ہند فوج ہر لحاظ سے قابلِ تعظیم ہے اور ہندوستان کو خلوص دل کے ساتھ ان کی وہ قربانیاں یاد رکھنا چاہیے جو انہوں نے اپنے وطن کو آزادی کے لیے پیش کیں جن کی وجہ سے انہوں نے ہندوستان کے عوام میں جرأت اور بہادری کے جذبات پیدا کر دیئے تھے" آزاد ہند فوج کے بہادری اور جذبے نے جو فضا پیدا کی اسی سے متاثر ہو کر برطانوی بحریہ نے بھی بمبئی میں بغاوت کا علم بلند کیا اور جواب میں فوج کی فائرنگ سے بعض باغی ہلاک ہوئے۔ ان واقعات کے بعد حکومت پر بھی واضح ہو گیا کہ وہ فوج پر زیادہ بھروسہ نہیں کر سکتی حالانکہ یہی فوج ان کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی تھی۔ بعد ازاں ملیشیا کے تین یونٹوں نے بھی برطانوی فوج کی خدمات سرانجام دینے میں اس لیے معذوری کا اظہار کیا کہ اس سے ان کے قومی جذبات مجروح ہوں گے تو اس سے برطانوی حکمرانوں کو یہ بات سمجھ آ گئی کہ ہندوستان میں ان کے قیام کے دن اب گنے جا چکے ہیں۔

آزاد ہند فوج کی تحریک اگرچہ بہت مختصر مدت کے لیے جاری رہی لیکن یہ جدوجہد آزادی کے ایک سنہری باب کے طور پر ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ اس تاریخی واقع کو پنجاب کی جدوجہد سے بھی جوڑا جا سکتا ہے کیونکہ اس فوج کے 70 فیصد کے لگ بھگ لوگ پنجاب سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے اکثر غیر ممالک میں بسنے والے سابق فوجی تھے۔ غدر پارٹی کی تحریک کی طرح آزاد ہند فوج نے بھی جذبہ حب الوطنی کی اعلیٰ روایات قائم کیں اگرچہ دونوں تحریکوں کو مدد بیرونی ممالک نے کی دونوں ہی اپنے فیصلے کرنے میں آزاد تھیں۔ آزاد ہند فوج کا تذکرہ ادھورا رہ جاتا ہے اگر جنرل موہن سنگھ کا ذکر نہ کیا جائے۔ جنرل موہن سنگھ اس تحریک کے ہراول دستے میں شامل تھا جس نے جاپان کی قید میں جبر و تشدد سہنے کے باوجود اصولوں پر سمجھوتا نہیں کیا اور جاپان کی بالادستی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سبھاش چندر بوس اس تحریک کا قائد تھا لیکن موہن سنگھ اور نرنجن سنگھ اس کے روح رواں تھے۔ اس لحاظ سے اس تحریک میں بھی پنجاب نے آزادی ہند کے لیے جو بے مثال قربانیاں دیں انہیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

+

باب:8

پنجاب کی تقسیم

اس سے قبل جس پنجاب کا ذکر کیا گیا ہے وہ انتہا پسند' انقلابی اور سیاسی تحریکوں کا مرکز رہا اور ہندوستان کی آزادی کی منزل پانے میں اس صوبے کے عوام نے بے حد اہم کردار ادا کیا۔ ہندو مسلم اور سکھ کسی کا کردار ایک دوسرے سے کم نہیں انہوں نے فرقہ واریت سے بلند ہو کر صرف مادر وطن کی آزادی کا سوچا اور اس پر جانیں قربان کیں لیکن ہندوستان کے شمال مغرب میں واقع ہونے پر اپنی زرخیز زمینوں اور محنتی کسانوں کی بدولت ملک کا اناج گھر کہلانے اور دوسرے صوبوں کی نسبت بہتر معاشی حالت رکھنے کے باعث پنجاب کی اپنی ایک اہمیت تھی اور یہی اس کی تقسیم کی وجہ بنی۔ اس کے علاوہ آیا یہ محض اتفاق تھا کہ صوبے کے مغربی حصے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ ہندو اور سکھ زیادہ تر مشرقی حصے میں آباد تھے اور مرکزی علاقوں کی آبادی کا تناسب تقریباً یکساں تھا اس کی آبادی کی مرکزیت بھی تقسیم کے لیے اہم جواز بنی جس کی باتیں 1930ء میں ڈاکٹر محمد اقبال کی ایک تقریر کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھیں اور جس میں انہوں نے مسلمانوں کے ایک الگ قوم ہونے کی بات کی تھی۔ پنجاب کے اس عظیم شاعر نے پہلی مرتبہ اس قسم کی بات کی تھی اور بعد میں مسلم قوم اسی کو لے کر آگے بڑھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جوالہ آباد میں منعقد ہوا اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا "چونکہ اب تک وہ تمام کوششیں جو اندرونی طور پر فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے کی گئی ہیں ناکام رہیں اس لیے اب بہتر یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو ان کے اپنے وطن میں آزادی سے رہنے کا حق تسلیم کر لیا جائے...... ان حالات میں مجھے شمال مغربی ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے حوالے سے یہی حل زیادہ قابل قبول لگتا ہے کہ اسے ایک الگ مسلمان

ریاست کا درجہ دے دیا جائے جس میں پنجاب' شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان شامل ہوں۔ اقبال مسلمانوں کے اس ملک میں انبالہ ڈویژن کو بھی شامل کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی۔ اگرچہ اس عظیم شاعر نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ وہ یہ تجویز پیش کر کے دوسرے مذہبی فرقوں کی دل آزاری نہیں چاہتے لیکن ان کا کہنا یہ بھی تھا کہ ہندو مسلم تنازعہ کا یہی ایک قابل عمل حل ہے۔ اقبال کی اس تجویز سے پورے ہندوستان کے سیاسی حلقوں میں ایک بھونچال سا آ گیا اور پنجاب خاص طور پر ہل کر رہ گیا۔ سکھوں نے اس تجویز پر کڑی نکتہ چینی کی کیونکہ اس سے انہیں سکھوں کی آبادی تقسیم ہوتی نظر آتی تھی۔ سکھوں کی طرف سے سر اجل سنگھ نے دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر 1931 میں جو یادداشت پیش کی تھی اس میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر مسلمانوں نے جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر اپنی اکثریت قائم کرنے کی کوشش کی تو سکھ بھی ایسے علاقائی انتظام کا مطالبہ کریں گے جو ان کی آبادی کی بنیاد کو مستحکم کر دے۔ اس یادداشت میں سکھوں کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ مسلم اکثریت والی ملتان اور راولپنڈی ڈویژن کو لائل پور اور منٹگمری کے اضلاع نکال کر شمال مغربی سرحدی صوبے میں شامل کر دیا جائے اس طرح پنجاب میں کسی فرقے کو قطعی اکثریت حاصل نہیں رہے گی اور سب فرقے ایک دوسرے کے ساتھ مفاہمت کی بنیاد پر انتظامی امور طے کر لیں گے۔ چونکہ اس قسم کی کوئی تجویز مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں تھی۔ سر جفری کوربٹ نے پنجاب کی از سر نو حد بندی کی تجویز پیش کر دی۔ اس سکیم کے تحت انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے الگ کرنا اور غیر مسلم اکثریت والے اضلاع کو یکجا کرنا تھا۔ یہ تجویز صوبے کے سکھوں اور ہندوؤں کے لیے قابل قبول نہ تھی کیونکہ اس طرح وہ صوبے میں اقلیت بن کر رہ جاتے۔ ان تمام تجویزوں کے جواب میں سر اجل سنگھ کے سکھوں کے لیے ان آبادی سے زیادہ نمائندگی کا منصوبہ پیش کر دیا۔ اس کا جواز انہوں نے ان ہندو اکثریت کے صوبوں کی مثال سے دیا جہاں مسلمانوں کو بھی رعایت حاصل تھی جیسا کہ بہار اور اوڑیسہ میں تھا۔ ان دونوں صوبوں میں مسلمان بالترتیب گیارہ اور چودہ فیصد تھے لیکن صوبائی اسمبلیوں میں انہیں 25 اور 30 فیصد نمائندگی حاصل تھی اسی طرح پنجاب کی اینگلو انڈین اور یورپین اقلیتوں کو ان کی آبادی سے 3000 اور 9000 فی صد نمائندگی حاصل تھی۔ ان اقدامات سے ان اقلیتوں کو ایک خاص آبادی کا درجہ ملا ہوا تھا۔ اس اثناء میں ماسٹر تارا سنگھ نے مطالبہ کیا کہ اگر سکھوں کے علاقائی انتظام کا مطالبہ تسلیم نہیں کیا جاتا تو ان کے مفادات کے تحفظ کی یقین دہانی کرائی جائے۔ اس حوالے سے برطانوی حکومت پر الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے ایس بی شودیو سنگھ کی معرفت سکھ رہنماؤں کے ساتھ اس لیے خفیہ رابطہ قائم کیا تھا کہ وہ کانگریس کے ساتھ اپنے تعلقات ختم کر دے۔ اس

کے جواب میں برطانوی حکومت انھیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بعد تیسری بڑی آبادی کا درجہ دے دے گی اور اسی طرح ان کے سیاسی ودیگر مفادات کا تحفظ بھی ہو جائے گا لیکن سکھوں نے یہ پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسی دوران ماسٹر تارا سنگھ کی آزاد پنجاب کی سکیم بھی منظر عام پر آ گئی۔ ہندوؤں نے ایک علیحدہ مسلمان ریاست کی تجویز کے مقابلے میں ماسٹر تارا سنگھ کی اس تجویز کی حمایت کر دی۔ کرپس مشن منصوبے کے تحت مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کی یقین دہانی کرائی گئی تھی اسی منصوبے میں سکھوں کی ایک الگ ریاست کا مطالبہ ماننے کا بھی عندیہ ملتا تھا۔ 1943ء میں جب مسلمانوں کے لیے الگ ریاست کے معاملے پر پورے ہندوستان میں بحث جاری تھی آزاد پنجاب کی سکیم پھر منظر عام پر آ گئی۔ ایک مضمون میں ماسٹر تارا سنگھ نے یہ سکیم پیش کی اور اس کا جواز یہ دیا کہ سکھوں کو مسلمانوں کی فرقہ وارانہ حاکمیت سے محفوظ رکھنے کا بھی ایک قابل عمل حل ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اپنی سکیم کی یوں وضاحت کی کہ ہندو اور مسلمان اگر کسی صوبے میں اقلیت میں ہوں تو وہاں صوبوں سے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے مدد مانگ سکتے ہیں۔ جہاں ان کی اکثریت ہے۔ لیکن سکھوں کو یہ سہولت حاصل نہیں کیونکہ وہ صرف پنجاب میں ہی بستے ہیں۔ اس لیے بھی ایک آزاد پنجاب ضروری ہے تا کہ سکھوں کو اپنے سیاسی اور اقتصادی حقوق حاصل کرنے کا موقع مل سکے۔ بعد ازاں اکالی پارٹی نے سپرو کمیٹی کو 1945ء میں جو یادداشت پیش کی اس میں بھی الگ سکھ ریاست کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اکالی پارٹی نے کہا کہ ایسی ریاست میں سکھوں کی ایک ایسی واضح اکثریت اور مذہبی مقامات ہونے چاہئیں۔ خواہ اس کے لیے اپنی کچھ آبادی اور علاقہ ہی کیوں نا دینا پڑے۔ اکالی پارٹی نے بھی یہ مطالبہ پاکستان کے جواب میں پیش کیا تھا اور واضح طور پر ایک مضبوط مرکز کی حمایت کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ملک کی تقسیم نہیں چاہتی۔ اس مطالبے کی کٹر ہندو تنظیم مہا سبھا نے بھی حمایت کی۔ ہندوؤں نے تو اس منصوبے کو اس لیے قبول کر لیا کہ وہ پنجاب میں جہاں وہ اقلیت میں تھے انھیں مسلم اکثریت کے ہاتھوں اپنے مذہبی' ثقافتی اور معاشی حقوق کے بارے میں خدشات تھے۔ ہندو اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے اور تمام فرقوں میں سب سے زیادہ امیر تھے اس کے باوجود وہ ہمیشہ یہ توقع رکھتے تھے کہ انھیں ہر صوبے میں ایک خاص سماجی درجہ دیا جائے جس سے انھیں دوسرے فرقوں پر فوقیت حاصل ہو۔ اس سوچ کی ایک خاص وجہ تھی کہ ہندو پنجاب کی سب سے چھوٹی اقلیت تھے اور اسی وجہ سے انہوں نے سر جگندر سنگھ' سر گوکل چند نارنگ' سر سکندر حیات خان اور نواب احمد یار خان دولتانہ کے مابین اس معاہدے کو بھی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کا مقصد پنجاب میں مخلوط انتخاب کا طریقہ رائج کرنا تھا۔ ہندوؤں کو یقین نہیں تھا کہ اس معاہدے کے باوجود بھی وہ اپنی آبادی کی

نمائندگی کر پائیں گے۔ (اس معاہدے کی منظوری یونینسٹ پارٹی کے سربراہ سر فضل حسین نے اس وقت دی جب انہیں یقین ہو گیا کہ مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے نشستیں حاصل کر پائیں گے۔) اس معاہدے کی مخالفت نے یہ بات ثابت کردی کہ جداگانہ انتخاب صرف مسلمانوں کے ذہن کی اختراع نہیں تھی بلکہ اقلیتوں کا عدم تحفظ کا احساس تھا خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے تھا۔ فضل حسین کی سوانح عمری میں عظیم حسین لکھتے ہیں۔ اس صورتحال سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ پنجاب میں ہندو اس لیے مخلوط انتخاب پر زور دے رہے تھے کیونکہ مسلمانوں کی رائے دہندگی کا تناسب عموماً بہت کم ہوتا تھا اور اس طرح انہیں موقع مل جاتا کہ وہ صوبے پر حکومت کر سکتے۔ مسلم لیگ نے انتظامی اور تعلیمی اداروں اور معاشی شعبہ میں آبادی کے تناسب سے قومی اور صوبائی سطح پر جس نمائندگی کا مطالبہ کیا تھا اس سے پنجاب میں فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوا اور دوسرے فرقوں نے بھی اس محاذ آرائی کو وسیع تر کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ چونکہ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد آریا سماج اور ہندو مہاسبھا جیسی انتہا پسند تنظیموں میں شامل تھی سکھوں نے اکالی پارٹی کے ساتھ سیاسی روابط استوار کر رکھے تھے اور مسلمان زیادہ تر یونینسٹ پارٹی سے منسلک تھے۔ سیاسی سطح پر ہندو انڈین نیشنل کانگریس کے حامی تھے اور اکالی پارٹی بھی تقسیم ہند تک کانگریس کے ساتھ رہی۔ 1935ء کے ایکٹ کے تحت مسلمانوں کی آبادی کو مستحکم کرنے کے لیے متعدد اقدامات کئے گئے۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے ایک صوبے کا درجہ دیا گیا اور شمال مغربی سرحدی صوبے کو بھی مکمل صوبائی درجہ مل گیا۔ 1937ء کے انتخابات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کو ہندوستانی مسلمانوں کی چنداں حمایت حاصل نہیں تھی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے اثر و رسوخ کی وجہ سے مسلم لیگ سیاسی طور پر مستحکم نہ ہو سکی۔ اس وقت تک صوبے میں مسلم لیگ کی اپنی کوئی الگ تنظیم نہیں تھی اور وزیر اعظم سر سکندر حیات خان نے مسلمانوں کو یہ رعایت دے رکھی تھی کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے اندر رہتے ہوئے مسلم لیگ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اس مرحلے پر محمد علی جناح نے محسوس کیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی ایک خود مختار تنظیم قائم کی جائے اور لیجسلیٹو اسمبلی کے ارکان اس کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کریں۔ جناح کو پوری طرح احساس تھا کہ پنجاب ہر صورت پاکستان کی سکیم میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے لیکن جب جناح نے لیگ کے قیام کا مصمم ارادہ کر لیا تو یونینسٹ پارٹی اس کی راہ میں دیوار بن گئی۔ جب 1940ء میں قرارداد لاہور منظور ہوئی تو مسلم لیگ نے پنجاب میں سیاسی سرگرمیاں تیز تر کر دیں جس کے بعد پنجاب سیاسی رسہ کشی اور فرقہ وارانہ سیاست کا گڑھ بن گیا۔ 1940ء اور 1946ء کا درمیانی عرصہ نمائندگی کے لیے مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان شدید تنازع کا دور رہا جس میں مسلم لیگ آہستہ آہستہ اپنی

جڑیں مضبوط کرتی رہی۔ 1946 کے عام انتخابات میں ایک واضح تبدیلی نظر آئی۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے مخصوص 86 میں سے 79 نشستیں حاصل کرلیں۔ کانگریس نے 51 اور اکالی پارٹی نے 22 نشستیں جیتیں جبکہ یونینسٹ پارٹی اور آزاد امیدوار 10 '10 نشستوں پر کامیاب ہوئے چنانچہ مسلم لیگ پنجاب کی واحد اکثریتی پارٹی بن کر ابھری۔ یونینسٹ پارٹی کو بری طرح شکست ہوئی لیکن چونکہ وہ تقسیم کے حق میں نہیں تھی اس کے سیاسی کردار کو اب بھی اہمیت دی گئی۔ ہڈسن نے ہندوستان کی تقسیم میں ماؤنٹ بیٹن کے کردار پر ایک مقالہ میں لکھا کہ اگر پنجاب اسمبلی کی وساطت سے یہ رائے دیتا کہ اسے تقسیم قبول نہیں تو پاکستان کا قیام تقریباً ناممکن تھا۔ اس دوران پنجاب میں وزارت کی تشکیل کے لیے رسہ کشی شروع ہوگئی۔ کانگریس اور اقالی پارٹی نے باہمی اتفاق کرلیا اور مسلم لیگ کے ساتھ مذاکرات شروع کردیئے۔ لیکن بات چیت میں ایسی شرائط پیش کی گئیں جو مسلم لیگ کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ مسلم لیگ سے کہا گیا کہ وہ سکھوں کی ایک الگ ریاست کے قیام کے لیے اکالی پارٹی سے علیحدہ سمجھوتہ کرے تاکہ پاکستان قائم ہونے کی صورت میں سکھوں کو بھی ایک علیحدہ ریاست مل جائے۔ جیسا کہ توقع تھی یہ مذاکرات ناکام ہوئے جس کے بعد کانگریس اور اکالی پارٹی نے یونینسٹ پارٹی کے ساتھ مل کر ایک مخلوط حکومت قائم کرلی جس کے وزیراعظم ملک خضر حیات خان ٹوانہ تھے مسلم لیگ کو اس کا بے حد رنج تھا کیونکہ اکثریتی پارٹی ہونے کی حیثیت سے وہ حکومت سازی اپنا حق سمجھتی تھی چنانچہ بعدازاں مسلم لیگ نے اپنی ساری توانائی خضر حکومت کے خاتمے پر صرف کردی۔ مسلم لیگ نے مسلم نیشنل گارڈز کے نام پر ایک تنظیم قائم کی جس میں سابق فوجی اور نوجوان شامل تھے اور جنہیں فوجی تربیت دی گئی تھی۔ اس تنظیم نے اب خضر حکومت کے خاتمے کو اپنا پہلا اور آخری مقصد قرار دے دیا تھا۔ پنجاب حکومت نے نیشنل گارڈز اور خاکسار تحریک پر بعض پابندیاں عائد کردیں کیونکہ خفیہ پولیس کی رپورٹوں میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ دونوں حکومت کے ساتھ تصادم کی تیاری کر رہی ہیں۔ ان رپورٹوں کے مطابق ان تنظیموں کی بیشتر شاخیں بیلچے، خنجر اور تلواریں خرید رہی ہیں اور یونیفارم تیار کر رہی ہیں۔ اس قسم کی سرگرمیاں بلوچستان' سندھ اور صوبہ سرحد میں بھی شروع کررکھی ہیں۔ پنجاب لیگ نے تمام مسلمانوں کو نیشنل گارڈز میں شمولیت کی دعوت دے دی۔ اس دوران آل انڈیا مسلم لیگ نے جو کیبنٹ مشن پلان کے تحت جواہر لال نہرو کی قیادت میں مرکزی مخلوط حکومت میں شمولیت منظور کرچکی تھی اب اس منصوبے سے الگ ہوگئی اور 16 اگست 1946ء کو راست اقدام کا دن منانے کا اعلان کردیا جس کا مقصد پاکستان کے حصول کے لیے دباؤ بڑھانا تھا۔ صوبے کی مسلم لیگ کے ایک اہم رہنما راجہ غضنفر علی نے اس موقع کی مناسبت سے ایک بیان میں کہا کہ راست اقدام کا دن

مسلمانوں کے لیے جہاد کی حیثیت رکھتا ہے اگرچہ مسلمان دلی طور پر چاہتے ہیں کہ مختلف پارٹیوں کے درمیان مصالحت ہو جائے اور معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جائیں۔ بدقسمتی سے یہ دن غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف راست اقدام کی بجائے کانگریس اور ہندوؤں کے خلاف ثابت ہوا۔ سرکاری رپورٹوں میں بتایا جاتا ہے کہ اس دن کے منانے کے سلسلے میں مسلم لیگ کئی نقطہ نظر رکھتی تھی اور ان میں سے کئی حلقے اس روز عدم تشدد پرمبنی احتجاج تک محدود رہنا چاہتے تھے۔ سی پی برار اور بنگال کے مندوبین یہ سوچ رکھتے تھے لیکن پنجاب کی قیادت ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بے رحمانہ خانہ جنگی کی سوچ کی حامل تھی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ جناح پنجاب کی سوچ کے آگے جھک گئے۔ 16 اگست سے پہلے پہلے مسلمانوں اور غیر مسلم رہنماؤں نے ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلا' شعلہ بیان تقریریں کیں اور انتہائی غیر ذمہ دارانہ طرزعمل کا مظاہرہ کیا۔ اس کے نتیجے میں سیاسی فضا نفرت میں تبدیل ہو گئی اور خانہ جنگی کی سی صورت نظر آنے لگی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلم لیگ کی تیاریوں کا جواب دینے کے لیے انتہا پسند ہندو تنظیموں راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ اور مہا سبھا نے بھی ہندو مذہب کے نام پر لوگوں کے جذبات سے کھیلا اور گرو دکھشنا کے نام پر مسلمانوں کے خلاف چندہ اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ سیوک سنگھ نے نوجوانوں کی فوجی تربیت کے لیے ملک بھر میں مراکز قائم کر دیے۔ سنگھ کی توجہ کا مرکز بھی پنجاب ہی تھا جہاں اس نے ہزاروں نوجوانوں کی ایک فوج تیار کر رکھی تھی۔ دونوں طرف سے تصادم کے لیے تیاریوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب سیوک سنگھ کے گرو گولواکر نے ستمبر 1946ء میں پنجاب کا دورہ کیا تو 25000 رضا کاروں نے مختلف مقامات پر انہیں سلامی دی۔ اس دورے کے دوران اس نے تقریباً دو لاکھ کا چندہ اکٹھا کیا اور ہندوؤں سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں پر آخری ضرب لگانے کے لیے تیار رہیں۔ اس دوران جب حکومت نے سیوک سنگھ کی سرگرمیوں پر پابندی لگائی اور اس کے 58 رضا کاروں کو گرفتار کر لیا تو اس نے ہندوؤں کو ہدایت کی کہ وہ مندروں میں جمع ہو کر مستقبل کی لڑائی کی تیاری کیا کریں۔

ان دنوں فرقہ وارانہ کشیدگی پورے ہندوستان میں عروج پر تھی لیکن پنجاب میں کچھ زیادہ ہی اس کے زیر اثر تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں کے لیے یہ صوبہ بہت زیادہ اہم تھا۔ سکھ وزارتی مشن کے منصوبے پر بہت پیچ و تاب کھاتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس منصوبے میں پاکستان کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا جس کے وہ پرزور مخالف تھے وہ یہ کہتے تھے کہ اگر انگریز پاکستان کا مطالبہ مان سکتے ہیں تو سکھوں کے لیے الگ مملکت کے لیے بھی یہی اصول اپنایا جائے۔ سکھ لیگ نے کہا پنجاب میں وہ سب سے بڑی اقلیت ہیں اور ایک آزاد مملکت ہی ان کے مفادات کا تحفظ کر سکتی ہے۔ اس نے سکھوں سے کہا

کہ وہ ایک طویل سیاسی جدوجہد کے لیے تیار رہیں کیونکہ پاکستان کے قیام کی صورت میں وہ ایک مسلم ریاست میں دوسرے درجے کے شہری بن کرنہیں رہ سکتے۔ لیکن کانگریس نے بعد ازاں سکھوں کو منصوبہ قبول کرنے پر رضامند کرلیا اور اس کے بدلے میں اس نے سکھوں کو ان کے سیاسی اور اقتصادی مفادات کے تحفظ کا یقین دلایا۔ یہ یقین دہانی پنڈت نہرو نے کلکتہ میں ایک پریس کانفرنس میں کرائی۔ اس کے فوراً بعد پنجاب میں سیاسی کشیدگی بڑھ گئی۔ احتجاجی مظاہروں کا سلسلہ تیزی کے ساتھ شروع ہو گیا اور بلوے ہونے لگے اور جب 24 جنوری کو مسلم لیگ کے نیشنل گارڈز اور راشٹریہ سیوک سنگھ پر پابندی لگائی گئی تو حالات مزید خراب ہو گئے اور خضر حکومت کے لیے امن قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔ مسلم لیگ خاص طور پر یکدم بے حد متحرک ہو گئی تھی حکومت اس قدر دباؤ میں آئی کہ اسے 28 جنوری کو ان دونوں تنظیموں پر پابندی اٹھانا پڑی۔ مسلم لیگ نے نیشنل گارڈز پر پابندی اٹھنے کے اقدام کو اپنی سیاسی فتح پر تعبیر کیا اور مخلوط حکومت پر دباؤ اور بڑھا دیا اس کی ایک مہم کا نشانہ خصوصی طور پر یونینسٹ رہنما تھے۔ 20 فروری کو جب حکومت نے اقتدار ہندوستانی رہنماؤں کے حوالے کرنے کا اشارہ دیا تو مسلم لیگ نے اپنا دباؤ مزید بڑھا دیا کیونکہ ان کے خیال میں اب انہیں پاکستان کی منزل حاصل ہوتے نظر آ رہی تھی۔

اس کشیدہ صورتحال میں خضر حکومت کے اپنے ہی مسلمان ارکان کے ساتھ بھی تعلقات خراب ہو گئے کیونکہ مسلمان رہنما خضر حیات کو مسلم لیگ اور پاکستان کے خلاف کارروائیوں کا ملزم ٹھہرا رہے تھے۔ یہ دباؤ اس حد تک بڑھ گیا کہ حکومت کی ناکامی واضح طور پر نظر آنے لگی تو خضر حیات نے 23 مارچ کو استعفیٰ دے دیا اس کے ساتھ ہی مسلم لیگ نے حکومت سازی شروع کر دی اور ہندوؤں اور سکھوں نے ان کو ناکام بنانے کے لیے مظاہرے شروع کر دیے۔ جلد ہی مسلمان اور دوسرے فرقوں کے مابین تصادم کی صورت پیدا ہو گئی چونکہ مسلم لیگ کو دوسری طرف سے پارلیمانی مدد نہیں مل سکی اس لیے اس کی حکومت سازی کی کوششیں ناکام ہو گئیں اور گورنر نے سیاسی معاملات اپنے حالات میں لے لیے۔ پنجاب میں گورنر راج نافذ کرایا گیا۔ مسلمانوں نے گورنر راج کے خلاف بھی مہم زور وشور سے جاری رکھی اور جواب میں دوسرے فرقوں نے بھی اپنی سرگرمیاں کم نہیں کیں۔ چنانچہ حالات روز بروز خراب ہونے گئے۔

مسلم لیگ نے اگست 1946ء میں راست اقدام کی جو اپیل کی تھی اس کے نتیجے میں بنگال میں بہت خون خرابہ ہوا انہی ناخوشگوار واقعات کی بازگشت اب بھی سنائی دے رہی تھی چنانچہ اس کشیدہ صورت حال نے کلکتہ اور نواکھلی کو آگ اور خون میں نہلا دیا اس کا ردعمل بہار اور پھر پنجاب میں بھی ہوا۔ مارچ 1947ء تک پورے صوبے میں فسادات شروع ہو گئے اور لاہور' امرتسر' ملتان' جہلم اور راولپنڈی

خاص طور پر ہندو مسلم تصادم کی لپیٹ میں آ گئے۔ آتش زنی' لوٹ مار اور قتل و غارت ان فسادات کی خصوصیات تھیں صورتحال اس قدر خراب ہو گئی کہ رہائشی علاقوں کی قلعہ بندی کر لی گئی اور یوں شہروں کی حد تک آبادی فرقوں کی بنیاد پر تقسیم ہو گئی ان حالات میں کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پنجاب دونوں عظیم جنگوں کے دوران مثالی فرقہ وارانہ خیر سگالی کا مرکز رہا ہو گا اس وقت جب مسلم لیگ کی سیاسی سودا بازی بڑھ رہی تھی اور اس نے صوبے پر تقریباً قابو پا لیا تھا غیر ملکی حکمرانوں کی پالیسیوں نے بھی ان کی حیثیت کو مستحکم کرنے میں مدد دی۔ حکومت کے مختلف اقدامات نے صوبے کو تقریباً خانہ جنگی کے منہ میں دھکیل دیا تھا۔ کئی کانگریسی رہنماؤں نے خوف کے عالم میں ملک کی تقسیم تسلیم کرنے کے اشارے دینا شروع کر دیے کیونکہ انہیں وزارتی مشن کے منصوبے کے تحت ملک کو متحد رکھنا اب بے حد مشکل نظر آ رہا تھا اگرچہ مہاتما گاندھی' مولانا عبدالکلام آزاد اور خان عبدالغفار خان اب بھی پر امید نظر آتے تھے اور حتی الامکان ہندوستان کو تقسیم سے بچانا چاہتے تھے۔

اس دوران نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے صورتحال کو معمول پر لانے کے لیے سیاسی جماعتوں سے مذاکرات شروع کر دیے۔ بات چیت کے بعد وائسرائے نے جس "پلان" کا خاکہ پیش کیا وہ ملک کو آگ اور خون کی ہولی سے بچانے کے لیے سیاسی جماعتوں نے عموماً آخری حل کے طور پر قبول کر لیا۔ کپور سنگھ نے 6 ستمبر 1966ء کو لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وزارتی مشن چناب اور گھگھر کے درمیانی علاقہ پر مشتمل ایک سکھ مملکت کا تصور پیش کرنا چاہتا تھا جسے سکھوں نے قبول نہیں کیا۔ اسی طرح محمد علی جناح نے برطانوی رہنماؤں کے ساتھ مشورے کے بعد تجویز پیش کی کہ ریاست پٹیالہ کو خود مختاری دے کر اسے سکھوں کی ایک آزاد مملکت میں ضم کر دیا جائے جو پانی پت سے دریائے راوی کے درمیانی علاقہ پر مشتمل ہو لیکن ماسٹر تارا سنگھ نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ اسی دوران لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خان سے کہا کہ ہندوستان کے رہنما اس قدر مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ پاکستان کا قیام اور پنجاب' بنگال اور آسام کی تقسیم کے لیے رضامند ہو جائیں گے۔ لیاقت علی خان نے ماؤنٹ بیٹن کی اس رائے سے اتفاق کیا۔ جب سکھوں نے ماؤنٹ بیٹن سے بات کی تو انہوں نے پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں کہا وہ ایسا مطالبہ پیش نہ کریں کیونکہ اس طرح سکھ قوم تقسیم ہو جائے گی اور وہ اپنے چند بہترین علاقوں سے محروم ہو جائیں گے۔ اس کے جواب میں ماؤنٹ بیٹن نے سکھوں کو ایک تجویز دی کہ سکھوں کے لیے بہتر ہو گا اگر وہ پنجاب اسمبلی میں نشستوں کی تقسیم اس بنیاد پر قبول کر لیں کہ انہیں اور ہندوؤں کو تیس تیس فیصد اور مسلمانوں کو 40 فیصد حصہ مل جائے لیکن یہ تجویز سکھوں کے علاوہ مسلمانوں اور ہندوؤں

نے بھی تسلیم نہیں کی۔ سکھ ایک الگ مملکت کے مطالبے پر اڑے رہے۔

اس بحرانی کیفیت میں جب تمام سیاسی قوتیں جواز اور دلیل کی بجائے جذبات میں بہی جا رہی تھیں حکومت کو ایسی اطلاعات ملیں کہ سکھ لڑنے مرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے نابھہ کے مہاراجہ سے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے ان اطلاعات کی تصدیق کی۔ چند روز بعد حالات واضح ہو گئے تو یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ مسلمان پاکستان حاصل کرنے کے لیے اس قدر بیتاب ہیں کہ انہیں اس کے لیے پنجاب کی تقسیم بھی گوارا ہو گی اس کے ساتھ ساتھ یہ اطلاعات بھی مل گئیں کہ سکھ مسلمانوں کے خلاف آخری جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ کیونکہ انہیں کسی صورت مسلمانوں کی حاکمیت گوارا نہ تھی۔ اگر سکھوں اور مسلمانوں میں وسیع پیمانے پر تصادم ہو جاتا تو حالات کس قدر دگرگوں ہو جاتے اس کا برطانوی حکومت اور سیاسی پارٹیوں دونوں کو اچھی طرح اندازا تھا۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے پنجاب کے عوام کے جذبات کی نمائندگی کرتے ہوئے 8 مارچ 1947ء کو اس کا حل یوں پیش کیا۔ "ان المناک واقعات سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ تشدد اور سخت گیری سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا اس تنازعہ کا حل ایسا ہونا چاہیے کہ فریقین کو کم از کم نقصان ہو...... اس لیے اب ضروری ہو گیا ہے کہ پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ مسلم اکثریت والے علاقوں کو غیر مسلم پنجاب سے الگ کر دیا جائے" پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے مطالبے نے محمد علی جناح کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ انہوں نے کہا "یہ مطالبہ ایک سازش کے مترادف ہے جس کے پس منظر میں سیاسی دباؤ اور تلخی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو ایک کٹا پھٹا اور کرم خوردہ پاکستان ملے گا" جناح نے اس "سازش" کو ناکام بنانے کے لیے پاکستان کے اندر سکھوں کو ایک خود مختار صوبہ دینے کی پیش کش کی۔ اکالی رہنما ماسٹر تارا سنگھ نے 15 اپریل کو اس پیش کش پر جناح سے بات چیت کرنے پر رضامندی ظاہر کی اور کہا کہ پنجاب کی تقسیم ان مذاکرات کی بنیاد ہو گی ادھر یہ اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ انگریز چاہتے تھے کہ سکھ پاکستان میں شامل ہو جائیں لیکن ہندوستان کے مخالفوں کی یہ مذموم سرگرمیاں مزید آگے نہ بڑھ سکیں کیونکہ سکھ ایسے ملک میں رہنے پر تیار نہ تھے جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں۔ چنانچہ غیر مسلموں کی کوششوں کے نتیجے میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن برطانوی حکومت کی خواہش کے برعکس مسلم اکثریت والے صوبوں کی تقسیم پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے 3 جون کو ہندوستان کی آزادی کا اعلان کیا تو ساتھ ہی پاکستان کا مطالبہ بھی تسلیم کر لیا۔ ساتھ ہی انہوں نے کہا یہ صوبے اس صورت میں تقسیم ہوں گے اگر ان کی قانون ساز اسمبلیاں کثرت رائے سے اس کے حق میں فیصلہ کریں گی۔ 3 جون کا یہ مشہور منصوبہ تمام فریقین، کانگریس، مسلم لیگ اور

اکالی پارٹی نے تسلیم کرلیا۔ منصوبے کے تحت پنجاب اسمبلی کے دو حصوں یعنی مغربی اور مشرقی پنجاب کے ارکان کے الگ الگ اجلاس ہوئے مشرقی پنجاب کے ارکان نے 22 کے مقابلے میں 50 ووٹوں کی اکثریت سے تقسیم کے حق میں فیصلہ دیا جبکہ مغربی پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کی اکثریت کا سوال ہے یہ بہت معمولی تھی اور یہی وجہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی نے خود کو مسلم لیگ کی سیاست سے الگ رکھا۔ ویسے بھی مغربی اضلاع میں مسلمانوں کی اکثریت 60 سے 80 فیصد تھی جبکہ مرکزی علاقوں میں غیر مسلم اکثریت میں تھے اور یہ علاقہ سیاسی اقتصادی اور تعلیمی اعتبار سے صوبے کے سب سے ترقی یافتہ اضلاع پر مشتمل تھا غدر پارٹی' کیرتی کسان' خلافت اور سول نافرمانی کی تحریکوں میں پنجاب نے جو گراں قدر کردار ادا کیا وہ اکثر و بیشتر مرکزی اضلاع کی بنیاد پر تھا۔ سیاسی بیداری میں آگے ہونے کی وجہ سے صوبے کے انہی علاقوں کے عوام کو حکومت کے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا۔ 1947ء میں کانگریس کے صدر جے بی کرپلانی نے وہ وجوہات بیان کیں جن کے باعث ان کی جماعت کو پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا انہوں نے کہا" ...... بات یہ نہیں تھی کہ ہمیں جلتے ہوئے گھروں سے یتیموں اور بیواؤں کے کراہنے اور سسکیوں کی آوازیں دل چیرتے ہوئے محسوس ہوئی تھیں ...... مسئلہ یہ تھا کہ اگر ہم مزید خاموش رہتے اور حالات کو جوں کا توں چھوڑ دیتے تو وہ دن دور نہیں تھے جب ہمارا شمار آدم خوروں اور وحشیوں سے ہونے لگتا۔" کانگریس تقسیم کے مخالف تھی لیکن حالات نے اسے تقسیم کی کڑوی گولی نگلنے پر مجبور کردیا۔ گاندھی جی بھی جو کل تک تقسیم کے تصور تک کے مخالف تھے اور ان مطالبات کو "ایک عظیم گناہ" سمجھتے تھے حالات سے مجبور ہو گئے۔ یوں کانگریس نے جواز اور دانشمندی کے تقاضوں کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی بجائے ملک کو فرقہ واریت اور انتہا پسندی کا شکار ہونے سے بچالیا آج بھی سوال وہی ہے کہ آیا تقسیم کا فیصلہ غلط تھا کہ نہیں لیکن اس کا جواب ایک یہ ہے کہ فرقہ واریت کا زہر ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ اب اسے ایک بڑے جراحی نشتر کی ضرورت تھی ایسا نشتر جس سے جان جانے کے بجائے جسم کا ایک حصہ کاٹ کر پھینکا جاسکے۔ اس طرح ہندوستان کی زندگی بچ گئی اور یہی آج بھی مسئلہ کا بہتر حل نظر آتا ہے۔

پنجاب کی تقسیم سے اگر کسی کا نقصان ہوا تو وہ سکھ تھے جن کا وجود دولخت ہو گیا سکھوں کے اس مسئلہ کا ادراک خود سکھوں کو بھی نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ پنجاب اور بنگال کی آبادی کو خواہ ہندو ہوں یا سکھ یا مسلمان اس کی بھاری قیمت چکانی پڑی اور اس کی زیادہ تر ذمہ داری کانگریس پر عائد ہوتی ہے۔ اگرچہ مسلمان درمیانہ طبقہ جسے اقتدار کی ہوس تھی اور انگریز جو سازش اور شرارت کا سرچشمہ تھے بھی اس سے مبرا

نہیں۔ انیسویں صدی کے وسط سے جب پنجاب سے سکھوں کا اقتدار رخصت ہوا اور جب انگریز نے اس صوبے کو سرکاری عملداری میں لیا تھا سکھ قوم کو اتنا بڑا نقصان نہیں اٹھانا پڑا تھا اور وہ بھی اس وقت جب نصف صدی پر محیط سیاسی جدوجہد کے بعد بیداری کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور صوبہ اقتصادی اور سماجی ترقی کی طرف گامزن تھا کہ یکدم فرقہ واریت کا عفریت اسے نگل گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ تقسیم کے بعد بھی فرقہ وارانہ مسئلہ حل نہ ہوسکا اس کی وجہ شائد یہ تھی پرانی دشمنیوں کو کلیتاً ختم نہیں کیا جاسکا اور قطعی مفاہمت کا عمل ابھی تک مکمل نہیں ہوسکا تھا۔ ان حالات میں معجزوں کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ایک کے بعد ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوتا چلا گیا۔ اس کے باوجود پنجاب کے عوام نے ہر طرح کے مسائل اور مصائب کے باوجود سیاسی ترقی کا سفر تیزی سے طے کیا اور صرف دس برس کے اندر اپنی اہلیت کا لوہا ملک بھر میں منوالیا۔

اگر تقسیم کی وجوہات کا جائزہ لیا جائے تو بے شمار دوسرے عناصر کے ساتھ یہ بات بھی واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہندوستان خصوصاً پنجاب میں قومی قوتیں اور فرقہ وارانہ طاقتیں ساتھ ساتھ پروان چڑھیں اگر پنجاب میں ایسے لوگ تھے جنہوں نے وطن کی آزادی کی خاطر قیدوبند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ذلت سہی اور پھانسی پر جھول گئے تو دوسری جانب وہ عناصر بھی نظر آئیں گے۔ جنہوں نے مذہب کی آڑ میں گھناؤنے جرائم کا ارتکاب کیا۔ خصوصاً تقسیم کے موقع پر ان کے سیاہ کارنامے واضح ہو کر منظر عام پر آئے۔ قتل و غارت' لوٹ مار' آتش زنی' عورتوں کا اغوا اور ان کی عصمت دری اور دوسرے فرقوں کے لوگوں کو جبراً اپنے مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرنا وغیرہ وہ عمل تھے جن سے انسانیت کانپ اٹھتی ہے حالات اس قدر دگرگوں ہو گئے تھے کہ کانگریس بھی اس شک میں مبتلا ہو گئی کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی شائد ممکن ہی نہیں۔ کانگریس کی قیادت کی مایوسی واقعی انتہا کو پہنچ گئی تھی کہ اس نے پکار کر کہا کہ وہ مختلف فرقوں کے مابین تنازعہ لاینحل حد تک بگڑ چکا ہے۔ گاندھی جی عمر بھر انگریز کی ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' پالیسی کے کٹر ناقد رہے اور وہ ہمیشہ الزام لگاتے کہ قومی قیادت کی سوچ میں فاصلہ انگریز کی سازش کی بنا پر پھل پھول رہا ہے لیکن فرقہ واریت کا زہر اس حد تک قومی زندگی میں سرایت کر چکا تھا کہ ایک موقع پر وہ کہہ اٹھے ''برطانوی حکومت تقسیم کی ذمہ دار نہیں۔ وائسرائے کا بھی اس میں کوئی ہاتھ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ (وائسرائے) ملک کی تقسیم نہیں کرنا چاہتے اور کانگریس ہی کی طرح وہ بھی ملک کے ٹکڑے کرنے کے مخالف ہیں لیکن اگر ہم دونوں یعنی ہندو اور مسلمان کسی اور حل پر رضامند ہی نہیں ہوتے تو اس میں وائسرائے کا کیا قصور اور پھر ان کے پاس اور کیا چارہ رہ جاتا ہے۔'' گاندھی جی کی اس رائے نے جو

1946ء کے اوائل میں سامنے آئی ایک بار پھر حکومت برطانیہ کو "آخری کوشش" پر مجبور کر دیا شملہ میں وائسرائے لارڈ ویول اور گورنر پنجاب ایونز جینکنز نے بھی تقسیم ہند کی مخالفت کی۔ سر ایونز نے کہا "محض آبادی کی تقسیم کو واحد کوئی نہیں مانا جاسکتا کیونکہ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ شہری علاقوں میں مختلف فرقوں کی آبادی کا تناسب ملحقہ دیہات سے قطعی مختلف ہوتا ہے اس لیے صرف آبادی کو...... بنیاد تسلیم کرنا بنیادی غلطی ہوگی۔"

لیکن اکا دکا انگریز افسروں کی اس قسم کی توضیحات کو پوری حکومت کا نظریہ سمجھنا بھی بنیادی غلطی ہوسکتا ہے کیونکہ حکومت نے ایک خاص حکمتِ عملی کے تحت گمراہ کن شوشے چھوڑے تا کہ قومی قیادت کو بدنام ہو اور ملک اور بنگال اور پنجاب کی تقسیم کی ذمہ داری سیاسی تنظیموں پر عائد کی جاسکے۔ جب انگریز ملک کی قسمت کا فیصلہ کر رہے تھے تو پنجاب سب سے زیادہ تر متاثر ہوا و لخت ہو جانے کے باوجود بھی اس کے نقصان کا ازالہ نہیں ہوا اور بعد کے واقعات میں بھی پنجاب کو بدترین تشدد کا نشانہ بننا پڑا آیا یا اس لیے ہوا کہ پنجاب قومی زندگی میں ہمیشہ سے اہم رہا ہے اور اہم رہے گا۔ اس کی مثال اہل پنجاب نے تقسیم کے بعد دنیا کی سب سے بڑی ہجرت کے موقع پر پیش کی آگ اور خون کے دریا کو انہوں نے بلاامتیاز مذہب جس بہادری سے عبور کیا اور ذلت اور رسوائی کے داغ کو انہوں نے جس اولوالعزمی سے دھویا وہ صرف ایک بہادر قوم ہی کا شیوہ ہے۔

✣

باب:9

اختتامیہ

اہل پنجاب نے 1900ء اور 1947ء کے درمیانی عرصے میں آزادی کی جدوجہد میں جس جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کیا اور جو قربانیاں پیش کیں وہ کسی اور صوبے کے مقابلے میں کم نہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوں گی اس صوبے کی عوام انقلابی سوچ رکھتے تھے اور ان کا رجحان تشدد کی طرف تھا لیکن یہ بات ان کی مخالفت میں نہیں جاتی کیونکہ بہر حال یہ بات واضح ہے کہ پنجاب کی عوام نے مادر وطن کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے میں بھی پس وپیش نہیں کیا۔ اس دور کو سرکاری دستاویزات کے مطالعے سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ پنجاب کے انقلابیوں نے اپنی سرگرمیوں کے باعث مرکزی حکومت اور پنجاب کی انتظامیہ کو بے چین کیے رکھا۔ اس امر میں بھی کوئی شک نہیں کہ آزادی کے لیے پنجاب کے عوام نے آگ اور خون کا دریا عبور کیا لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ فرقہ واریت کے زہر نے پنجاب اور بنگال کو سب سے زیادہ متاثر کیا فرقہ وارانہ فسادات بھی انہی صوبوں میں سب سے زیادہ ہوئے اور تقسیم کے موقعہ پر انہی دو صوبوں کے عوام کو دنیا کی سب سے بڑی نقل مکانی کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ انہوں نے آزادی کے لیے بہت بھاری قیمت چکائی کچھ مؤرخین تو یہ بھی کہتے ہیں کہ پنجاب اور بنگال کے انقلابیوں نے جرأت اور بہادری کی جو داستان رقم کی برطانوی حکومت نے انہیں سزا دینے کے لیے ان کے صوبوں کو دولخت کر دیا۔ رکن اسمبلی اور ماضی کے ایک انقلابی جے سی چٹرجی کہتے ہیں کہ ''سازشی ذہن کے مالک برطانوی حکمرانوں نے ملک چھوڑ تو دیا لیکن جاتے جاتے ہندوستان میں فرقہ وارانہ نفرت کا بیج بو دیا اور پنجاب اور بنگال کی تقسیم کر کے انقلابیوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہاں یہ بات

بھی قابل ذکر ہے کہ آخرکار عدم تشدد کی مہم نے آزادی کی جنگ میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پرامن سیاسی جدوجہد پنجاب اور بنگال جیسے صوبوں کے مزاج کے منافی تھی۔ کانگریس خصوصاً گاندھی جی اور بال گنگا دھر تلک نے عدم تعاون اور عدم تشدد جیسا موثر سیاسی ہتھیار اپنا کر آزادی کی منزل کو قریب تر کر دیا کیونکہ اس طرح پنجاب کے عوام سیاسی تحریک کے اس بڑے دھارے سے منسلک ہو گئے جو پورے ہندوستان میں جاری و ساری تھا۔ اس کے مقابلے میں زیادہ انقلابی تحریکیں مقامی نوعیت کی تھیں اور وہ مجموعی طور پر سیاسی تاثر نہ چھوڑ سکیں یعنی ایک خلاء سا تھا جسے عدم تعاون اور سول نافرمانی جیسی وسیع تر تحریکوں نے پر کیا اور جس کے نتیجے میں ہزاروں لوگ جیل گئے اور حکومت کی سختیاں برداشت کیں ان کا مقصد صرف یہی تھا کہ وہ آزادی کے حق میں اور سامراجی حکومت کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کر سکیں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انقلابی تحریکوں کا تاثر محدود ہونے کے باوجود حکمران کے لیے زیادہ بے چینی کا سبب بنا۔ ان تحریکوں کے رہنما تاہم وہ قیادت فراہم نہ کر سکے جو ان کی تحریک کو کسی منطقی انجام تک پہنچا سکے چنانچہ کانگرس نے قیادت کے اس خلاء کو پورا کیا اور عدم تشدد کے ہتھیار سے اپنی تحریک کو آگے بڑھایا۔ یہ بات کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پرتشدد اور پرامن تحریک کو آگے بڑھایا۔ یہ بات کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ پرتشدد اور پرامن تحریکوں نے ایک دوسرے کی مدد کی حالانکہ ان دونوں نوعیت کی تحریکوں کے درمیان غداری کے مظاہرے بھی سامنے آئے۔ گاندھی جی کے زیر اثر مورخین نے انقلابیوں کے اس کردار کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ ناکام رہے ہیں کیونکہ پنجاب کے انقلابی کسی بھی طور مادر وطن کی آزادی کی جدوجہد میں پیچھے نہیں رہے تھے۔ حقیقت تو صرف یہی ہے کہ خواہ پرتشدد تحریکیں ہوں یا پرامن دونوں نے حصول آزادی کی جدوجہد میں ایک دوسرے کی مدد کی اہل پنجاب نے آزاد ہند فوج کی سرگرمیوں میں حصہ لے کر دنیا کے دوسرے غلام ممالک کو جدوجہد کی ایک نئی راہ دکھائی۔ اگرچہ غدر پارٹی کی مہم نے اکالی اور ببر اکالی جیسی پرتشدد تحریکوں کو جنم دیا لیکن اہل پنجاب نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ پرامن تحریکوں میں حصہ لینے کے اسی قدر اہل ہیں جس قدر انقلابی سرگرمیوں کو جاری و ساری رکھ سکتے ہیں۔ تقسیم کے دوران پنجاب کے عوام نے جن مصائب کا سامنا کیا وہ ان کے صبر و تحمل کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔ مہاجر کیمپوں میں قیام ہو یا قافلوں کی صورت میں سفر انہوں نے جرأت و صبر کا لازوال مظاہرہ کیا ہے بلکہ انہوں نے اپنے صوبے کی تقسیم کو ایک چیلنج سمجھتے ہوئے اس کی تعمیر نو عزم اور حوصلے سے کی۔ لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کو از سر نو آباد کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا اور اہل پنجاب نے اس کام کو انقلابی جذبے کے تحت انجام دیا۔ تقسیم کے باعث پنجاب کی انتظامی، اقتصادی اور سیاسی مشینری شل کر رہ گئی تھی اور صورت حال کسی بحران سے کم نہیں تھی۔ لیکن یہ اہل پنجاب کی ہمت اور صبر و تحمل ہی کے

باعث ہے کہ وہ نہ صرف اس صدمے سے بچ نکلے بلکہ شب و روز کی محنت سے اس دولخت صوبے کو بھی ہندوستان کا امیر ترین صوبہ بنادیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہبی تقسیم کے باعث پیدا ہونے والے فرقہ واریت کے مسئلے نے صورت حال بہت پیچیدہ کردی تھی لیکن پنجاب کے عوام نے آزادی کی جدوجہد میں شایان شان کردار ادا کیا۔ پنجاب وہ واحد صوبہ تھا جہاں دو نہیں بلکہ تین فرقے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ پنجابی عوام مزاجاً تندخو اور روحانی بے چینی کے حامل تھے لیکن انہوں نے ان امور کے باعث کمزوری نہیں دکھائی بلکہ ہمت اور مردانہ وار جرأت سے حالات کا مظاہرہ کیا۔ ان تحریکوں کے دوران بہت سے ایسے مرحلے آئے جہاں پنجاب کے عوام متزلزل ہوسکتے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ ایک بہادر قوم بن کر ابھرے اور غیر ملکی حکمرانی کے خاتمے کے لیے انہوں نے جو بھی کردار ادا کیا وہ تاریخی ہے۔

+

تتمہ

بھگت سنگھ اور بی کے دتا کے یہ بیان انگریزی روزنامہ پوائنیر میں 6 جون 1929ء کو شائع ہوا

درج ذیل بیان اسمبلی بم کیس میں دہلی کے سیشن جج مسٹر لیونارڈ مڈلٹن کی عدالت میں دونوں ملزموں کی جانب سے دائر کیا گیا۔

''ہم پر بہت سنگین نوعیت کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ:

1- آیا بم اسمبلی کے اندر پھینکے گئے تھے اور اگر ایسا ہوا تو کیوں؟

2- ہم پر ماتحت عدالت میں جو الزام لگایا گیا ہے آیا وہ صحیح ہے یا غلط؟

''جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے ہم اس کا جواب اثبات میں دیتے ہیں لیکن بعض نام نہاد عینی شاہدوں نے جس کذب بیانی کا مظاہرہ کیا ہے اسے عوام کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے۔ یہاں ہم یہ بیان کرتے چلیں کہ ہم الزام کو قبول کرتے ہیں اور حقیقت سے فرار نہیں چاہتے بلکہ ہم کہتے ہیں کہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ اس لیے ہمارے اس بیان کو اسی تناظر میں دیکھا جائے۔ مثال کے طور پر ہم سارجنٹ ٹیری کا بیان دہراتے ہیں اس نے کہا تھا کہ پستول ہم میں سے ایک کے پاس سے برآمد ہوا یہ بات غلط ہے۔ کیونکہ جب ہم نے خود کو قانون کے حوالے کیا تو ہم میں سے کسی کے پاس کوئی شے برآمد نہیں ہوئی۔ بعض دوسرے گواہوں نے یہ بھی کہا کہ انہوں نے ہمیں بم پھینکتے دیکھا تھا یہ بھی قطعی طور پر غلط

ہے عدالتوں کا انصاف کے حوالے سے اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے اور ان کی کچھ اخلاقیات ہوتی ہیں۔اس سلسلے میں ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ پبلک پروسیکیوٹر اور عدالتی رویے نے ہمارے ساتھ کوئی ناروا سلوک نہیں کیا۔ جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے ہم چاہتے ہیں کہ اپنا مقصد واضح طور پر اور کھلے دل سے بیان کریں کیونکہ اب یہ ایک تاریخی واقع بن چکا ہے۔ بعض پولیس افسروں نے جو ہمیں جیل میں ملنے آئے بتایا ہے کہ وائسرائے لارڈ اروِن نے دونوں ایوانوں نے ایک مشترکہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ بم پھینکنے سے ہمارا مقصد کسی کی ذات کو نشانہ بنانا نہیں تھا بلکہ سرکاری اداروں کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کرنا تھا ہم سمجھتے ہیں کہ لارڈ اروِن نے حقیقت بیانی کی ہے اور اس واقع کو اس کے صحیح پس منظر میں بیان کیا ہے ہم انسانیت سے پیار کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کی تقدیس کرتے ہیں اور ہم کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے نہ ہی ہم ظالم حکمرانوں کی طرح انسان پر تشدد پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ہی ملک کے وقار کا سودا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم تو نام نہاد سوشلسٹ دیوان چمن لال جیسے بھی نہیں کہ وہ ہمیں پاگل کہے جیسا کہ لاہور کے اخبار ٹریبون میں چھپا ہے۔ ہمیں پاگل کہہ کر دیوان چمن لال نے دراصل عظیم انسانی جذبوں کی توہین کی ہے۔ ہم منافقت سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ ہم تاریخ کے سنجیدہ طالب علم ہیں اور ہم اپنے وطن کی صورت حال اور عوام کی تمناؤں پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں لوگ کیا چاہتے ہیں۔ یقینا لوگ ہمیں پاگل نہیں سمجھتے بلکہ شاید وہ ہمیں بہادروں کی صف میں کھڑا دیکھ رہے ہیں۔"

"ہم نے اپنے احتجاج کا ایک عملی مظاہرہ کیا ہے جس کا مقصد اس حکومتی ادارے کو نشانہ بنانا ہے جس نے شروع ہی سے اپنی وسیع طاقت اور اختیارات کو شرارت شازش اور لوگوں کے مسائل میں اضافہ کرنے کے لیے ہی استعمال کیا ہے جوں جوں ہم حالات وواقعات کا جائزہ لیتے ہیں ہم صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچتے ہیں اور اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ ہم دنیا کو دکھا سکیں کہ ہندوستان کے لوگ کتنے مجبور ہیں اور انہیں ذلت ورسوائی کے کیسے گڑھوں میں پھینک دیا گیا ہے اور اس کی وجہ صرف ایک ہی ہے اور وہ اور کوئی نہیں بلکہ انتہائی غیر ذمہ دار اور آمرانہ حکمرانی کرنے والے حکام ہیں جو ہر قیمت پر ہمارے وطن پر اپنا تسلط جاری رکھنا چاہیے ہیں۔ کئی بار ایسے معاملات عوام کے نمائندوں کے سپرد بھی کیئے گئے اور انہیں کہا گیا کہ ان کے مداوا کے لیے کچھ تو کریں لیکن ہر بار یہ مطالبات ردی کی ٹوکری میں پھینک دیئے گئے۔ اسی تنظیموں نے بڑی سنجیدگی سے قرار دادیں پاس کیں اور انہیں نام نہاد منتخب ایوانوں تک پہنچایا بھی گیا لیکن ہر بار نام نہاد پارلیمنٹ نے انہیں اپنے پیروں تلے روند ڈالا اسی طرح ظالمانہ اور یکطرفہ اقدامات کے خلاف بھی قرار دادیں منظور ہوئیں لیکن ہر بار حکومت نے انہیں حقارت سے ٹھکرا دیا اور یہ کہا گیا کہ یہ قابل

قبول نہیں چنانچہ منتخب نمائندوں نے جو بھی مطالبات اور تجاویز حکومت کو ارسال کیں انہیں کسی طور پر بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا یہی وجہ ہے کہ اپنی تمام تر کوشش کے باوجود ہم ابھی تک نہیں سمجھ پائے کہ ایسے اداروں کو قائم رکھنے کا کیا جواز ہے۔ جو عوام کے ٹیکسوں سے قائم کیے گئے۔ عوام ہی کے وسائل کی بنا پر رعب و دبدبہ اور شان و شوکت بنائے ہوئے ہیں اور عوام ہی کے مطالبات پر غور نہیں کرتے۔ درحقیقت یہ ادارے غیر انسانی ہیں جو عوام کے لیے نہیں بلکہ حکمران طبقوں کے لیے کام کر رہے ہیں یہ سازشوں اور شرارتوں کا گڑھ ہیں انہیں جاری رکھنے کا کوئی جواز موجود نہیں۔"

"ہم یہ بات بھی ابھی تک نہیں سمجھ پائے کہ عوام کے رہنما کیا چاہتے ہیں کیا کر رہے ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہندوستان کے عوام کو انتہائی درجے کی بے چارگی اور ذلت میں مبتلا کر دیا گیا ہے یہ رہنما ملک و عوام کا مرض دور کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہم ان کی اس سنگدلانہ حرکتوں سے نالاں ہیں۔ ہم اسے یاد رکھتے ہیں ہمیں وہ وقت بھی یاد ہے جب اسمبلی میں صنعتی تنازعات کا بل پیش کیا گیا اور اس کی مخالفت میں مظاہرہ کرنے والے بے شمار صنعتی کارکنوں کو گرفتار کر لیا گیا ہم اسمبلی گئے تاکہ مشاہدہ کریں کہ عوام کے نمائندے اس قانون پر کیا کارروائی کرتے ہیں بحث کے دوران جو کچھ بھی ہمارے سامنے آیا اس نے ہمارے اس یقین کو مزید تقویت دی کہ ملک کے لاکھوں مزدوروں کے لیے اس ادارے کے پاس کچھ نہیں نہ مزدوروں کو اس سے کوئی توقع رکھنی چاہیے یہ ادارہ بہر طور پر استحصالی قوتوں کا ساتھی ہے اور مزدوروں کی غلامی کی زنجیر کو مضبوط سے مضبوط کرتا جا رہا ہے۔ یقیناً یہ مزدور کسی بھی طور غلاموں سے بہتر نہیں۔"

"اور آخر میں وہ وحشیانہ اور غیر انسانی اقدام جو ملک پر مسلط کر دیا گیا اور جس نے فاقہ زدہ اور جدوجہد کرنے والے لاکھوں کروڑوں لوگوں کو ان سے اس بنیادی حق سے محروم کر دیا جسے وہ اپنی معاشی حالت کو قدرے بہتر بنانے کے لیے استعمال کر سکتے تھے اور وہ لوگ جو ہماری طرح سوچتے ہیں وہ اس اقدام کی مذمت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ آیا حکومت کا یہ اقدام کسی بھی طور پر ان لوگوں کے حق میں ہو سکتا ہے جنھوں نے خاموشی سے محنت کی اور ایک مضبوط اقتصادی ڈھانچہ استوار کیا آیا انھوں نے اپنا خون پسینہ اس لیے بہایا تھا کہ استحصالی قوتیں ان کو اپنی عیاشیوں کے لیے استعمال کریں اور ویسے ان میں سے سب سے بڑی استحصالی قوت کونسی ہے یقیناً وہ سمندر پار سے آنے والے حکمران ہیں جنھوں نے اپنے حق کے لیے اٹھنے والی ہر آواز کو سختی سے دبایا اور ظلم و ستم کا بازار گرم کیے رکھا۔"

"اب ذرا اس خط کا بھی تذکرہ ہو جائے جو آنجہانی ایس آر داس نے جو گورنر جنرل کی

ایگزیکٹو کونسل میں وزیر قانون رہ چکے ہیں اپنے بیٹے کو لکھا اس خط میں وہ لکھتے ہیں کہ اسمبلی میں بم کا دھماکہ کی نوبت محض اس لیے آئی تا کہ ان لاکھوں بے زبان لوگوں کو زبان مل سکے جو صرف شکایت زبان پر نہیں لا سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایس آر داس نے صحیح معنوں میں ہمارے اقدام کی ترجمانی کی ہے ہم بھی چاہتے ہیں اور یہی کیا ہے۔ ہمارا واحد مقصد یہ ہے کہ ان حکمرانوں کو جو نہ سنتے ہیں اور نہ سوچتے ہیں جھنجوڑ کر سوال کریں کہ ان کے ظلم کی حد کیا ہے اور ہم نے جو کچھ کیا ہے اس کا مقصد ظالم حکمرانوں کو جھنجوڑنا ہی تھا اور ہمارے اس اقدام نے وہی ہلچل پیدا کی ہے جو ہونا چاہیے تھی۔ اب ہر ایک نے محسوس کیا ہے کہ ہندوستان کے عوام کے دلوں میں جو سمندر موجزن ہے وہ اگرچہ بظاہر پرسکون نظر آتا ہے اس کی تہہ میں کتنا بڑا طوفان چھپا بیٹھا ہے جو کناروں سے باہر نکلنے کو تیار ہے ہوسکتا ہے یہ طوفان حکمرانوں کو نظر نہ آتا ہو ہمارا مقصد یہ تھا کہ انہیں اس طوفان کی طلاطم خیز موجوں سے ہونے والے نقصان کے بارے میں خبر دار کریں لیکن ہم صرف حکمرانوں ہی کی توجہ مبذول نہیں کرانا چاہتے تھے بلکہ ان قوتوں کو بھی باور کرانا چاہتے تھے جو عدم تشدد میں نہ صرف یقین رکھتے ہیں بلکہ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اس طرح کے غیر اہم اور بے معنی اقدام سے آزادی کی منزل پا سکتے ہیں۔ ہم یہ بات بتاتے چلیں کہ موجودہ نسل کو پورا یقین ہے کہ اس نظریہ کو ماننے والے ایک خیالی دنیا میں رہتے ہیں اور یہ ماننے کو تیار نہیں کہ معروضی حقائق قطعی مختلف ہیں کم از کم ہمیں تو ایمان کی حد تک یقین ہے کہ عدم تشدد سیاسی نقصان کے علاوہ عوام کو کچھ نہیں دے سکتی اور ایسی مہموں کا حشر کیا ہوگا ہمیں اس میں کوئی شک نہیں۔"

"ہمیں چونکہ سب متعلقہ فریقوں کو خبر دار اور زمینی حقائق سے آگاہ کرنا تھا اس لیے ہم نے یہ قدم اٹھایا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس حوالے سے ہماری نیک نیتی اور خلوص پر کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے کہ ہم انسانوں اور انسانیت سے محبت کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے کروڑوں لوگوں کی کسمپرسی کی حالت سب پر آشکار ہو جائے۔ پچھلے پیراگراف میں ہم نے "موہوم عدم تشدد" کی اصطلاح استعمال کی ہے ہم چاہتے ہیں کہ اس کی وضاحت کرتے چلیں۔ جو قوت جارحیت سے استعمال کی جائے تشدد کا روپ دھار لیتی ہے عام حالات میں تو اس کا استعمال بلا جواز بلکہ مجرمانہ ہوگا لیکن جب اس کا استعمال جائز حقوق کے لیے ہو تو اس کا جواز پیدا ہو جاتا ہے اور اسے غیر اخلاقی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ سیاسی جدوجہد خواہ کسی بھی نوعیت کی ہو کسی نہ کسی مرحلے پر پُر تشدد ہو جاتی ہے اس لیے کسی بھی تحریک کو تشدد سے پاک نہیں رکھا جا سکتا اور ایسا سمجھنا خام خیالی ہوگا۔ ہم نے جو قدم اٹھایا ہے اور جسے ہم وارننگ کہتے ہیں۔ وہ محض حکمرانوں اور دوسرے متعلقہ لوگوں کو آنے والے طوفان سے آگاہ کرنا تھا اور اس کی تحریک ماضی کی تحریکوں سے ہوئی ایسی ہی تحریک گورو گوبند سنگھ، شیواجی، مصطفیٰ کمال پاشا، رضا شاہ، جارج واشنگٹن، جیری بالڈ اور لینن نے

شروع کی تھی۔ ان تحریکوں کے نتیجے میں جو انقلابی تبدیلی آئی تھی ہماری منزل بھی وہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ غیر ملکی حکمرانوں اور ہندوستانی قیادت نے حقائق سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں ہمیں تو یہ لوگ اندھے اور بہرے لگتے ہیں جو آنے والے طوفان کی تیزی کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور نہ ہی اس کی طلاطم خیز موجوں کا شور سن رہے ہیں۔"

"اب تک ہم نے اپنا مقصد بیان کیا ہے اب ہم بتانا چاہتے ہیں کہ ہمارے ارادے کس قدر پختہ ہیں اور یقین کس قدر مستحکم۔ یہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ ہمارا مقصد کسی کو ذاتی نقصان پہنچانا نہیں تھا اور نہ ہی ہم چاہتے تھے کہ اسمبلی کے اندر موجود کسی شخص کو معمولی سا زخم بھی آئے۔ اس کے برعکس ہم انسان اور انسانیت کی تقدیس میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہم اپنی محبت الفاظ میں بیان نہیں کر سکتے۔ ہمارا بس چلے تو انسانوں کی خدمت میں اپنی جان تک دے دیں۔ ہم سامراجی فوج کے کرایہ کے قاتلوں کی طرح نہیں جو پیسے کے لیے انسانی خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے ہم تو انسانوں کو معمولی تکلیف میں بھی نہیں دیکھ سکتے اس کے باوجود بھی ہم اعتراف کرتے ہیں کہ اسمبلی کے اندر بم ہم نے پھینکا تھا۔ ہمارے اس قدم کو نتائج کی روشنی میں جانچیں مفروضے قائم نہ کریں۔ اس بم سے اسمبلی کے اندر ایک بینچ کو نقصان پہنچا اور نصف درجن کے قریب لوگوں کو خراشیں آئیں یہ باتیں عدالت میں بیان نہیں کی گئیں سرکاری گواہوں نے رائی کا پہاڑ بنانے کی کوشش کی ہے اور محض مفروضے قائم کر کے ہمارے اس اقدام کے بارے میں ایسا پہاڑ بنانے کی کوشش کی ہے۔ جس کے لیے رائی بھی موجود نہ تھی۔ حکومت نے بم کے جس ماہر کو بھیجا اس نے اپنی رپورٹ میں یہ کہا کہ نقصان نہ ہونے کی معجزے سے کم نہیں۔ آیا یہ ایک حقیقی رپورٹ ہے جو سائنسی حقائق اور بنیاد پر مرتب کی گئی ہے۔ آیا سائنس کی روشنی میں معجزے ہو سکتے ہیں۔ اس میں تو صرف زمینی حقائق پیشِ نظر رکھے جاتے ہیں۔ اس ماہر نے حقیقت بیان کرنے کی بجائے جذباتی بات کی ہے لیکن ہم سائنس کی روشنی میں یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کا مقصد صرف اتنا ہی تھا جو حقیقت میں رونما ہوا اور اس کے لیے ہم ٹھوس دلیل بیان کرتے ہیں۔ اولاً یہ کہ دو بم لکڑی کی بنچوں کے درمیان خالی جگہ پر پھٹے اور دوئم یہ کہ اس سے دو فٹ کے فاصلے پر موجود لوگوں کو بھی نقصان نہیں پہنچا۔ مثال کے طور پر مسٹر پی آر راؤ، مسٹر شنکر راؤ اور سر جارج شسٹر جو بے حد قریب موجود تھے زخمی نہیں ہوئے۔ اس حکومتی ماہر نے بم کی ساخت اور طاقت کے بارے میں بھی جھوٹ بولا ہے اس بیان کو اگر درست مان لیا جائے تو یہ بم بہت تباہی مچاتے اور آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم اگر قتل و غارت گری چاہتے تو ہم بڑی آسانی کے ساتھ سر جان سائمن کو نشانہ بنا سکتے تھے جو اس وقت صدر کی گیلری میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن ہم پھر کہتے ہیں کہ ہمارا مقصد کسی کو قتل کرنا نہیں تھا ان بموں نے صرف اسی قدر نقصان

پہنچایا جتنا ان کی طاقت تھی اور جو ہمارا مقصد تھا۔"

"اس کے بعد ہم نے رضا کارانہ طور پر گرفتاری دے دی اور اسمبلی میں بم پھینکنے کا اعتراف کر لیا کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ استحصالی قوتیں یہ بات جان لیں کہ قوموں کو کسی بھی طرح ظلم وستم سے کچلا نہیں جاسکتا ہم ظالم حکمرانوں کو تاریخ کے بعض اہم واقعات بھی یاد دلانا چاہتے تھے ہم انہیں بتانا چاہتے تھے کہ پھانسیوں اور سائبیریا میں بارودی سرنگوں کے باوجود روس کے انقلاب کو ناکام نہیں کیا جاسکا۔ کیا سیفٹی بل یا اس طرح کے دوسرے آرڈیننسوں کے نفاذ سے ہندوستانیوں کے دلوں میں موجزن آزادی کے جذبے کو سرد کیا جاسکتا ہے۔ سازش کے مقدموں' قید وبند کی صعوبتوں اور ظلم وستم سے انقلاب کے قافلے کو نہیں روکا جاسکتا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بروقت خبردار کیے جانے پر جانی نقصان اور عوام کے مصائب کم کیے جاسکتے ہیں یہ تھے وہ حالات جن کے تحت ہم نے حکومت کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہم نے اپنا کردار ادا کر دیا ہے اور ہم اس پر مطمئن ہیں۔"

"ماتحت عدالت میں بھگت سنگھ سے سوال کیا گیا کہ انقلاب کیا ہے اور اس لفظ کا مطلب کیا ہے۔ بھگت کا جواب یہ تھا کہ انقلاب ذاتی نہیں بلکہ اجتماعی جدوجہد کا نام ہے یہ انفرادی طور پر لوگوں سے انتقام لینے کا نام نہیں نہ ہی یہ بموں اور پستول کے استعمال اور آتشیں اسلحہ سے دہشت پھیلانے کا نام ہے۔ انقلاب تو ناانصافی پر مبنی نظام اور معاشرہ میں بنیادی تبدیلی لانے کا نام ہے۔ ہمارے ملک میں مزدوروں کو جو پیداواری عمل کی بنیادی اکائی اور اقتصادی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں ہر طرح کی محرومیوں کا سامنا ہے ان کے حقوق سلب کیے جارہے ہیں اور انہیں ان کی محنت کا مناسب معاوضہ نہیں ملتا۔ ایک طرف تو وہ کسان جو سب کے لیے اناج پیدا کرتا ہے خاندان سمیت بھوکا رہتا ہے۔ جولاہا جو دنیا بھر کی منڈیوں میں اپنا کاتا ہوا سوت اور اپنے تیار کردہ کپڑا بھیجتا ہے اپنے اور اپنے بچوں کے بدن پر لباس سے محروم ہے۔ بڑھئی' معمار' لوہار اور سنگتراش جو خوبصورت محلات تعمیر کرتے ہیں جھونپڑیوں میں دم توڑ دیتے ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دار' ظالم اور ان کے گماشتے لاکھوں میں کھیلتے ہیں انہوں نے دنیا کی ہر شے اپنے لیے وقف کر رکھی ہے اور بہت بڑی اکثریت کو ان کے حقوق سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ محرومیاں اور غیر متوازن معاشرہ دنیا کو ایک خوفناک بحران کی طرف دھکیل رہا ہے لیکن یہ صورت حال زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ اب اس میں کوئی شک باقی نہیں رہا کہ یہ سب عیاشیاں ایک بہت بڑے آتش فشاں کے دہانے پر ہو رہی ہیں۔ دنیا یقیناً تباہی کے دہانے پر پہنچ چکی ہے۔

اس تہذیب کی بلند و بالا عمارت کو بچانا ہوگا ورنہ اسے زمین بوس ہونے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ ایک فوری اور بنیادی نوعیت کی تبدیلی اب لازم ہوگئی ہے اور ان لوگوں پر جو اس معاشرہ کو اشتراکی

بنیادوں پر استوار کرنا چاہتے ہیں زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ حالات سے باخبر ہیں اور ان کی نگاہ آنے والے طوفان کو دیکھ رہی ہے ان پر لازم ہے کہ وہ اس معاشرے کی تنظیم نو کریں تا کہ اس تہذیبی ورثے کو محفوظ کیا جاسکے جو پوری انسانیت اور اقوام عالم کا اثاثہ ہے جب تک انسان کے ہاتھوں انسان کا اور قوموں کے ہاتھوں قوموں کا استحصال جاری رہے گا۔ سامراجی عزائم نمو پاتے رہیں گے۔ اگر اس ظلم و زیادتی کو ختم نہ کیا گیا تو انسانیت کو درپیش خطرے کو ٹالا نہیں جاسکے گا۔ نہ ہی انسان کی محرومیوں کا ازالہ ہوگا۔ جو لوگ ان بنیادی مسائل کو حل کیے بغیر ایک پر امن دنیا کی بات کر رہے ہیں حد درجہ کے منافق ہیں۔ چنانچہ جب ہم انقلاب کی بات کرتے ہیں تو ہمارا مطلب اس معاشرے کا قیام ہے جو مختلف ناہمواریوں کی وجہ سے تباہ نہیں ہوگا۔ جس میں غریب اور عام آدمی کی حاکمیت تسلیم کی جائے گی پرولتاریہ اپنی پالیسیاں خود بنائے گا اور خود نافذ کرے گا۔ ایسے معاشرے کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا اور پھر اس کے بعد دنیا ایک ایسے آفاقی معاشرے میں ڈھل جائے گی کہ انسانی معاشروں کا ایک وفاق عمل میں آجائے گا۔ ایسا معاشرہ جو سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں اور سامراجی جنگوں کی تباہ کاریوں سے پاک ہوگا وجود میں آجائے گا۔

"یہی ہمارا نظریہ ہے یہی ہماری تمناؤں کا محور ہے اور اسی کو ہم انقلاب کہتے ہیں ہم نے بروقت سب کو خبردار کر دیا ہے اور ہماری آواز واضح اور بلند ہے۔ جو ہر کان تک پہنچنی چاہیے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے یہ آواز متعلقہ قوتوں تک نہیں پہنچتی اور حکمرانی کا موجودہ شیوہ جاری رہتا ہے تو بھی قدرتی طاقتوں کو روکا نہیں جاسکے گا۔ وہ طاقتیں پروان چڑھ رہی ہیں انہیں روکنے کی کوشش میں تصادم ہوگا جس کے نتیجے میں ہر سامراجی رکاوٹ خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا اور پھر پرولتاریہ کی مکمل حاکمیت کا سورج طلوع ہوگا۔ یہ انقلاب ہوگا جو بنی نوع انسان کا بنیادی حق ہے۔ آزادی بھی ایک پیدائشی حق ہے جو ختم نہیں کیا جاسکتا۔ ہر مزدور ہر کسان کو حق ہے کہ معاشرے پر حاکم مقرر ہو ان کی حاکمیت آخری منزل ہے یہ وہ مقدس فریضہ ہے جس کو انجام دینے کے لیے ہم ہر طرح کی قربانی اور ہر طرح کی مصیبتیں جھیلنے کو تیار ہیں موت بھی اٹل حقیقت ہے اور ہم اس کے لیے بھی تیار ہیں اس منزل کے لیے ہم نے نوجوانوں کو ہر طرح کی آزمائش میں پڑنے کے لیے تیار کیا ہے کیونکہ کوئی بھی قربانی کسی بھی نیک مقصد سے بڑی نہیں ہوتی۔ ہم مطمئن ہیں کہ ہم نے اپنا فرض پورا کیا ہے ہم انقلاب کی چاپ سن رہے ہیں۔ انقلاب زندہ باد۔"

+ + +